پروین شاکر: شخصیت اور شاعری

تحقیقی مقالہ برائے پی۔ایچ۔ڈی (اُردو)

نگراں
ڈاکٹر قائد علی خان
پروفیسر گورنمنٹ کالج اجمیر

مقالہ نگار
محمود حسین لون
بھگونت یونیورسٹی اجمیر راجستھان

بھگونت یونیورسٹی اجمیر راجستھان

حرف آغاز

خوبصورتی چاہے کسی بھی شکل وصورت رنگ وآہنگ میں ہو باعث کشش ہے۔خوبصورتی دل کو خوشگوار کیفیت کے احساس سے بھر دیتی ہے۔رومانس اور خوبصورتی کا شاعر کیٹس اپنی نظم ode to the gracian Urn میں ذکر کرتا ہے کہ ایک پھول دان پر بنائی گئی تصویر نے اُسے حیران کر دیا۔مٹی کے ایک یونانی طرز کے پھول دان پر مصور نے رنگوں اور برش سے ایسی تصویر بنائی تھی کہ جس نے شاعر کی حس جمالیات کو بے حد متاثر کیا اور بے اختیار کہہ آٹھا:

"A thing of beauty is a joy for ever"

جس طرح مصور اپنے لہو میں احساس کا برش ڈبو کر خالی کینوس کو سجاتا ہے اسی طرح شاعر بھی رنگوں اور جزبوں کی طلسماتی دنیا کو سوجھ بوجھ رکھتا ہے۔وہ موسیقار بھی ہوتا ہے اور مصور بھی۔وہ وسیع وعریض کائنات کے بے شمار رنگوں اور سروں کو لفظوں کی مالا میں پرو کر اپنے تخیل کی قوت کے سہارے صفحہ قرطاس پر نقوش اُبھارتا ہے اور رنگوں،سروں اور جذبوں کی تصویر بناتا ہے۔ جہاں تک پروین شاکر کی شاعری کا تعلق ہے۔وہ بنیادی طور پر عشق کے جذبات وتجربات کی شاعری ہے۔اُردو کی عشقیہ شاعری کے سرمائے میں منفرد اور خوبصورت اضافہ ہے۔یہی وجہ ہے کہ بہت پہلے سے ہی پروین شاکر کی خوبصورت شاعری نے میری توجہ اپنی جانب کھینچ لی اور میں اس کا مطالعہ کرتا رہا۔جب پی ۔ایچ۔ڈی مقالے کے لیے موضوع کا انتخاب کا مرحلہ سامنے آیا تو میں نے اپنے پسندگی کی بنا پر پروین شاکر کی شخصیت اور شاعری کے موضوع کو منتخب کیا۔شعبہ اُردو کے اساتذہ کرام نے اس موضوع کو پسند کیا اور اس پر کام کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔خدا کے فضل وکرم سے دیگر تکنیکی مسائل جو اس کام کی راہ میں حائل تھے دور ہوگئے اور اس موضوع کا کام شروع ہوا۔ اس مقالے کا عنوان ''پروین شاکر:شخصیت اور شاعری'' ہے۔موضوع سے منسلک اہم مباحث کو زیر بحث لانے

کے لیے مقالے کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔

پہلا باب ''پروینؔ شاکر کے حالات زندگی'' ہے اس باب میں پروینؔ شاکر کے حالات زندگی کا پورا جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے جس میں خاندانی پس منظر، پیدائش، تعلیم وتربیت، ادبی ماحول، وفات شامل ہیں یہ سب مل کر اس ظاہر شخصیت کو سامنے لاتے ہیں۔

باب دوم کا عنوان ''پروینؔ شاکر کی نظم نگاری'' ہے۔ اس عنوان کے دو حصے قائم کئے گئے ہیں۔ پہلا حصہ ''اردو نظم نگاری کا منظر نامہ'' کے بحث کے لیے مختص ہے۔ دوسرے حصہ میں ''پروینؔ شاکر کی نظمیہ شاعری'' کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔

باب سوم کا عنوان ''پروینؔ شاکر کی غزل گوئی'' ہے۔اس عنوان کے دو حصے کئے گئے ہیں۔ پہلا حصہ ''اردو غزل گوئی کا منظر نامہ'' کے بحث کے لیے مختص ہے۔ دوسرے حصہ میں ''غزل گوئی میں پروینؔ شاکر کا اجتہاد'' کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔

باب چہارم'' پروینؔ شاکر کی شاعری کی انفرادی خصوصیات '' کے لیے مختص کیا گیا ہے۔
باب پنجم''ماحصل'' ہے۔

آخر میں ''کتابیات'' دی گئی ہے۔

یہاں مواد کی فراہمی اور اس سے استفادہ کے سلسلے میں کچھ عرض کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔مقالے سے متعلق بیشتر کتابیں میری ذاتی کتب خانے میں موجود ہیں ۔ بہت سی کتابیں بازار سے خریدیں لیکن کچھ کتابیں بازار میں دستیاب نہیں تھے اس کے لیے میرے ایک دوست جو سینٹرل یونیورسٹی کشمیر میں مقالہ نگار ہیں جس نے بہت سی مواد کی فراہمی میں اہم رول ادا کیا۔

میں سب سے پہلے ربُ العالمین کا شکریہ کرتا ہوں جسکی استعانت سے میرا مقالہ اپنے پایہ تکمیل کو پہنچا۔

اللہ کا فرمان ہے کہ جو میرے بندے کا شکریہ ادا نہیں کرتا، وہ میرا بھی شکر ادا نہیں کرتا، لہٰذا میں خاص کر اپنے نگراں ڈاکٹر قائد علی خان صاحب کا شکر گزار ہوں جنھوں نے اپنی مصروفیات کے باوجود ہر قدم پر میری رہنمائی فرمائی۔ان کے رہنمائی اور حوصلہ افزائی کا نتیجہ ہے کہ میرا مقالہ تکمیل کے مراحل تک پہنچا۔

شکریہ ہے کہ اس فہرست میں میری نظر جس ہستی کی طرف جاتی ہے وہ میرے والدین صاحبان ہیں اور میرے خاص دوست آصف مجید ہیں جنھوں نے ہر ممکن میری مدد فرمائی اور مجھے کبھی بھی ہمت ہارنے نہیں دیا اُن کے شکریہ کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں۔ان کی شمولیت کے بغیر اس کام کا پایہ تکمیل تک پہنچنا ناممکن تھا۔امید ہے کہ میرے ممتحن صاحبان میری غلطیوں سے صرف نظر کریں گے۔تحقیق میں کوئی بات حرف آخر نہیں ہوتی۔میں نے دستیاب مواد کو سامنے رکھ کر مقدور بھر نتائج اخذ کرنے کی کوشش کی ہیں اور امید کرتا ہوں کہ میری کوشش بارآور ثابت ہوگی۔

مقالہ نگار

محمود حسین لون

ترتیب

نمبر شمار | | صفحہ نمبر

ا

باب اول

پروین شاکر کے حالاتِ زندگی

(ا) خاندانی پس منظر

(ب) پیدائش، تعلیم و تربیت

(ج) ادبی ماحول، وفات

(ا) خاندانی پس منظر :

پروینؔ شاکر متوسط طبقے کے ایک سادات خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ان کے آباواجداد کا تعلق ہندوستان کے صوبہ بہار میں ہیر پا سرائی دربھنگہ کے نزدیک محلّہ چندل پٹی سے تھا۔ان کے والد کا نام سید شاکر حسین اور تخلص ثاقبؔ تھا اوران کی پیدائش ۱۹۲۵ء میں صوبہ بہار کے ایک قصبہ حسین آباد ضلع مونگیر میں ہوئی۔ وہ خود بھی شاعر تھے۔ان کے خاندان میں ادبی ذوق کئی نسلوں سے چلا آرہا ہےاوران کے خاندان میں کئی نامور شخصیتیں بھی گزری ہیں۔

پروینؔ کی والدہ کا نام افضل النساء تھااور عرف منن بیگم تھا۔ان کا تعلق بہار سے تھا۔ یہ بہت بڑی نیک خاتون تھیں۔ یہ شاکر حسین کی کزن کی بیٹی یعنی سید کاظم صاحب کی صاحبزادی تھی جوافضل پورہ پٹنہ میں رہتی تھی۔ طالب علمی کے زمانے میں ہی شعر کہتے تھےاوراس سلسلے میں انھیں انعامات بھی ملتے رہتے تھے۔ پروینؔ کے دادا سید ابوالحسن جواپنے علاقے کے چند تعلیم یافتہ لوگوں میں شمار ہوتے تھے۔سید ابوالحسن کے دس بچے تھے۔جن میں آٹھ لڑکےاور دولڑکیاں تھے۔۱۹۳۰ء کے آس پاس اُس علاقے میں کوئی ایسی بیماری پھیل گئی جس کی وجہ سے بہت لوگ لقمہ اجل ہوئے۔جن میں سید ابوالحسن کے پانچ بیٹے بھی اس وباء کی وجہ سے مرگئےاور باقی تین میں سے دو بیٹوں نے مذہبی تعلیم حاصل کر کے عالم بن گئےاوران تین بیٹوں میں سید شاکر حسین سب سے چھوٹے تھے ان کے والد صاحب نے انھیں بھی اس کارِ خیر کے لیے نامزد کیا تھا۔لیکن وہ آزاد طبیعت کے مالک تھے۔ انھوں نے پٹنہ میں تعلیم حاصل کی۔ جب سید شاکر حسین بیس سال کے تھےتو سید مجاہد حسین کے ساتھ قیام پاکستان سے پہلے کراچی ہجرت کی۔ بقول پروینؔ شاکر:

" میرے والد جون ۱۹۴۷ء میں بہار سے کراچی ہجرت کر کے آ گئے ۔قبل

از وقت آنے کا مقصد یہ تھا کہ وہ آزادی صبح آزاد سرزمین پر دیکھیں [۱]

اس کے بعد دونوں کراچی میں چاکی واڑہ علاقے میں رہائش پزیر ہوگئے اور وہاں ٹیلی کمیونی کیشن کے محکمے میں ملازمت کرنے لگے۔ اسی دوران ان کے چچا سید حسن عسکری بھی ان کے پاس کراچی چلے آئے۔ ملک کے تقسیم کے دوران مہاجرین کو انسانیت سوز واقعات و سانحات سے دوچار ہونا پڑا۔ شاکر حسین کو خود بھی ہجرت کے دوران کافی مصائب و آلام اُٹھانے پڑے۔ جو ان کی حساس طبیعت پر کچھ ایسے نقش ہوئے کہ اُن کا دل شعر و شاعری سے بالکل اُداس ہوگیا اور وہ زیادہ تر مذہب کی طرف مائل ہوئے۔

شاکر حسین صاحب کا خاندان حسین آباد میں ختم ہو چکا ہے۔ کچھ رشتہ دار چندن پٹی لہریا سرائے دربھنگہ میں مقیم ہیں۔ شادی کے بعد شاکر حسین عرف (رجن) رضویہ کالونی کراچی منتقل ہوگئے۔

شاکر صاحب کی صرف دو بیٹیاں تھیں۔ پہلی نسرین شاکر جو ۱۶ مارچ ۱۹۵۰ء میں پیدا ہوئیں۔ وہ بھی شعری ذوق رکھتی ہیں۔ اگر چہ پیشے کے اعتبار سے ہومیو پیتھک ڈاکٹر ہیں۔ اکثر اُس کی صحت ٹھیک نہیں رہتی تھی۔ بلڈ کینسر کی مریضہ ہیں۔ ان کی شادی شاکر حسین صاحب کے دوست کے بیٹے سے ہوئی تھی۔ وہ لڑکا فالج کی بیماری کا شکار تھا جس کی وجہ سے شادی ناکام ہوگئی اور نسرین اپنے والدین کے گھر ہمیشہ کے لیے آگئیں۔ نسرین کے مطابق ان کے والد صاحب انتہائی شریف النفس اور معصوم فطرت تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ لوگوں پر حد سے زیادہ بھروسہ کرتے تھے۔ ان کی بیماری کا سبب بھی ان کے ساتھ ہونے والا واقعہ یہی ہے۔

پروین شاکر کو فطری طور پر تمام خوبیاں جو والدین کی آغوشِ تربیت سے وراثتاً ملی تھیں اور پھر ان کو جو سازگار ماحول فراہم ہوا وہ ان کی صلاحیتوں و جلا بخشنے میں مددگار ثابت ہوا۔ حسن عسکری صاحب جیسی باذوق

---

[۱] او۔ بی۔ سہیل، خوشبو کی سفیر مشمولہ خوشبو پھول تحریر کرتی ہے، مرتبہ ڈاکٹر سلطانہ بخش (اسلام آباد، انقلاوگ پبلی کیشنز ۲۰۰۰) ۱۹۱

زندگی شخصیت کا سایہ ان کے شب و روز پر پڑتا رہا۔ حسن عسکری صاحب کی تجربہ کار نگاہ نے پروینؔ شاکر میں موجود شعری صلاحیت کو بھانپ لیا تھا اور اس سلسلے میں انھیں ابتدائی سبق دنیا شروع کیا اور آگے بھی وہ اپنے نانا سے اصلاح لیتی رہیں۔ ان کے گھر کا ماحول علم و ادب کے رنگوں سے آراستہ تھا جو ان کی علمی استعداد میں اضافے کا باعث بنا۔ اُن کے خاندان میں بیت بازی کی محفلیں جمتی رہتی تھیں جس سے ان کا شعری ذوق پروان چڑھا اور زبان درست ہوئی۔ پروینؔ کی والدہ دل کی مریضہ تھیں۔ نسرین اپنے والدین کی بہت خدمت کرتی تھیں جبکہ پروینؔ ذہانت و قابلیت کے بل بوتے پر اپنے اہل خانہ کے لیے باعث فخر تھیں۔ انھیں اکثر انعامات اور ٹرافیاں ملتی رہتی تھیں۔

پیدائش، تعلیم و تربیت

افضل النساء کافی کمزور تھیں ان کی صحت بھی ٹھیک نہیں رہتی تھی اس لیے دوسرے بچے کے لیے انھوں نے بہت سی دعائیں کیں، روزے رکھے، بہت منتوں مرادوں کے بعد ان کے یہاں دوسری بیٹی پیدا ہوئی جو بہت خوبصورت تھی۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں اور بھرے بھرے ہونٹ تھے۔ خوش اخلاق اس کے بلند بخت ہونے کی نشاندہی کر رہی تھی اور یہ بات آگے چل کر صحیح ثابت ہوئی۔ وہ ایک دانشور بن کر دنیا کے سامنے آئیں۔

پروینؔ شاکر کی پیدائش بروز پیر ۲۴ نومبر ۱۹۵۲ء کو کراچی میں ہوئی۔ پروین ''فارسی میں ستاروں کے ایک خوبصورت جھرمٹ کا نام ہے''۔ اپنے نام کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

''میری پیشانی کو دیکھ کے میری ماں نے میرا نام ایک تارے کے نام پر رکھا جگمگ کرنے والا تارا''[۱]

۱۔ پروین قادر آغا، گہرِ اشک قطرہ باراں مشمولہ خوشبو کی ہمسفر، مرتبہ ڈاکٹر سلطانہ بخش (اسلام آباد، لفظ لوگ پبلی کیشنز، ۲۰۰۰) ۳۲۰

تین سال کی عمر میں پروین کو اپنی بڑی بہن نسرین کے ساتھ نزدیکی اسکول بھیجا گیا۔ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات کے مصداق بچپن سے ہی اس کی ہر ادا سے ذہانت وفطانت کا اظہار ہوتا تھا جس کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ تیسری کلاس سے اُنھیں دہری ترقی ملی اور وہ اپنی بڑی بہن نسرین کے ساتھ پانچویں جماعت میں آگئیں جن اسکولوں سے وہ فیض یاب ہوئیں خود اس کا تزکرہ وہ ان الفاظوں سے کرتی ہیں:

> ''۲۴ نومبر ۱۹۵۲ء کے دن اس عالم رنگ و بو میں پہلی سانس لی۔ ابھی گڑیاں کھیلنے پہل دوج اور کوڑا جمال شاہی کے لطف سے دل بھی نہ بھرا تھا کہ کاغذی زنجیر پیروں میں ڈال دی گئی۔ پہلے اسلامیہ کیمبرج اسکول کا دامن پکڑا جو میٹرک کے بعد چھوڑا۔ پھر سید کالج نے اپنے دامن میں پناہ دی۔ جامعہ کراچی سے انگریزی میں ایم۔اے کیا اور بحیثیت لیکچرار سید گرلز سے وابستہ ہوں'' [1]

پروین شروع سے ہی زیادہ حساس اور نرم مزاج تھی کوئی بات خلاف عادت ہو جاتی تو ان کا مزاج خراب ہو جاتا۔ وہ چیزوں کو سلیقے سے رکھنے کی عادی نہیں تھی۔ ان کی چیزیں بکھری رہتی تھیں۔ کمرے کی صفائی کرنے میں بھی دونوں بہنوں میں جھگڑا ہو جاتا تھا۔ پروین پہننے اوڑھنے کے معاملے میں بھی بہت نفاست پسند تھی۔ ان کے پسندیدہ رنگ سبز رنگ اور گلابی رنگ تھے انہی رنگوں کے فراک اُنہیں پہنائے جاتے۔ بچپن میں ان کے بال بہت لمبے تھے جو ربن سے دو چوٹیوں کی شکل میں گندھے ہوتے تھے۔

پروین شاکر کی والدہ نماز کی پابند تھیں مجالسِ عزا میں شرکت کرتی رہتی تھیں۔ پروین شاکر کو بھی مجالس میں شرکت کرنا بہت پسند تھا۔ وہ اپنی والدہ کے ساتھ مجالس میں جاتی رہتی تھی۔ اس دور کی مشہور ذاکرہ بطول ترابی تھیں۔ پروین مجالس میں ان کا بغور مشاہدہ کرتیں اور گھر جا کر چھوٹے بچوں کو جمع کر کے بطول کے انداز کی مشق

---

[1] ڈاکٹر سلطانہ مہر، پروین شاکر مشمولہ خوشبو کی ہمسفر، مرتبہ ڈاکٹر سلطانہ بخش (اسلام آباد، لفظ لوگ پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء) ۳۲۰

کرتیں۔شیعہ خاندان کی یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ آنکھ کھولتے ہی بچے کی شناسائی انیسؔ و دبیر کے مرثیوں کے ذریعے سے ہوتی ہے۔اس طرح اوائل عمری میں ہی انیسؔ و دبیرؔ کا کلام سن سن کر پروینؔ نے لفظوں کی خوشبو کو سونگا اور لفظوں کے ذائقے کو محسوس کیا۔اُن پر جملے کا جمال اور حرف کی حرمت کے در وا ہوتے چلے گے۔انہی مجالس کے ماحول سے انھیں لفظوں کی طلسمی قوت کا اندازہ بھی ہوا اور انھوں نے لفظوں سے اپنا رشتہ جوڑ لیا۔مرثیے اور سوز خوانی کے ماحول نے ان کے تخلیقی ذہن کو نمو دی۔

پروینؔ نے اپنی ملازمت کے سسلے میں اظہار خیال کرتے ہوئے کہا ہے کہ وہ ماسٹرز کرنے کے بعد پی۔ایچ۔ڈی کے لیے باہر جانا چاہتی تھی لیکن نہیں جا سکی۔کیونکہ پی۔ایچ۔ڈی کے مراحل سے ناواقف تھی۔پروینؔ کو کالج میں پرنسپل نے ٹیچنگ پر مامور کر دیا اس طرح وہ ان کے کہنے پر پڑھانے لگیں۔پھر پی۔ایس۔سی کے انٹرویو کے لیے منتخب ہوگئی۔اس وقت کالجز نیشنلائزڈ نہیں ہوئے تھے۔پروینؔ کو عبداللہ گرلز کالج کراچی میں پڑھانے کے لیے بھیج دیا گیا۔پروینؔ کے لیے درس و تدریس کا تجربہ نیا تھا کیونکہ طالبات پڑھنا نہیں چاہتے تھے۔جن طالبات سے ان کا واسطہ پڑا تھا ان میں اکثریت ایسی تھی جس نے چھٹی جماعت کے بعد انگریزی پڑھی۔انہیں انگریزی پڑھانا ویسے بھی دشوار تھا۔ان کے لیے ڈکن وغیرہ بہت مشکل تھے اور پروینؔ انہیں جین آسٹن پڑھا رہی تھی جس کے باعث استاد و شاگرد میں افہام و ترسیل کا مسلہ پیدا ہو گیا۔اس نے پھر ملازمت کی تبدیلی پر توجہ دی اور سول کے امتحان میں اعلیٰ کامیابی حاصل کر کے محکمہ کسٹمز سے وابستہ ہو گئیں۔عبداللہ کالج میں ان کی خدمات کا عرصہ نو سال پر محیط ہے ۱۹۸۲ء سے سیکنڈ سیکریٹری سی۔بی۔آر (اسلام آباد) متعین ہوئی اور اسٹنٹ ڈائریکٹر ایڈمنسٹر راولپنڈی اور ڈپٹی کلکٹر اسلام آباد کے عہدوں پر فائز رہی۔

پروینؔ شاکر جوں ہی جوان ہوئیں تو اسے بہت سے رشتے آئے۔مگر آخر کار ان کی شادی خالہ

زاد بھائی نصیرعلی سے ۱۹۷۶ء میں ہوئی جو ملٹری میں ڈاکٹر کے پیشے سے وابستہ تھے۔ ملک کی سرکردہ ادبی شخصیات شادی میں شریک ہوئیں۔ جن میں فہمیدؔہ ریاض، اطہر نفیس، اختر حسین جعفری، فاطمؔہ حسن شامل تھیں۔ شادی کی تقریب بہت سی سادگی کے ساتھ انجام پائی۔ کیونکہ ان دنوں حکومت کی طرف سے زیادہ نمود و نمائش اور کھانے کی دعوت پر مکمل پابندی عائد تھی۔

ہرلڑکی کی زندگی کا ایک نیا دور شادی کے بعد شروع ہوتا ہے۔ انجان ماحول اور مختلف مزاج رکھنے والے لوگوں کے بیچ ایک لڑکی کے لیے آزمائش سے پُر یہ کٹھن اور صبر آزما دور ہوتا ہے۔ خاص طور پر ہمارے برصغیر ہند و پاک کے معاشرے میں جہاں میاں بیوی اپنی زندگی خود جینے کا حق نہیں رکھتے بلکہ ان کی زندگی دوسرے لوگ جیتے ہیں اور اکثر و بیشتر گھرانوں میں شادی ہوتے ہی بہو سے ضرورت سے زیادہ توقعات وابستہ کر لی جاتی ہیں۔ اس کے نازک کندھوں پر ذمہ داریوں کا بوجھ لاد دیا جاتا ہے۔ اس کی اپنی تمنائیں، آرزوئیں اور ارمان کس طرح سسک کر دم توڑ رہے ہوتے ہیں۔ اس سے کسی کو سروکار نہیں ہوتا۔ یہاں تک کہ وہ اپنے آپ سے لاتعلق ہو کر بکھر سی جاتی ہے۔ اگر کوئی لگے بندھے نظام کی پیروی نہ کرے تو اسے اس معاشرے میں معتوب ٹھہرایا جاتا ہے۔ جہاں تک پروینؔ شاکر کے سسرال کا تعلق ہے وہ بھی قدامت پرست اور روایتی قسم کا تھا۔ یہ ایک بڑا خاندان تھا جہاں ساس سسر کے علاوہ دو نندیں اور نصیر کے شادی شدہ بھائی بھی شامل تھے۔ پروینؔ نے ایک مشرقی لڑکی کی طرح اپنے آپ کو اس نئے ماحول میں ڈھالنے کے بہت جتن کئے۔ ملازمت کے ساتھ ساتھ گھریلو کام کاج بھی کیے۔ حالانکہ انھوں نے گھر کے کام پہلے بہت کم کیے تھے۔ انھیں کھانا پکانا بھی نہیں آتا تھا۔ کیونکہ ان کی دنیا تو کتابوں سے لگاؤ اور ادبی و شعری محفلوں تک تھی۔ تاہم وہ اپنی بہن نسرین کو فون کر کے کھانا پکانے کی تراکیب پوچھتی رہتی تھیں۔ مزید ان کی دیگر علمی و ادبی مصروفیات بھی تھیں۔ مختلف مشاعروں میں انھیں مدعو کیا جاتا۔ اس سلسلے میں بحر حال شوہر کا تعاون انھیں حاصل رہا۔ لیکن ایک طرف

ملازمت دوسری طرف ادبی مصروفیات اور گھریلو ذمہ داریاں ہونے کی وجہ سے ان کی گھریلو زندگی متاثر ہونے لگی۔ وہ روایتی بہوؤں کی طرح اپنے آپ کو صرف گھر گھر تک محدود نہیں رکھ سکتی تھیں جو کہ ان کے سسرال والوں کا تقاضا تھا۔ اس وجہ سے مزید رنجشیں بڑھنے لگیں۔ پروینؔ شاکر حد سے زیادہ کوشش کرتی رہیں کہ ان کی گھریلو زندگی میں تلخیاں نہ گھلیں لیکن سب کا دل جیتنا ان کے بس کا کام نہیں تھا۔

پروینؔ جیسی اعلیٰ تعلیم یافتہ اور منفرد خوبیوں کی حامل شخصیت سسرال والوں میں خاص پزیرائی نہ ہوئی۔ انھوں نے پروینؔ کی بے مثال صلاحیتوں کو قدر کی نگاہ سے نہ دیکھا۔ جس کی وجہ سے کچھ افسردہ اور ملول سی رہنے لگیں۔ ان کے کئی اشعار ان کی ناآسودہ ازدواجی زندگی کے کرب کو پیش کرتے ہیں۔

؎ وہی تنہائی، وہی دھوپ، وہی بے سمتی
گھر میں رہنا بھی ہوا رہگزر میں رہنا

؎ جب بھی گئے، عذاب در و بام تھا وہی
آخر کو کتنی دیر سے گھر جانا چاہیے [۱]

جب نصیر کا تبادلہ ایبٹ آباد میں ہوا تو پروینؔ شاکر بھی ایک سال کی چھٹی لے کر ان کے ساتھ چلی گئیں۔ وہاں کسی حد تک وہ خوش اور مطمئن تھیں۔ کیونکہ نصیر کے ساتھ ان کے تعلق اچھے رہے۔ لیکن نصیر کے گھر والوں کے ساتھ ان کی ذہنی مطابقت نہیں تھی۔ سکون کا یہ دورانیہ بہت مختصر تھا۔ نصیر کے والدین نے واپس کراچی آنے کے لیے اصرار کیا۔ کیونکہ نصیر کے بڑے بھائی سید تنویر علی جو انجینئر تھے اور عین عالمِ شباب میں کوئلے کی کان میں دھماکہ ہونے سے انتقال کر گئے تھے جس کی وجہ سے نصیر کی والدہ افسردہ رہنے لگی تھیں اور اپنے دوسرے

۱۔ پروینؔ شاکر، خود کلامی مشمولہ ماہِ تمام (اسلام آباد، مراد پبلی کیشنز:۱۹۹۴) ۱۸۱

بیٹے کی جدائی کی متحمل نہیں ہو سکتی تھیں۔

پروین کو پھر سے مشترکہ خاندان میں رہنا پڑا۔ پُرانے مسائل پھر سے ابھرنا شروع ہوئے جس سے دونوں میاں بیوی میں فاصلے پیدا ہونے لگے۔ ایسا لگتا ہے کہ دونوں اپنی ازدواجی زندگی کو کامیاب بنانے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے لیکن دوسرے لوگوں کی بے جا مداخلت سے ان کی زندگی میں تلخیاں در آئیں۔ ان دونوں کے بیچ فاصلوں کو بڑھانے میں کچھ رشتہ دار خواتین نے اہم کردار ادا کیا۔ ایک دفعہ تو صورت حال اس حد تک بگڑ گئی کہ نصیر نے مفاہمت کی یہ صورت نکالی کہ جب تک الگ رہنے کا کوئی متبادل انتظام نہ ہو اس وقت تک پروین پُرتناو ماحول سے دور اپنے مائیکے میں ہی رہیں۔ چنانچہ مارچ ۱۹۷۹ء میں نظیر صدیقی کے نام ایک خط میں اس تمام صورت حال کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتی ہیں:

> ''آپ کو غلط فہمی ہوگی کہ میں نے آپ کو کبھی اپنے گھر کا پتہ نہیں بتایا اور نہ بلایا اور یہ خط کہیں اور آتا ہے اور میں کہیں اور ہوتی ہوں۔ تو مختصراً میں آپ کو بتا دوں کہ ایسی کوئی بات نہیں۔ بس صرف اتنی بات تھی کہ میرا کوئی گھر نہیں ہے آپ اس جملے سے بہت چونکے ہوں گے۔ مگر میں آپ کو صورت حال سے تھوڑا سا آگاہ کر دوں کہ میں گذشتہ ستمبر سے اپنی امی کے ہاں مقیم ہوں۔ میرے اور نصیر کے تعلقات بہت اچھے ہیں۔ مگر ان کے گھر والوں سے میں ایڈجسٹ نہیں ہوئی اور اس کی واحد وجہ یہ تھی۔ کہ میں میز کرسی الماری نہیں تھی۔ سوچنے والا ذہن رکھتے ہوئے ایک لڑکی تھی۔ نصیر تقریباً روز ہی مجھ سے ملنے آتے ہیں۔ ویک اینڈ پر رہ بھی جاتے ہیں۔ مگر آج تک گھر لے کر رہ نہیں سکے۔ اس لیے کہ عین

موقع پر کوئی گڑ بڑ ایسی ہو جاتی ہے۔ کہ معاملہ ہی ختم ہو جاتا ہے۔ نصیر اس
لیے کچھ زیادہ ہی باہر جانے کی کوشش میں ہیں کہ کسی طرح یہاں سے نکلیں
تب ہم اکھٹے رہ سکیں۔ یہ سب مشکلات عرصے سے چل رہے تھے
کہ میں آپ کو کیا بلاتی کہاں بلاتی؟ مگر چونکہ اب یہ طے ہو چکا ہے کہ جب
تک نصیر پاکستان سے باہر نہیں جاتے اور جس کے لیے انھوں نے کئی
جگہ انٹرویو دے رکھے ہیں۔ میں امی کے پاس رہوں گی۔ میرا سامان
وہیں پڑا ہے۔ میں اسپتال میں ایڈمٹ ہونے کے لیے نصیر کے ساتھ نکلی
تھی۔ آپریشن کے بعد جیسا کہ اکثر گھرانوں میں ہوتا ہے امی مجھے اپنے
ساتھ لے آئیں۔ اور پھر یہ صورتحال اتنی زیادہ بگڑ گئی۔ کہ خود نصیر نے یہ فیصلہ
کیا کہ میرا یہیں رہنا بہتر ہے۔'' [۱]

لیکن کچھ ہی دنوں بعد ان کی زندگی میں بہت پریشانی اور مایوسی بڑھتی گئی۔ لیکن اس کے اسباب پتہ نہیں چلے کہ محبت نفرت میں اتنی جلدی تبدیل ہوگئی کہ ازدواجی زندگی زیادہ عرصے تک خوشگوار نہ رہ سکی۔ پروینؔ نے سسرال والوں کو خوش کرنے کے لیے تمام حربے استعمال کیے مگر وہ ناکام رہیں اور آخر شادی ٹوٹ گئی جس کے باعث پروینؔ کو بہت ذہنی دباو ہوا اور دل میں بھی سکون ختم ہو گیا۔ یہ بے قراری اس کے اشعار میں درد بن کر جلکھتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

---

[۱] ۔ جاوید وارثی، پروینؔ شاکر کے خطوط نظیر صدیقی کے نام (کراچی، نشاط ادب، مشہور پریس، ۱۹۹۶) ۸۴

اپنی محرومی کو وہ ایک شعر میں اس طرح بیان کرتی ہیں:

میں سوچتی ہوں کہ مجھ میں کمی تھی کس شئے کی
کہ سب کا ہو کے رہا بس اک مرانہ ہوا

پروین کے ادبی دائرے کے مخالفین اور کچھ ان کی سہیلیوں نے بے بنیاد بہانوں کو ہوا دینا شروع کیا جو وہ برداشت نہ کرسکی اور بیمار پڑ گئیں۔ انھوں نے ریڈیو اور مشاعروں میں جانا بند کر دیا۔ پروین کی زندگی میں اور کئی حادثات اور واقعات رونما ہوئے لیکن طلاق کے حادثے نے ان کے دل و دماغ پر گہرے اثرات مرتب کیے اور جو ان کی شخصیت کا عنصر بن کر ان کی شعری تخلیقات میں کھلی کتاب بن کر رہ گیا۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ انہیں زندگی میں کونسا دھکا لگا ہے تو اس نے نہایت حسرت کے ساتھ جواب دیا تھا۔

" I AM A SINGLE PARENT جس سوسائٹی میں ہم رہتے ہیں وہاں یہ بہت ہی مشکل کام ہے . IT IS HARD LIFE TO LIVE میں کوشش کرتا رہوں کہ اُسے خوشگوار بنا سکوں۔

پروین نے ایک بیٹے کو جنم دیا تھا جس کا نام مراد ہے۔ اسے پروین پیار سے گیتو پکارتی تھیں۔ طلاق ہونے کے بعد اُن کو کسی اور نئے رشتے کی ضرورت بھی محسوس نہیں ہوئی۔ ان کی زندگی کا مقصد اپنے پیارے بیٹے کی تعلیم و تربیت رہا تھا کیونکہ اب اپنے بیٹے کی پرورش اور تعلیم و تربیت ہی ان کی زندگی کا مقصود سے پروین کی وابستگی غیر معمولی تھی۔ جب تک وہ زندہ رہیں اپنے پیارے بیٹے کے بارے میں سوچتی رہیں۔ مراد نے شاعری کی طرف توجہ نہیں دی۔ اس کو نیوروسرجن بننے کی خواہش تھی۔

ادبی خدمات

پروینؔ بچپن ہی سے غیر معمولی صلاحیتوں کی مالک تھیں اور دوسرے بچوں سے بالکل الگ تھلگ دکھائی دیتی تھیں۔ کلاس میں ہمیشہ اول آتی تھیں۔ ہمیشہ سے ان کا تعلیمی ریکارڈ کافی شاندار رہا ہے۔ نصابی اور غیر نصابی سرگرمیوں میں بھی ہمیشہ آگے رہیں۔ ابھی وہ آٹھویں جماعت میں ہی تھیں کہ ان کا ایک مضمون ان کی ٹیچر نے بہت پسند کیا۔ ان کی حوصلہ افزائی کی اور ساتھ ہی یہ پیشن گوئی بھی کی کہ یہ مضمون لکھنے والی بچی ضرور مستقبل کی ادیبہ ہوگی۔

پروینؔ کی تخلیق صلاحیتوں کو جلا بخشنے میں ان کے قابل اساتذہ کا بھی بہت ہاتھ ہے۔ ان میں مسز زاہدہ تقی خاص طور سے قابل ذکر ہیں وہ رضویہ گرلز سکینڈری سکول کی پرنسپل تھیں۔ وہ ایک باصلاحیت خاتون تھیں اور بچیوں کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دیتی تھیں۔ کالج میں پروینؔ نے آرٹس کے مضامین منتخب کیے۔ کیونکہ ان کا رجحان سائنسی مضامین کی طرف نہیں تھا۔ انھیں سائنسی مضامین کافی خشک معلوم ہوتے تھے۔ اس لیے انھوں نے انگریزی ادب کا مضمون اختیار کیا۔ لیکن وہ مضامین وغیرہ اردو میں لکھتی رہیں۔ ان کی شاعری کی ابتداء نظم سے ہوئی جو انھوں نے سال اول میں کالج میگزین میں اشاعت کے لیے دی۔ اس نظم کا عنوان ''مون سون کی برسات'' تھا۔ اس کا پہلا مصرعہ یہ تھا۔

''دیکھا وہ کوئی جوگن جنگل میں گا رہی ہے'' ۔[۱]

اس نظم کو بے حد پسند کیا گیا۔ نانا نے حوصلہ افزائی کی اور انھیں عروض کی تعلیم دینا شروع

۱۔ پروین آغا قادر، گُہرِ اشک قطرہ باراں مشمولہ خوشبو کی ہمسفر مرتبہ ڈاکٹر سلطانہ بخش(اسلام آباد لفظ ،لوگ پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء) ۳۲۷

کی اور آگے بھی مشقِ سخن جاری رکھنے کی تلقین کی۔ کالج کے دور میں مسز عرفانہ نے پروین کے تخلیقی جوہر کو پہچان لیا۔ ان کی حوصلہ افزائی کرتی رہیں وہ انھیں بالکل اپنی اولاد کی طرح چاہتی تھیں۔ عرفانہ اکنامکس پڑھاتی تھیں اور پروین کا یہ مضمون نہیں تھا۔ لیکن عرفانہ صاحبہ اردو میں شاعری کرتی تھیں۔ ان کا کلام ادبی رسالوں کی زینت بنا رہتا تھا۔ پروین کو ایک شاعرہ کی حیثیت سے متعارف کرنے میں عرفانہ عزیز کا بہت ہاتھ ہے۔ مسز عرفانہ عزیز نے پروین کو اپنے ذہن اپنی روح اور اپنی ذات کا توسیع کہہ کر اپنی طالبہ کی صلاحیتوں کو سراہا اور خراج تحسین پیش کیا ہے۔ اس بارے میں پروین خود یوں رقمطراز ہیں:

> ''زانوئے تلمذ میں نے مشہور شاعرہ عرفانہ عزیز کے سامنے تہہ کیا جن سے مجھے ہمیشہ عقیدت ہے اور رہے گی۔ جو کچھ بھی میں آج ہوں وہ انہی کی حوصلہ افزائی اور اصلاح کا نتیجہ ہے۔ وہ میری ذہنی اور روحانی استاد ہیں۔ محترمہ عرفانہ عزیز کے علاوہ جس شخصیت نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ محترمہ زاہدہ تقی ہیں۔ جن کے سکول میں میں نے سات سال تک پڑھا۔ انہی کی حوصلہ افزائی سے میں نے میٹرک اور انٹر کے امتحانات میں کامیابی پر اسکالرشپ حاصل کیا۔ ان کی طبیعت کا ستھرا پن صحیح مذاق کی شائستگی اور مزاج کی سادگی نے میرے دل پر گہرے نقوش مرتسم کیے۔''[۱]

اور بقول عرفانہ عزیز :

۱۔ ڈاکٹر سلطانہ مہر، پروین شاکر مشمولہ خوشبو کی ہمسفر، مرتبہ ڈاکٹر سلطانہ بخش (اسلام آباد لفظ لوگ پبلی کیشنز، ۲۰۰۲) ۱۶۱

''پروینؔ میری ذہین اور قابل شاگرد تھی عقل ودانش کا پیکر ذہانت و فطانت
میں یکتا ،آداب و شائستگی کی تصویر وہ بے پناہ صلاحتیں رکھتی تھی
اس کا مطالعہ ہمیشہ وسیع رہا ''[۱]

محترمہ عرفانہ عزیز نے پروینؔ میں موجود شعری صلاحیت کو ابھارا (یاد رہے کہ اس وقت تک پروینؔ نثر میں ہی لکھتی تھیں)اور چھ ستمبر یومِ دفاع پاکستان کے لیے نظم لکھنے کے لیے اصرار کیا۔ پروینؔ نے عرفانہ صاحبہ کی رہنمائی میں نظم لکھی جس کا عنوان تھا۔ نظم صبح وطن کچھ اس طرح شروع ہوتی ہے۔

دفعتاً نور ہوا، آگے بڑھا اک جبریل
دل میں روشن کیے آزادی کی نوریں انجیل
عزم کی آگ تھی ،ایمان کی حرارت دل میں
ظلمتیں پگھلیں ،ترشنے لگی اک جمیل صبح وطن

پروینؔ کی دوسری شعری کاوش بھی نظم ہی کی صورت میں تھی ۔اب انہیں خود بھی احساس ہوا کہ نثر کے ساتھ ساتھ وہ شعری رجحان بھی رکھتی ہیں۔اس کے بعد ان کا شعری قلم رواں ہوتا گیا۔ پہلے وہ بینا کے قلمی نام سے لکھتی رہیں ۔شروع سے ہلکے پھلکے موضوعات شاعری کے لیے چُنے مثلاً پرندے، پھول اور تتلیاں وغیرہ بعدازآں ان کی شاعری میں گہرائی آتی گئی۔

شاعری کے آغاز ہی میں گل رعنا کلب کراچی کے طلبا کے مشاعرے میں ان کی ایک نظم کو پہلے انعام سے نوازا گیا۔اس تقریب کی مہمانِ خصوصی پاکستان کے پہلے وزیراعظم کی بیوہ رعنا لیاقت علی خان تھیں۔

---

[۱] پروینؔ شاکر، کہانی میری مشمولہ خوشبو کی ہمسفر مرتبہ ڈاکٹر سلطانہ بخش (اسلام آباد، لفظ لوگ پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء)۳۰۹

کالج کی ادبی سرگرمیوں میں پروینؔ شاکر ہمیشہ آگے رہیں انھوں نے اپنی شوق و محنت کی وجہ سے نمایاں کامیابی حاصل کی۔ کالج میں ''بزمِ ادب'' کی جوائنٹ سیکریٹری کے فرائض سرانجام دیتی رہی۔ اس کے علاوہ اخبار جامعہ کے ادارتی بورڈ سے بھی منسلک رہیں۔

مجلّہ'' سحر'' کی معاون مرید کے فرائض بھی سر انجام دیتی رہی۔ کالج کی بہترین شاعرہ کا اعزاز بھی حاصل کیا۔ ''روزنامہ جنگ'' میں طلبا کے تعلیمی صفحے لیے ''فریاد کچھ تو ہو'' کے عنوان سے ۱۹۶۸ء کام لکھتی رہیں۔ اپنی قابلیت و ذہانت اور محنت کی وجہ سے کالج میں دوران تعلیم کئی توصیفی سرٹیفکٹ یا دستاویزات اور سونے کے تمغے حاصل کیے۔ کالج میں اُن کا شمار قابل ترین طالب علموں میں ہوتا تھا۔ وہ اپنی پڑھائی لکھائی کا ہر کام بآسانی اور نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیتی رہی۔ ساتھ ہی وہ اپنے آس پاس کے نہ صرف حالات وواقعات سے باخبر رہتی۔ بلکہ ملکی و غیر ملکی خبروں سے بھی ان کی دلچسپی پہلے سے (طالب علمی کے زمانے سے) پیدا ہو چکی تھی۔

پروینؔ کی یہ خوش نصیبی تھی کہ بطور شاعرہ کے ان کی شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں جن ہستیوں نے اہم کردار ادا کیا یہ ہستیاں قابل ہونے کے ساتھ ساتھ بہت بے لوث اور مخلص تھیں۔ انھوں نے اپنے خون جگر سے اُسے سینچا اور ان کی رہنمائی کی۔ اس طرح وہ شعر و ادب کی شاہراہ پر رواں دواں ہوتی گئیں۔

محترمہ عرفانہ عزیزؔ کے بعد دوسرا نام احمد ندیمؔ قاسمی کا ہے۔ یہی دو ہستی ہیں جن کے ذریعے وہ شعری دنیا میں متعارف ہوئیں۔ ان کا ہاتھ پکڑ کر پروینؔ نے اپنے تخلیقی سفر کا آغاز کیا۔ احمد ندیم قاسمی (جو کہ فنون کے ایڈیٹر تھے۔) کو جب پروینؔ شاکر کی غزلیں بھیجی گئی تو انھوں نے ان غزلوں کو بہت سراہا اور اپنے جدیدے (اخبار) ''فنون'' میں پروینؔ کا کلام شائع کیا اور پھر مسلسل ان کا کلام ''فنون'' میں چھپتا رہا۔ احمد ندیم قاسمی ان کی ابتدائی شاعری کے بارے میں کہتے ہیں:

''میں نے یہ غزلیں اور نظمیں پڑھیں تو اِکا دُکا مبتدیانہ خامیوں سے قطع نظر
وہ عشقیہ شاعری کی کامیاب مثالیں تھیں۔ پروین کی ان غزلوں میں معصوم
اور بھرپور محبت کے عجیب مسحور کن تیور تھے۔ یہ کلام ''فنون'' کے ۱۹۷۱ء کے
شمارے میں شامل ہوا۔ مجھے شعر و ادب میں جو ہر قابل کی ہمیشہ جستجو رہی ہے
کہ نئی نسلوں کا یہی جوہر ہمارا مستقبل ہے۔ میں نے واضح طور پر یہ لکھا کہ یہ
محض ایک مبتدی کی حوصلہ افزائی نہیں ہے۔ بلکہ یہ غزلیں ہیں ہی بہت پیاری
اور معیاری'' [۱]

اسی دوران دونوں میں خط و کتابت کا سلسلہ چل نکلا اور ان کے بیچ عمو اور بیٹی کا محبت و عقیدت بھرا رشتہ بن گیا جو آخر تک قائم رہا۔ پروین انھیں اپنا روحانی باپ اور پیر و مرشد کا درجہ دیتی تھیں۔ قاسمی صاحب بھی انھیں اپنے بچوں کی طرح تیسری بیٹی مانتے تھے۔ اور انھیں بہت سے فائدے مند مشوروں سے نوازتے رہتے تھے۔ پروین نے جو خطوط احمد ندیم قاسمی کے نام لکھے ہیں انھیں پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ عمو اور بیٹی ہر بات ایک دوسرے کو بولتے تھے اور ایک دوسرے کو دکھ سکھ بانٹتے تھے۔

شعری روایات میں اتنی عشری گھرانے میں آنکھ کھولنے والی بچی ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی شعر کے آہنگ کو جز و سماعت بنا چکی ہوتی ہے۔ شاعری میں انیس کے اشعار غیر شعوری طور پر ان کی لفظیات کا حصہ بن چکے ہوتے ہیں اور سچ بولنے میں اکثر سادہ لفظ آہنگ کی صورت اختیار کرتے چلے جاتے ہیں سو زبان کی وہ تہذیب جو تنظیم کی مہارت انھوں نے ورثے میں پائی ہے۔

پروین کے گھر میں شاعرانہ ماحول تھا۔ پروین نے شاعری کا ذوق اپنے والد سے لیا۔ ان کی شاعری کا آغاز

---

[۱] احمد ندیم قاسمی، میری پروین مشمولہ خوشبو کی ہمسفر، مرتبہ ڈاکٹر سلطانہ بخش (اسلام آباد، لفظ لوگ پبلی کیشنز، ۲۰۰۲) ۱۷

طالب علم کے زمانے سے ہی ہوتا ہے۔شاعری کی اصلاح اپنے نانا سے کرواتی تھی۔ جب ان کے والد حیات تھے تو وہ ان کی شاعری پڑھ کر بہت خوش ہوتے تھے۔یہ شاعری ان کے خاندان کو ورثے میں ملی تھی۔پروین کی بڑی بہن نسرین بھی شعر کہتی تھی مگر وہ منظر عام پر نہیں آئی۔نسرین ایک غمزدہ بلڈ کینسر کی مریضہ تھی۔ اس لیے وہ شاعری میں مقام حاصل نہ کر سکی۔

پروین شاکر نے اپنی شاعری کا آغاز خوشبو کے وطن یعنی خوش رنگ پھولوں ،خوشنما رنگوں اور خوش نوا طائروں کی وادی سے کیا۔مگر جلد ہی زندگی نے ان کی راہوں میں کانٹوں کے جال بچھا دیے۔کیونکہ وہ طبعاً گلشن پرست واقع ہوئی۔ان کی شاعری میں غم وخوشی کی لہریں بیک وقت ابھرتی ڈوبتی نظر آتی ہیں۔

جب پروین کی پہلی کتاب ''خوشبو'' شائع ہوئی تو اس وقت اس کی عمر صرف پچیس سال تھی۔خوشبو کو عوام الناس نے پسند کیا ہے۔احمد نسیم قاسمی، علی سردار جعفری اور احمد فراز جیسے بڑے شاعروں نے بھی داد سے نوازا۔ انھوں نے اپنی پہلی کتاب ''خوشبو'' کا انتساب احمد ندیم قاسمی کے نام کیا ہے۔پروین غالباً اس عہد کی واحد شاعرہ ہیں جن کو کم عمری میں اپنی فنی صلاحیت اور اور استعداد کے بل بوتے پر پانچ بڑے ادبی انعامات و اعزازات حاصل ہوئے تھے۔ایک تو ۱۹۷۸ء میں خوشبو آدم جی ایواڑ ملا۔جو پاکستان میں ایک قومی سطح کا اعزاز تسلیم کیا جاتا ہے۔دوسرے ۱۹۸۵ء میں انہیں ڈاکٹر سر محمد اقبال ایواڈ برائے ادب دیا گیا ہے۔ان سب سے بڑھ کر فیض احمد فیض انٹرنیشنل ایواڈ سے انہیں نوازا گیا۔جو ان کے شاعرانہ رتبے کی شایان شان ہے۔ پروین کو پرائیڈ آف پرفارمنس ایوارڈ بھی ملا جو حکومت پاکستان کا سب سے بڑا ایوارڈ ہے۔

''خوشبو'' کی شاعری میں وہ اپنی شخصیت کے سب پہلوؤں کو سمیٹ لیا ہیں۔ان کی کتاب ''خوشبو'' واضع طور پر ان کی خوشیوں اور غموں کی عکاس ہے۔''خوشبو'' کے علاوہ انھوں نے چار اور شعری مجموعے تخلیق کیے

ہیں جو اس طرح کے ہیں ۱۹۸۱ء میں ''صد برگ''، ۱۹۸۴ء میں ''خود کلامی'' اور ۱۹۹۴ء میں ''انکار'' اور ''کفِ آئینہ'' شائع ہو چکے ہیں۔ ان کا کلیات ''ماہِ تمام'' کے نام سے ۱۹۹۴ء میں شائع ہو چکا ہے لیکن وہ ہمیشہ ''خوشبو'' کے حوالے سے پہچانی گئیں۔ اس کے بعد پاکستان سے باہر بھی ان کی شہرت پھیلنے لگی۔ ہندوستان میں ۱۹۷۷ء تک ان کے نام سے کوئی واقف نہیں تھا۔ ہندوستان میں ان کی شاعری کی دھوم دہلی کلاتھ ملز کے مشہور شنکر شاد مشاعرے کے ذریعے ہوئی جو ۱۹۷۸ء میں دہلی میں منعقد ہوا۔ اس مشاعرے کی اہم خصوصیت یہ تھی کہ اس کے مہمان خصوصی اٹل بہاری باجپائی تھے۔ وہ اس وقت ہندوستان کی وزیر خارجہ تھے۔ انھوں نے اس مشاعرے میں مہمان شعراء کو اجازت دی تھی کہ وہ ملک میں جہاں بھی چاہیں جا سکتے ہیں۔ اس معاشرے میں پاکستان کی مشہور شاعرہ زہرہ نگار اور سمیا قزلباس بھی موجود تھیں۔ لیکن پروینؔ کی بات ہی کچھ اور تھی۔ ہمارے یہاں اکثر شعرا اپنے کلام کو پراثر اور دلنشین بنانے کے لیے خوب لہک لہک ترنم سے گاتے ہیں۔ لیکن پروینؔ ان بناوٹی اداؤں سے بے نیاز تھیں۔ وہ ترنم کی بیساکھی کے بدلے اپنی فنی صلاحیتوں پر یقین رکھتی تھیں۔ چنانچہ انھوں نے اس مشاعرے میں بھی اداکاری کے بغیر سامعین کے پُر زور اصرار پر یکے بعد دیگرے تین غزلیں پڑھیں اور بے پناہ داد و تحسین وصول کی۔ اس وقت وہ چھبیس یا ستائیس برس کی تھیں۔ سامعین بھی حیران تھے کہ اتنی چھوٹی سی عمر میں اس لڑکی کی شاعری میں پختگی اور سحر انگیزی کس کمال درجے کی ہے۔ اس غزل کے چند اشعار پیش خدمت ہیں مشاعرے میں جو غزل پڑھی اس سے ان کی فنی بصیرت اور تجربے کی گہرائی کا اندازہ ہوتا ہے۔

ے بارش ہوئی تو پھولوں کے تن چاک ہو گئے
موسم کے ہاتھ بھیگ کے سفاک ہو گئے

ے بادل کو کیا خبر کی بارش کی چاہ میں

کیسے بلند و بالا شجر خاک ہوگئے

جگنو کو دن کے وقت پر رکھنے کی ضد کریں

بچے ہمارے عہد کے چالاک ہوگئے۔

اس غزل کا آخری شعر تو پاکستان اور ہندوستان میں زیادہ مشہور ہوا۔ دوسرے دن ہندوستان کے تمام اخبارات ورسائل کا موضوع پروین کی شاعری تھی۔ پروین کی شاعری کے تذکرے ہر جگہ تھے بقول مجتبیٰ حسین:

''مشاعرے سے دو دن پہلے ان سے کانسٹی ٹیوشن کلب کی ایک مخصوص بیٹھک میں ملاقائی ہوئی تھی۔ وہ پالم ائر پورٹ سے سیدھے کانسٹی ٹیوشن کلب آئی تھیں جب ہم سے تعارف کرایا گیا تو ہم نے جی ہی جی میں سوچا کہ ایسی دھان پان سی لڑکی کیا شعر کہہ سکے گی۔ جب اس مخصوص بیٹھک میں ان کے کلام سنانے کی باری آئی۔ تو ہم نے فرمائش کی کہ وہ ترنم سے کلام سنائیں۔ اس پر وہ بولیں معاف کیجئے میں ترنم سے محروم ہوں۔ ہمیں اس جملہ پر سخت حیرت ہوئی کیونکہ ہماری اکثر شاعرات ترنم سے کلام نہیں سناتیں۔ بلکہ اپنے کلام سے ترنم سنائی ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ پہلی بار ہم نے ایک خاتون کو تخت اللّفظ میں شعر پڑھتے ہوئے دیکھا اور سنا۔ مشاعرے کے دوسرے دن ہم گھر سے باہر نکلے تو پتہ چلا کہ دہلی میں جدھر جائیں پروین کے چرچے ہیں۔''[1]

---

[1] مجتبیٰ حسین، میں سمندر دیکھتی ہوں تم کنارہ دیکھنا مشمولہ خوشبو کی ہمسفر مرتبہ ڈاکٹر سلطانہ بخش (اسلام آباد، لفظ لوگ پبلی کیشنز، ۲۰۰۲)۴۱۰

ہندوستان میں خوشبو اس طرح مقبول ہوئی کہ ہندی زبان میں بھی خوشبو کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے۔

ے چلی ہے تھام کے بادل کے ہاتھ کو خوشبو
ہوا کے ساتھ سفر کا مقابلہ ٹھہرا خوشبو

۲۰ نومبر ۱۹۷۹ء کو قدرت نے انھیں ماں کے حسین روپ سے نوازا۔ان کے ہاں بیٹے مراد کی ولادت ہوئی۔ جسے وہ پیار سے گیتو کہتی تھیں۔ بہار کے خوشگوار جھونکے کی مانند ان کی زندگی میں وہ ایسے آیا کہ اُداس زندگی میں خوشیوں کے رنگ بکھر گئے اور انھیں جینے کا جواز مل گیا۔ وہ اس کی پرورش میں مصروف ہو گئیں۔ گیتو ماں کی طرح سرخ و سفید خوبصورت بچہ تھا۔ نانا نانی کی محبتوں اور شفقتوں کا واحد مرکز تھا۔

۱۹۸۰ء میں ان کا دوسرا مجموعہ ''صد برگ'' منظر عام پر آیا ، میسرز'' التحریر'' اس کتاب کے پبلشرز تھے ''صد برگ'' کے شعری مطالعے سے یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ ''صد برگ'' کی غزلوں میں پروینؔ شاکر کا تخلیقی شعور زندگی کے تجربات و مشاہدات کا عمدہ نمونہ ہے جو دنیائے ادب کو زندگی کی نئی جہات سے روشناس کروا رہا ہے۔ رسم رونمائی کراچی میں منعقد ہوئی۔اس کتاب کا انتساب پروینؔ نے اپنی والدہ کے نام کیا۔ ''خوشبو'' کے مدھر و مسحور کن جذبات و احساسات والی لڑکی ''صد برگ'' تک پہنچتے پہنچتے زندگی کے تلخ حقائق و تجربات سے آشنا ہو چکی ہوتی ہے۔ ''صد برگ'' ان کی شاعری کا دوسرا جنم ہے۔اگر چہ یہاں بھی عشق و محبت کی خوشبو پھیلی ہوئی ملتی ہے اس لیے یہاں جذباتی رویے کا احساس ہوتا ہے۔لیکن جب زندگی کی کڑی دھوپ اور حالات کی سنگینی کا احساس عیاں ہو جاتا ہے تو خوشبو والا نرم و کومل لہجہ کڑوا اور کسیلا ہو جاتا ہے۔ان کے ساتھ وقت نے اب تک جو سلوک کیا ہے اس کی وجہ سے ان کے لہجہ میں شکایتی انداز غالب رہا ہے ۔

ان کی شاعری میں مزید نکھار پیدا ہوا ہے۔ وہ ذات کے حصار سے نکل کر گرد و پیش کا باریک بینی سے

جائزہ لیتی ہیں۔ جو بات انھیں سب سے زیادہ مضطرب کرتی ہے وہ مارشل لاء کے نتیجے میں ملک کی ابتر صورتحال ہے۔ حساس ذہن ہوتے ہوئے وہ کس طرح ان حقائق سے چشم پوشی کر سکتی تھیں۔ ان کا قلم صدائے احتجاج بلند کرتا ہے۔ اس میں طنز کی آمیزش بھی شامل ہو جاتی ہے۔ عصری مسائل کے ساتھ ساتھ سیاسی شعور بھی اس دور کی نظموں اور غزلوں میں واضح طور پر نظر آتا ہے۔

؎ اک بار جسے چاٹ گئی دھوپ کی خواہش
پھر شاخ پہ اس پھول کو کھلتے نہیں دیکھا

''صد برگ'' کے دیباچے میں طنز کی کاٹ واضح طور میں محسوس کی جا سکتی ہے۔ جو دل و دماغ کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتی ہے۔ نمونے کے طور پر ''صد برگ'' سے اقتباس پیش خدمت ہے۔

''زندگی کے دشت بلا میں جب سچائی اپنے وقت عصر کو پہنچ جائے تو کون و مکان میں صرف ایک پکار باقی رہ جاتی ہے۔۔۔۔۔ ہل من ناصر ینصرنا ۔۔۔۔۔ ہل من ناصر ینصرنا۔

لیکن جس معاشرے میں قدروں کے نمبر منسوخ ہو چکے ہوں اور درہم خودداری دینار عزتِ نفس کوڑیوں کے بھی مول نہ نکلیں وہاں نیکی کی فتح کو کون آئے گا وہاں تو سماعتیں بہری اور بصارتیں اندھی ہو جاتی ہیں سنگینوں میں پروئے ہوئے بچے اور نیزوں پہ سجے ہوئے جواں سر میری نگاہوں کے سامنے سے گزرتے ہے اور میں وقت ہونے والوں کے نام تک نہیں پوچھ سکی۔ کیونکہ ایسا کرنے میں وفاداریاں مشکوک ہو جاتی ہیں۔ مرگِ انبوہ تو یوں بھی جشن کا سماں رکھتی ہے۔ سو تماشا دیکھنے والوں میں میری آنکھیں بھی شامل رہیں۔ بستی میں برف باری ہوئی تو لوگوں نے اپنے ہاتھ تاپنے کے لیے گھر ہی جلا دیئے اور جب تمام بستی شعلوں کی لپیٹ میں آ گئی تو سارے ہاتھ باندھے تھے، مگر کسی کو سورۃ ابراہیم یاد نہ تھی۔

بہار کی دُھوپ جب شہر کا رنگ جلانے لگے تو سورج سے حرارت کے بجائے پناہ مانگی جاتی ہے۔لیکن بارشیں ہوئیں تو کُھلا کہ اپنے شہر کا رنگ ہی کچا تھا۔''[1]

پروینؔ سمجھتی تھیں کہ زندگی آرام طلبی اور عیش پرستی کا نام نہیں ہے۔ بلکہ ان کے نزدیک زندگی ایک طرح کی مہم جوئی ہے۔ان کا خیال تھا کہ کسی بھی مقام یا اپنی منزل کر رُکنا نہیں چاہیے بلکہ اقبالؔ کی فکر کی طرح نئی نئی دنیاؤں کی تلاش نئی منزلوں کی جستجو انسان کا مطمع نظر ہونا چاہیے۔ وہ ایسی زندگی کو ناپسند کرتی تھیں جو بالکل سپاٹ ہو جس میں کوئی تبدیلی ہلچل نہ ہو۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ وہ ساری زندگی ایک استاد کی حیثیت سے گزار دیں۔اس کے برعکس ان کی شوہر ایم۔بی۔بی۔ایس کی ڈگری پر ہی اکتفا کیے ہوئے تھے۔اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے خیالات ونظریات ایک دوسرے سے کافی مختلف تھے۔انھیں پروینؔ کی سیمابی فطرت خوب سے خوب تر کی تلاش میں سرگرداں رکھتی تھی۔ وہ ہمیشہ ایک نئی دنیا کی تلاش اور ہر دن نئے افق کی جستجو میں رہتی تھیں

؎ تتلیوں کی بے چینی آبسی ہے پاؤں میں
ایک پل کو چھاؤں میں، اور پھر ہواؤں میں [2]

یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ۱۹۸۰ء میں پھر یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور لسانیات میں ایم۔اے کی ڈگری اول درجہ میں حاصل کی۔

۱۹۸۱ء میں وہ سی ایس ایس کا امتحان دینا چاہتی تھیں۔تاکہ نسبتاً بہتر مستقبل کا آغاز کر سکیں۔اس

---

[1] پروینؔ شاکر، صد برگ، مشمولہ ماہِ تمام (اسلام آباد، مراد پبلی کیشنز، ۱۹۹۴ (۱۳)

[2] پروینؔ شاکر، خوشبو مشمولہ ماہِ تمام (اسلام آباد، مراد پبلی کیشنز، ۲۰۰۴)۳۳۹

امتحان کے لیے ان کی عمر زیادہ ہو چکی تھی۔ جس کے لیے صدر پاکستان جنرل ضیاء الحق سے خصوصی اجازت نامہ حاصل کرنا پڑا۔ ان کے بلند عزائم راستے کی کٹھنائیوں کو دور کرنے کا حوصلہ رکھتے تھے۔ ان کی محنت وکوشش رنگ لائی۔ سی ایس ایس کے امتحان میں ان کی دوسری پوزیشن تھی۔

۱۹۸۲ء میں پروین نے سروس اکیڈیمی لاہور میں شمولیت کی۔ یہ سی۔ ایس۔ ایس میں کامیاب ہونے والے آفیسرز کے لیے تربیتی پروگرام ہوتا ہے۔ اب مراد صرف نانا نانی کی ذمہ داری تھی۔ لاہور ہمیشہ سے علم وادب کا مرکز رہا ہے۔ یہاں کی خوبصورت پروین کے لیے باعثِ کشش تھی اور کچھ عرصہ کے لیے ہی سہی پروین کو گھر کے پر تناؤ ماحول سے نجات بھی مل گئی۔ اکیڈیمی کے کچھ اور لوگ بھی ادبی ذوق کے حامل تھے۔ چنانچہ یہاں کا ماحول اب کی طبیعت کے موافق تھا۔ یہاں انھوں نے ادبی ذوق رکھنے والوں کا ایک حلقہ بنالیا۔ شعر وشاعری کی محفلیں منعقد کی جاتیں۔ مختلف ادبی ٹھکانوں پر شعر وشاعری کے علاوہ پان اور کافی سے لطف اندوز ہوتے رہتے۔ پروین اپنے بیٹے مراد کو اپنے مائیکے سے بھی اکیڈیمی لے آئیں کیونکہ ان کے شوہر اس بات کو پسند نہیں کرتے تھے کہ مراد اپنے ننہال میں رہے۔ یہاں بھی مراد سب کا پیارا اور سب کی چاہتوں کا مرکز تھا۔ اکیڈیمی میں ایک دفعہ محفلِ مشاعرہ منعقد ہوا جس میں احمد ندیم قاسمی صاحب کو مہمان خصوصی کے طور مدعو کیا گیا۔ لڑکوں اور لڑکیوں نے اس شرارت کے جواب میں ''اکاڈمی کے سورج'' کے عنوان سے لڑکوں طنز ومزاح کے نشتر چلائے۔

پروین شاکر کی کی تیسری کتاب ''خود کلامی'' کے نام سے ۱۹۸۵ء منظر عام پر آئی۔ اس کتاب کا انتساب اپنے بیٹے مراد علی کے نام کیا ہے۔ "خود کلامی "یعنی تنہائی میں اپنے آپ سے باتیں کرنا۔ اپنی ذات میں غوطہ زنی کا اشاریہ ہے۔ خارجی دنیا سے اپنی ذات کی طرف لوٹنا۔

اپنی ذات کے نہاں خانوں میں جھانکنا۔ ازدواجی الجھنیں، نفسیاتی گتھیاں ہیں۔ شریک سفر سے ذہنی ہم

آہنگی کی شکایت بھی خود کلامی میں شامل ہے۔ یہاں پر وہ ایک ماں کے روپ میں بھی جلوہ گر ہیں۔ کئی نظمیں اپنے بیٹے کے لیے بھی لکھی ہیں جو ممتا کے جذبات سے بھرپور ہیں۔

خود کلامی کے حوالے سے پروین شاکر کی شعری تخلیقات بلخصوص غزلیات کی روشنی میں جو تاثر قاری کے دل و دماغ پر ابھر کر سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ پروین نے جن مسائل کو اپنی شاعری میں پیش کیا ہے وہ ان کے خارجی مسائل نہیں تھے بلکہ اپنے اندر جو زندگی جی رہی تھیں اس کی آئینہ داری کی ہے۔

''خود کلامی'' میں خوشبو والی الھڑ دوشیزہ کے بجائے باہمت اور مضبوط اعصاب کی مالک عورت کے روپ میں دکھائی دیتی ہیں۔ 'خوشبو' والی رومانی سوچ تو قرار رہی مگر یہاں ایک حساس اور ذہین انسان کی طرح اپنے آس پاس پھیلی ہوئی ناانصافیاں اور ناہمواریاں انھیں شدید کرب میں مبتلا کرتی ہیں۔ حالات کی ستم ظریفیاں ان کے فکر و خیال کو نئی آب و تاب عطا کرتی ہیں۔ اس کتاب میں اُداسی اور رومان کا ملا جلا رنگ ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے وقت کا سیلِ رواں اپنے تند و تیز تھپیڑوں سے انھیں شکست دینے کی کوشش میں ہے۔ لیکن وہ اس سے بچ کر اپنی منزل کی طرف سفر جاری رکھنے کی سعی میں گامزن ہیں۔ 'صد برگ' میں معاشرتی ناہمواریوں پر طنز موجود ہے یہی طنز کی کاٹ خود کلامی تک پہنچتے ہوئے مزید شدت اختیار کر لیتی ہے۔

کیا جان کے خسارے کی تمنا ہو کہ اب عشق
بڑھتا ہی نہیں درہم و دینار کے آگے [1]

بے فیض رفاقت میں ثمر کس کے لئے تھا
جب دھوپ تھی قسمت تو شجر کس لیے تھا [2]

---

[1] ۔ پروین شاکر، خود کلامی مشمولہ ماہِ تمام (اسلام آباد، مراد پبلی کیشنز، ۲۰۰۴) ۱۱۸

[2] ۔ پروین شاکر، خود کلامی مشمولہ ماہِ تمام (اسلام آباد، مراد پبلی کیشنز، ۲۰۰۴) ۵۵

دل تو چمک سکے گا کیا پھر بھی ترش کے دیکھ لیں
شیشہ گر ان شہر کے ہاتھ کا یہ کمال بھی ۱؎

'خود کلامی' کا سر ورق بھی صادقین نے ہی ڈیزائن کیا تھا۔اس کتاب کی رسم اجرائی آواری ہوٹل لاہور میں منعقد ہوئی ۔امجد الاسلام امجد اور عطاء الحق قاسمی نے اس تقریب میں شرکت کی ۔ پروینؔ نے ایک چائنیز ہوٹل میں رات کے کھانے پر اس تقریب کے شرکا کو مدعو کیا اور سب کو'خود کلامی' کا ایک ایک نسخہ اور اس پر مبنی آڈیو کیسٹ بھی دیا گیا۔

شعر وادب کے میدان میں اپنی کامیابیوں پر وہ بہت خوش اور نازاں تھی ۔ کیونکہ ان کے خواب تعبیروں سے ہمکنار ہو رہے تھے۔انھیں اس سال ڈاکٹر محمد اقبال ایواڈ برائے شاعری بھی ملا۔

۱۹۸۶ءان کے لیے ایک اور خوش نصیبی لے کر آیا۔ پروینؔ کو ادیبوں کے تبادلے کے ایک پروگرام کے تحت امریکہ جانے کے لیے منتخب کیا گیا۔اس بہانے انھیں امریکہ دیکھنے کا موقع ملا۔وہ امریکہ کی سر کردہ ادبی شخصیات سے ملیں وہاں انھوں نے Lvy League یونیورسٹی اور امریکی ادبی وتمدنی مرکز کے دورے کئے۔

جب پروینؔ کے اہل خانہ کو انٹرویو لیا جاتا ہے تو یہ پتہ چلتا ہے کہ دونوں کے بیچ دوریاں پیدا کرنے میں کچھ رشتہ دار عورتوں (خواتین) نے بھی اہم کردار ادا کیا۔
پروینؔ کے والدین انھیں ہمیشہ شاعری سے دور رہنے کا مشورہ دیتے تھے۔انھیں معلوم تھا کہ اس ازدواجی زندگی داو پر لگی ہوئی ہے۔امید کی کوئی کرن کہیں سے بھی دکھائی نہیں دے رہی تھی ۔ پروینؔ نے ان سب باتوں کا یہی حل سوچا کہ کراچی ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا جائے۔اس طرح وہ کئی طرح کی ناپسندیدہ باتوں سے بچ سکتی تھیں۔

۱؎۔ پروینؔ شاکر،خود کلامی مشمولہ ماہِ تمام (اسلام آباد،مراد پبلی کیشنز ،۲۰۰۴)۹

اگر چہ دل کھڑا کر کے انھوں نے یہ فیصلہ لیا تھا لیکن اتنا آسان کام بھی نہیں تھا۔ کراچی جہاں وہ پلی بڑھیں تھیں شعور وجدان کی منزلیں طے کی تھیں۔ زندگی کے تلخ و شیرین ذائقوں کو محسوس کرنا سیکھا تھا۔ کراچی سے وابستہ تمام یادوں کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ کر انھوں نے اپنا تبادلہ سنٹرل بورڈ آف رینوا سلام آباد کروالیا اور ۱۹۸۶ء میں سی۔ بی۔ آر میں سیکنڈ سیکرٹری کی حیثیت سے اپنی سرکاری ذمہ داریاں سنبھال لیں۔ اکتوبر ۱۹۸۴ء ہی میں نصیر نے پروینؔ سے ملاقات کی لیکن پروینؔ کے لیے صلح کی شرائط قابلِ قبول نہیں تھیں۔ چنانچہ وہ مایوس واپس چلے گئے۔ نصیر دوبارہ پروینؔ سے فروری ۱۹۸۷ء میں ملے اور باہمی رضامندی سے ان کی گیارہ سالہ ازدواجی زندگی کا خاتمہ ہوگیا۔

پھر بھی نہ میرا قافلہ لٹنے سے بچ سکا
میں نے خبر تو رکھی تھی ایک ایک گھات کی
میرے گھر کو یہ کس کی نظر لگ گئی اے خدا
کیسی کیسی دعاؤں کے ہوتے ہوئے بد دعا لگ گئی اے خدا

پروینؔ جیسی حساس عورت جو دوسروں کے درد محسوس کر کے تڑپ اٹھتی تھی جنھیں چڑیوں کے گھونسلے کا ٹوٹنا تکلیف دیتا تھا۔ خود اپنے آشیانے کے بکھرنے پر شریک حیات کے بچھڑنے پر کس صدمے سے گزری ہوں گی اس کا اندازہ کوئی دوسرا نہیں کر سکتا۔

میرے بدن کو نمی کھا گئے ہے اشکوں کی
بھری بہار میں کیسا مکان ڈھتا ہے
جب ستارے ہی نہیں مل پائے
لے کے ہم شمس و قمر کیا کرئے
ممکنہ فیصلوں میں اک فیصلہ ہجر کا بھی تھا

ہم نے تو اک بات کی اس نے کمال کر دیا
تمام عمر کی نامعتبر رفاقت سے
کہیں بھلا ہو کہ پل بھر ملیں، یقین تو ملیں
اس ترک رفاقت پہ پریشان تو ہوں لیکن
اب تک کہ تیرے ساتھ پہ حیرت بھی بہت ہے۔

طلاق کی شرائط کے مطابق پروینؔ بیٹے کو اس صورت میں رکھ سکتی تھی جب تک نہ وہ دوسری شادی کریں جبکہ نصیر آزاد تھا اس نے دوبارہ شادی کر لی۔ جس سے ان کے یہاں ایک بیٹی بھی ہے۔ وہ نارتھ ناظم کے علاقے میں رہائش پزیر ہیں۔

؎ شب وہی لیکن ستارہ اور ہے۔
اب سفر کا استعارہ اور ہے۔

پروینؔ کی چوتھی شاعری کی کتاب ''انکار'' ۱۹۹۰ء کے اوائل میں چھپ کر سامنے آئی۔ اس کتاب کا انتساب ان کی مہربان دوست پروین قادر آغا کا نام تھا۔ ان کے حوالے سے اس کے غزلیہ اشعار میں تعلقات کا ایک ایسا برزُخ ہے جہاں انسان ایک ایسی درمیانی حالت میں ہے۔ جہاں محبت اور ترک محبت کی ایک مسلسل کشمکش ہے۔ کتاب کی رسم رونمائی کے مہمانِ خصوصی وفاقی وزیر داخلہ چودھری اعتزاز احسن تھے۔ پروینؔ کی خاص دوست مہتاب راشدی اس تقریب کی میزبان تھیں۔ ممتاز مفتی اور دیگر سرکردہ ادیبوں اور شاعروں نے اس تقریب میں شرکت کی۔ انھیں ۱۹۹۱ء میں صدارتی تمغہ حسنِ کارکردگی سے نوازا گیا۔ جب ان سے اس کتاب کے منفرد نام "انکار" کے بارے میں پوچھا گیا تو انھوں نے اس کا مطلب یہ بتایا کہ ہار ماننے سے انکار کیا جائے۔ حالات کی غلامی نہ کی جائے اور دوسرے کے جا بجا حالات کو بے چون و چرا تسلیم نہ کیا جائے۔ ''انکار''

تک پہنچ کر وہ عمر کی اس منزل تک آ گئیں تھیں کہ جب انسان کے فکر و خیال جزبات و احساسات میں ٹھہراؤ اور پختگی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہی احساس ''انکار'' کی غزلوں اور نظموں میں نمایاں ہے اس میں سچائی اور حقیقت کے رنگ و جذبے کی آمیزش کے ساتھ پیش کئے گئے ہیں۔''انکار'' میں پروین فنی پختگی کی انتہا پر ہیں۔ ان کی شاعری میں اُداسی، تنہائی اور حزن و ملال کی جو کیفیات دکھائی دیتی ہیں وہ ''انکار'' میں شدت اختیار کر لیتی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ملک کے سیاسی و سماجی حالات پر بھی ان کی گہری نظر ہے۔ وہ حاکمانہ دور کے جبر و تشدد کو ایک تازیانے کے طور پر محسوس کرتی ہیں۔ اور اپنے دل کی بھڑاس قلم کے تلوار کے ذریعے نکالتی رہتی ہیں۔''انکار'' میں وہ ایسی شخصیت کے روپ کے سامنے آتی ہیں جس نے دنیا کو خوب دیکھا اور پرکھ لیا ہے کہ یہ دل لگانے کی جگہ نہیں۔ ایک طرح کی اکتاہٹ کا احساس جا گزیں ہے۔ اس کتاب میں ترکِ دنیا کے جذبات کثرت سے ملتے ہیں۔ اس کتاب کو انفرادیت حاصل ہے کہ اس میں ایسی تمام نظمیں شامل ہیں جو مختلف موقعوں پر مختلف اہم شخصیات کے لیے لکھی گئی ہیں اور مختلف معاشرتی رویوں اور موضوعات پر ہیں۔ چند مثالیں اس طرح ہے۔

ایک سہانی صبح کو شہر جلا ہوا ملا
ہوتی رہیں حفاظتیں ظلِ الٰہ کے لیے

چھاؤں بیچ آئے ہیں یوں نفس سے مجبور ہوئے
وہ جو تقسیم ثمر پہ یہاں مامور ہوئے

زرد ہوتا جارہا ہے صحن دل کا ہر شجر
جیسے اندر ہی اندر دکھ کوئی کھانے لگے

ماتم کی فضا ہے شہر دل میں
مجھ میں کوئی شخص مرگیا ہے

''کفِ آئینہ'' پروین شاکر کے انتقال کے بعد چھپنے والی شعری کتاب ہے۔ جسے پروین کی باقیات بھی کہا جاتا ہے۔اس کتاب کا نام انھوں نے خود تجویز کیا۔وہ اپنی حادثی موت سے پہلے اس مجموعے کو ترتیب دے رہی تھیں ۔لیکن انھیں کاتب تقدیر نے مہلت نہ دی ۔اس کتاب کا مواد ان کی مختلف ڈائریوں اور بیاضوں کے ذریعے پروین قادر آغا تک پہنچا اور انھوں نے اسے پروین شاکر ٹرسٹ کے زیر اہتمام شائع کرایا۔اور اس طرح پروین کے تئیں اپنی محبت اور خلوص کا حق ادا کر دیا۔اس کتاب کی ترتیب وتدوین میں مظہرالاسلام ،امجد الاسلام اور ڈاکٹر توصیف تبسم نے بھی تعاون فراہم کیا۔''کفِ آئینہ'' کی شاعری تک پہنچتے ہوئے پروین کی زندگی کا سفر اپنے اختتام تک جا پہنچتا ہے اس لیے کتاب کی شاعری ملے جلے احساسات سے عبارت ہے۔کہیں تو اجتماعی دکھ درد کا کرب سموئے ہوئے ہیں اور کہیں اپنی ذات کی طرف متوجہ نظر آتی ہیں۔عمر رواں کے گریز لمحات غم کی سوغات ان کی جھولی میں ڈال دیتے ہیں۔اس لیے کچھ کھونے کا احساس پایا جاتا ہے۔یاسیت، تھکن اور درد وغم کی لہریں اس دور کے غزلوں اور نظموں میں موجود ہیں۔ایک طرح کی اُداسی اور خلا کا احساس جاگزیں ہے۔زندگی کے تلخ حقائق ، جمہوری قدروں کی پامالی زر پرست معاشرے میں پائی جانے والی منافقت "کف آئینہ " کا موضوع ہے۔کئی غزلیں اور نظمیں ایسی ہیں جو گزشتہ مجموعوں میں چھپ چکی ہیں اس کتاب میں دوبارہ شامل ہوئی ہیں۔ زندگی وتقدیر سے شکوے شکایت کے باوجود اچھے دنوں کی آس بھی ہے۔شاعرہ کو یقین ہے کہ یہ تاریکیاں چھٹ جائیں گی اور درخشاں صبح نمودار ہوگی۔جس سے رجائیت کا احساس بھی ملتا ہے۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ ''کفِ آئینہ'' میں ماضی ، حال اور مستقبل تینوں کا سنگم پایا جاتا ہے۔

رات کو مان لیا دل نے مقدر لیکن
رات کے ہاتھ پہ اب کوئی دیا چاہتا ہے[۱]

[۱] پروین شاکر، کفِ آئینہ مشمولہ ماہِ تمام (اسلام آباد: مراد پبلی کیشنز ۲۰۰۴)۳۹

آستینوں میں چھپائے ہوئے ہر اک خنجر

اور گفتار کی باپت میں سب قند و نبات [۱]

جینے کا حوصلہ نہیں رُکنا محال کر دیا

عشق کے اس سفر نے مجھے نڈھال کر دیا

روز اِک دوست کے مرنے کی خبر آتی ہے

روز اِک قتل پہ جس طرح کہ مامور ہے رات

مجھے تیری محبت نے عجب اِک روشنی بخشی

میں اس دنیا کو اب پہلے سے بہتر دیکھ سکتی ہوں [۲]

پروین شاکر نے شعر و شاعری کے علاوہ کئی کتابوں کے ترجمے بھی کیے ہیں۔ کینیڈا میں رہائش پزیر ایک پاکستانی بیدار بخت صاحب نے پروین کی کتاب ''خود کلامی'' کا ترجمہ انگریزی میں کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ پروین نے بھی اس سلسلے میں ان کی مدد کی اس طرح Taking of oneself کے نام سے ایک کتاب تیار ہوگئی لیکن یہ کتاب ان کی زندگی میں شائع نہ ہوسکی۔

بمبئی میں رہنے والی ایک سولہ سال لڑکی " گیتا انجلی" بہت چھوٹی عمر میں کینسر میں مبتلا رہنے کے بعد مر گئی۔ اس بیماری کے دوران زندگی اور موت کی کشمکش میں گیتا انجلی نے انگریزی میں دو سو نظمیں لکھیں جن کا دنیا بھر کی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ اس بچی نے نظم و نثر کی صورت میں موت کی اپنی طرف بڑھتے ہوئے قدم دیکھ کر اپنے محسوسات کا اظہار کیا ہے۔ بسترِ مرگ پر لکھی ہوئی ان کی تحریروں میں اس قدر درد چھپا ہوا ہے۔ کہ

۱۔ پروین شاکر، کفِ آئینہ مشمولہ ماہِ تمام (اسلام آباد: مراد پبلی کیشنز ۲۰۰۴) ۷۳

۲۔ پروین شاکر، کفِ آئینہ مشمولہ ماہِ تمام (اسلام آباد: مراد پبلی کیشنز ۲۰۰۴) ۵۵

پروینؔ کی حساس طبیعت کو یہ شاعری بہت پسند آئی۔ وہ اس سے بہت متاثر ہوئیں۔ان کا کہنا تھا کہ اتنی کم عمری میں زندگی کی اتنی تڑپ انھوں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی۔موت سے لڑتے ہوئے گیتا انجلی کی شاعری قلب و ذہن کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتی ہے۔نظموں کا ترجمہ پروینؔ شاکر نے کیا ہے۔جبکہ ڈائری کا ترجمہ احمد سلیم نے کیا ہے۔جب یہ کتاب گیتا انجلی البم کے نام سے چھپ کر آئی تو اس وقت وہ خود موت سے ہم آغوش ہو چکی تھیں۔ یہ بھی حیرت کی بات ہے کہ پورے عالمی ادب میں گیتا انجلی کی شاعری ہی کو ترجمے کے لیے منتخب کیا اور انھیں اس کی موت سے متعلق شاعری ہی پسند آئی اور خود بھی اپنی شاعری میں وہ اکثر و بیشتر جگہوں پر موت کا تذکرہ کرتے ہوئے نظر آتی ہیں۔یہ ایک ایسا موضوع ہے جس سے وہ بے حد متاثر تھی۔ان کی شاعری میں اس کا جا بجا اظہار ملتا ہے۔اس کا ذکر آگے کیا جائے گا۔بھرپور جوانی میں زندگی اور اس کے حسن کے عاشق شاعرہ کو رنگ و بو کی دنیا میں رہتے ہوئے موت کے ذائقے کو محسوس کرانے کی خواہش کرنا اسی کھوج میں رہنا کہ زندگی کی سرحدوں کے اختتام کے بعد کی دنیا کے اسرار و رموز کیا ہوں گے۔وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اپنی عمر ڈھلنے کا احساس، دنیا کی بے ثباتی کو شدت سے محسوس کرنا، یہ سب باتیں موت کے حقائق و معنی کی وسعتوں سے آگہی کے متعلق غور و فکر کرنے پر مجبور کرتی ہیں جس کے بعد وہ موت کی اصل حقیقت کا فقدان حاصل کر لیتی ہیں۔ جہاں موت موت نہیں رہتی بلکہ ایک نئی زندگی کا آغاز بن جاتا ہے وہاں زندگی ابدی مسرتوں سے بھرپور ہے وہاں دُکھ کے سائے نہیں وہاں حسن کو زوال نہیں۔اس موضوع سے متعلق یہ اشعار ان کی دلچسپی کے عکاس ہیں۔

موت کا ذائقہ چکھنے کے لیے
دو گھڑی کے لیے ذرا مر کر دیکھوں
کھول دین زنجیرِ در اور حوص کو خالی کر دیں
زندگی کے باغ میں اب سہ پہر ہونے کو ہے

اپنی بیالیس سالہ مختصر سی زندگی میں پانچ شعری مجموعے تخلیق کر کے بین الاقوامی شہرت پانے والی شاعرہ کی پہچان اور وجہ مقبولیت شاعری ہی ٹھری۔لیکن بہت کم جانتے ہیں کہ وہ نثر کے میدان کی بھی شہسوار تھیں ۔انھوں نے کئی ڈرامے،افسانے اور مقالے تحریر کیے ہیں ۔اس کے علاوہ ان کی پانچوں کتابوں کے دیباچوں میں بے مثال نثری نمونے ملتے ہیں ۔ دوسرے لفظوں میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ ان کی تخلیقی صلاحیتیں اپنے اظہار کے راستے خود بخود تلاش کرتی رہتی تھیں ۔طالب علمی کے زمانے ہی سے انھیں حالات حاضرہ کے علاوہ ملکی حالات و واقعات سے گہری دلچسپی تھی ایک حساس ذہن رکھتے ہوئے اپنے آس پاس رونما ہونے والے حالات وواقعات سے گہرا اثر لیتی تھیں ۔چونکہ وہ سیاسی بصیرت رکھتی تھیں اس لیے ان کی اپنی ایک رائے اور اپنا ایک نقطۂ نظر تھا اور وہ چاہتی تھی کہ اپنے قارئین کو بھی اس میں شریک کریں ۔اس مقصد کے لیے " گوشۂ چشم " کے عنوان سے کالم نگاری کا آغاز کیا ۔ یہ کالم ان کے انتقال تک چھپتے رہے ۔ان کالموں کے ذریعے ان کی سیاسی بصیرت و بلند نگاہی اور اہل وطن کے لیے ان کے دردمندانہ جذبات کا اظہار ملتا ہے ۔ ان کی موت کے دوسرے دن کے بعد آخری کالم شائع ہوا جو اتفاقاً اس جملے سے شروع ہوتا ہے ۔

''موت برحق ہے لیکن مشاعرہ پڑھتے ہوئے جان بحق ہونے کا ہمیں کوئی شوق نہیں پھر اگر یہ پتہ ہو کہ گولی ہمارے ہی نام کی ہے تو ادب کے نام پر جامِ شہادت نوش بھی کرلیں ۔ پھر کیا پتہ مشاعرے کے بعد گھر بھی پہنچ پائیں یا نہیں ۔ابھی پچھلے دنوں ایسے ہی مشاعرے سے واپسی پر افتخار عارف اور اظہر عباس ہاشمی دھر لیے گئے ۔ ''

''اتنی رات گئے آپ دونوں کہاں جا رہے ہیں ؟''

'' گھر جا رہے ہیں ۔''

'' یہ گھر جانے کا کون سا وقت ہے ؟''

''شام ہوتی ہے تو گھر جانے کو جی چاہتا ہے۔''افتخار عارف نے اپنے شعر کی مار دینی چاہیں۔اس
ظالم نے نہ کسوٹی دیکھی تھی ۔ نہ ماہِ دونیم پڑھی تھی۔ نہ حرفِ بار یاب
پرایک سو ساٹھ تبصرے پڑھے تھے بالکل پروفیشنل تھا۔ اور جب اچھی طرح سے
اطمینان ہوگیا کہ دونوں دہشت گرد نہیں بلکہ دہشت زدہ ہیں تو جان بخشی کی
اس قسم کی ضیافت نیم شب کے متحمل ہم تو نہیں ہو سکتے'' [۱]

پروینؔ شاکر کے کالموں میں شادابی اور قدرتِ اظہار کا سلیقہ پایا جاتا ہے۔اس کے ساتھ معاشرتی شعور بھی ہے۔ان کی نثر میں دردمندی اور مزاح کا عنصر بھی موجود ہے جو غالبؔ کی نثر سے ملتا جلتا ہے۔ان کالموں کے عنوانات زیادہ تر فارسی کے برمحل اشعار و محاورات کی صورت میں منتخب کیے گئے ہیں۔جو کالم کے اندر مواد موجود سے پوری طرح میل کھاتے ہیں اور قاری کو معنی و مفاہیم تک رسائی حاصل کرنے میں مدد فراہم کرتے ہیں۔مثلاً تیمّم آمد،آب برخاست،اے بسا آرزو کہ خاک شدہ، تاثریا می رود دیوارِ کج ''برق سے کرتے ہیں روشن شمع ماتم خانہ ہم''

ان کالموں سے ان کی طبیعت کی شوخی شادابی اور خوش طبعہ عیاں ہوتی ہے۔عام زندگی میں اس قدر سنجیدہ کم گو نظر آنے والی پروینؔ اپنے کالموں میں کافی شوخ و چنچل نظر آتی ہیں۔ان کالموں میں انھوں نے بہت دھیمے لیکن مزاحیہ انداز میں اربابِ اقتدار، اراکین پارلیمنٹ، ملکی و غیر ملکی پالیسیوں پر طنز کے نشتر چلائے ہیں۔بیروکریٹ افسروں، امیروں، وزیروں کی غلطیوں، مفاد پرستوں کو تاہ نظریوں پر ایسے جم کر وار کرتے ہیں۔کہ ان کی جملہ بازی کی داد دینی پڑتی ہے۔اس سلسلے میں عطاءالحق قاسمی لکھتے ہیں :

۱۔ پروینؔ شاکر، گوشہ چشم (اسلام آباد، لفظ لوگ پبلی کیشنز،۲۰۰۰)۱۱۶

’’ میں نے اور امجد نے اُسے جملہ بازی کی "ودمین ونگ " کا انچارج قرار دے رکھا تھا۔ میں نے اس کے سامنے اپنی رائے کا اظہار کیا اور کہا کہ چونکہ تم ایک انتظامی عہدے پر فائز ہو لہٰذا وزیروں، مشیروں اور بیوروکریسی کو چٹکیاں لینا تمھیں ویسے بھی مہنگا پڑے گا لہٰذا میرا مشورہ ہے کہ کالم نگاری کے شوق سے تائب ہو جاؤ۔ میری اس تقریر کے جواب میں اس نے کہا عطا بھائی‘ آپ مجھے یہ بتائیں کہ میں کالم کیسا لکھ رہی ہوں‘ ۔ میں نے جواب دیا۔؛ زبردست اس پر پروینؔ نے ہنستے ہوئے کہا اب تو اس شوق سے تائب ہونے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ‘۔ چونکہ کالم نگاری کے حوالے سے آپ کی تعریف میرے لیے سند کا درجہ رکھتی ہے۔‘‘[1]

اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ وہ کافی نڈر اور بہادر تھیں۔ اگرچہ اعلیٰ سرکاری عہدے پر فائز تھیں لیکن حق بات ڈنکے کی چوٹ پر کہنے کی عادی تھیں۔ اس معاملے میں کسی سے مرعوب نہیں ہوتی تھیں۔

یہاں پروینؔ شاکر کے ایک کالم کا کچھ حصّہ نمونے کے طور پر دیا جاتا ہے۔ جس کا عنوان ہے ’’مقطع میں آ پڑی ہے، سخن گسترانہ بات‘‘۔ اس کالم میں پاکستان میں این جی اوز کی بہتیات اور ان کی ناقص کارکردگی این جی اوز کے سربراہوں کے مفاد پرستی اقرباء پروینؔ پر طنز ان الفاظ میں کرتی ہیں:

’’ لگتا ہے ڈاکٹر شیر افگن نیازی کو اپنی وزارت سے کوئی زیادہ دلچسپی نہیں رہی۔ این۔ جی۔ اوز کو نکیل ڈالنا چاہتے ہیں۔ نیازی صاحب شیر افگنی ہی کرتے تو ٹھیک تھا۔ وہ تو شیر کے من سے نوالہ چھیننے جا رہے ہیں۔ اور ایک اودھ شیر ہو تو شاید نمٹ بھی لیں۔ دس ہزار تو رجسٹرڈ ہیں۔ غیر رجسٹرڈ کی تو داد تو شاید آئی۔ ایس۔ آئی کو بھی نہیں معلوم ہوگی۔ اس لیے عوام کی محبت سے نڈھال، فائیو سٹار ہوٹلوں میں سیمینار

---

[1] عطاء الحق، خوشبو کا سفر مشمولہ خوشبو کی ہمسفر (اسلام آباد، لفظ لوگ پبلی کیشنز، ۲۰۰۲) ۴۳۹

منعقد کراتی ہوئی اسی بالکل نئی کلاس کی تنخواہ براہ راست فارن ایکسچینج میں غیر ملکی فنڈ سے آتی ہے۔ اس جیٹ سیٹ کراوڈ سے ڈاکٹر صاحب کے بنیادی طور پر تین مطالبات ہیں ۔خود کو رجسٹر کرائیں اپنی کارکردگی کی رپورٹ پیش کریں۔اپنا حساب دکھائیں ۔ہم این جی اوز کے اس خیال سے بالکل متفق ہیں کہ مطالبات کی آخری شک سب سے زیادہ نامعقول ہے ۔جھگڑا ابھی سارا اسی کا ہے اسلام آباد ہی کے ایف سیون میں ایک ہی گھر میں سماعت ، بصارت گویائی اور ذہنی کمزوری سے متعلق چار این جی اوز بیک وقت کام کر رہی ہیں۔فہرست کے مطابق اس شہر خوبی میں انجمن پھل فروشاں اور انجمن کباڑیاں انجمن ڈیرہ گازی خاں بھی ہے ہمیں سمجھ نہیں آتا این جی اوز اور دارالحکومت میں کیا کر رہی ہیں ۔ یہ عجیب ڈونرز ہیں کہ انھیں اپنے پیسے کے ضیاع کی مطلق فکر نہیں ۔شمالی علاقہ جات میں پھلوں اور سبزیوں کو محفوظ کرنے اوران کے جام بنانے کی ایک پروجیکٹ پر دو لاکھ ڈالر خرچ کیے گئے ۔تین برس میں جا کر جام کی بیس بوتلیں تیار ہوئیں اور پھر سارے گاؤں میں بطور تبرک بانٹ دی گئیں۔

ہماری ہونہار صحافی سمیرا اسلم کو اعتراض ہے۔کہ اتنا سا جام بنانے میں تین سال کیوں لگے۔معلوم ہوتا ہے کہ سمیرا بی کو امورِ خانہ داری سے کوئی دلچسپی نہیں ۔ایک سال تو سیب کا چھلکا اتارنے میں لگ گئے ۔دوسرے سال اُسے اُبالا کیا تیسرے سال شیرہ ڈالا گیا۔غالبًا سال کے اختتام پر لیمن کا رس ڈالا گیا۔ ہمارے حساب سے تو یہ سال بھر پہلے بن گے۔ یہ پورا عرصہ لیمن کا رس نکالنے میں بھی تو صرف ہوسکتا ہیں ۔ساری دنیا میں ہاتھ کا کام اتنی دیر سے ہوتا ہے۔[۱]

ان کالموں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے۔کہ ان کی زبان شستہ ہے۔اس میں پختگی ہے انداز بے

۱۔ پروین شاکر، ''گوشہ چشم'' (اسلام آباد، لفظ لوگ پبلی کیشنز،۲۰۰۰)۹۷۔۱۰۲

باکانہ ہے ان میں روانی ہے۔

''گوشہ چشم''، پچیس کالموں پر مشتمل ہے۔ جو طنز و ظرافت سے بھرپور ہے۔ ایک قاری پر پروین کے عہد کے سیاسی سماجی اور ثقافتی پس منظر کو واضح کرتے ہیں۔ ان کی ایک مداح رفعت حیدر نے بہت عرق ریزی سے جمع کیے ہیں۔ یہ کالم زبان، اسلوب، معیار اور مواد کے لحاظ سے اعلیٰ نثری نمونوں میں شمار ہوتے ہیں۔ خاص و عام میں مقبولیت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ ان کی موت کے بعد اس کتاب پر ایوارڈ بھی دیا جا چکا ہے۔

پروین شاکر کی زندگی کے حالات و واقعات جاننے کے بعد ان کی شخصیت کے چند چیدہ چیدہ پہلو نمایاں ہوتے ہیں۔ کہ وہ کافی کم سنجیدہ اور لیے دیے رہنے والی شخصیت تھیں۔ لیکن بعض حالات اور ان کی تحریروں کے تناظر میں ان کی شخصیت کا بغور مشاہدہ کیا جائے تو یہ بات واضح ہوتی ہے۔ کہ ان کی طبیعت وسادگی کے ساتھ ساتھ شوخی و شرارت بھی بہت زیادہ تھی جو تقدیر کی ستم ظریفیوں کی وجہ سے کہیں پس منظر میں چلی گئی تھی۔ سنجیدگی و اُداسی کے اس قول سے کبھی کبھار وہ باہر نکلتی تھیں تو پہلے جیسی شوخ اور معصوم پارہ بن جاتی تھیں۔

ان کے متعلق عام طور پر یہ تاثر بھی ہے کہ وہ مغرور تھیں۔ ہوسکتا ہے کہ ان کی کم گوئی کی وجہ سے ایسا محسوس ہوتا ہو۔ کیونکہ ان کی شخصیت میں متانت ٹھہراؤ اور خود اعتمادی تھی۔ جو لوگ ان کے قریب رہ چکے ہیں وہ ان کی محبت و خلوص اور ان کی عاجزی و انکساری کو بہت سراہتے رہتے ہیں۔ بہت بڑے عہدے پر فائز تھیں۔ دفتری معاملات میں سخت گیر سہی لیکن دوستوں کے درمیان خلوص و وفا کر پیکر اور نرم خو تھیں۔ اپنے سے بڑے اور اپنے معاصر شعرا کا بہت احترام کرتی تھیں۔ اس قدر مشہور شخصیت ہونے کے باوجود ان کے طبیعت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ عطاء الحق قاسمی صاحب کو اپنی قمیض استری کرتے دیکھا تو فوراً ہی قمیض جھپٹ لی اور کہا کہ عطاء بھائی بہن کی موجودگی میں بھائی یہ کام کرتے اچھے نہیں لگتے ہیں۔

پروینؔ شاکر کے خطوط بھی ان کی شخصیت کے بہت سے پہلوؤں کی نقاب کشائی کرتے ہیں ۔ کیونکہ خطوط فرد کی زندگی کا آئینہ ہوتے ہیں ۔ کسی شخصیت کی ذاتی زندگی ذہنی کیفیات ورجحانات اور اس عہدے کے سماجی حالات کو جاننے کا اہم وسیلہ ہیں ۔ انھوں نے امجد اسلام امجد ،نظیر صدیقی اور سب سے زیادہ خطوط احمد ندیم قاسمی کو لکھے ہیں ۔ قاسمی صاحب ان کے لیے باپ کی حیثیت رکھتے تھے ان کی ہر معاملے میں رہنمائی کرتے تھے ۔امجد اسلام امجد نے پروینؔ کو اپنی بہن بنایا ہوا تھا۔ غالبؔ کے خطوط کی طرح باوجود زندگی کی تلخیوں اور سخت کوششوں کے باوجود خطوط میں ظرافت وشادابی کا احساس ہوتا ہے۔ اگرچہ خطوط بہت اختصار کے ساتھ لکھے گئے ہیں ۔کچھ مثالیں ملاحظہ کیجیے۔ امجد اسلام امجد کو لکھتی ہیں :

''کوثر کی امانتیں میرے پاس رکھی ہیں ۔ ان کی بار ان کی ادائیگی سخت ضرورت ہے۔
آپ کے سر پر بال پہلے ہی بہت کم رہ گئے ہیں ۔''[۱]

ایک اور خط جس میں پروینؔ کی خوش مزاجی اور شگفتگی کا اظہار ہوتا ہے۔

''اور کچھ نہیں چاہتی اس کے کہ آپ لکھتے اور پڑھتے رہیں اور ہمیں مزے مزے کے ڈرامے دیکھنے اور چننے کو ملتے رہیں ''[۲]

وہ بہت دردمند دل رکھتی تھیں ۔ دوسروں کے دکھ ودرد کو شدت سے محسوس کرتیں اور بغیر کسی تصنع و بناوٹ کے دوسروں کی دلداری کرتیں ۔ احمد ندیم قاسمی کی اہلیہ کی وفات پر اپنے عمو کے غم کا احساس کر کے اپنی دلی جزبات کا اظہار اس طرح کرتی ہیں ۔

---

[۱] عالیہ جلیل مکتوب نگاری بشمولہ خوشبو پھول تحریر کرتی ہے۔ مرتبہ: ڈاکٹر سلطانہ بخش (اسلام آباد، لفظ لوگ پبلی کیشنز، ۲۰۰۰) ۲۳۴

[۲] عالیہ جلیل مکتوب نگاری بشمولہ خوشبو پھول تحریر کرتی ہے۔ مرتبہ: ڈاکٹر سلطانہ بخش (اسلام آباد، لفظ لوگ پبلی کیشنز، ۲۰۰۰) ۲۳۵

''یہ جان کر انتہائی دُکھ ہوا کہ آنٹی اب ہم میں نہیں رہیں۔آپ کا اور ان کا طویل ساتھ تھا۔**اب آپ** بالکل تنہا ہوں گے خدا آپ کو صبر دے۔آپ کے ساتھ نعمان اور دلہن ہوں گے۔بچوں سے ذرا تقویت رہے گی۔بحر حال آپ کی تنہائی ہے۔کاش میں اس وقت پاکستان میں ہوتی تو وہ آپ کی کچھ ڈھارس بندھا سکتی''۔[۱]

آس پاس کسی عزیز یا واقف کار کی موت ہو جاتی تو حد سے زیادہ اس کا اثر لیتی تھی۔وہ افسردہ ہو جاتی تھیں۔نظیر صدیقی کے نام ایک خط میں اپنی خالہ کی بیماری اور اپنے دوست ٹوٹو کی موت کا اس طرح اظہار کرتی ہیں۔

''میری پیاری خالہ جنھوں نے مجھے ماں کی طرح پالا تھا۔کینسر کے مرض میں مبتلا ہو کر میری آنکھوں کے سامنے دم توڑ رہی ہیں۔ٹوٹو میرا آٹھ برس کا دوست گلے کے زخم میں مبتلا ہو کر چل بسا اور شاید انہی سب باتوں کی یلغار نے مجھ پر ایسا اثر کیا اچانک آپنیڈکس کا درد تھا لیکن فوراً ہی آپریشن ہو گیا''۔[۱]

خدا نے انہیں سب کچھ عطا کیا تھا۔لیکن اس کے باوجود ایک ادھورے پن کا احساس ایک کرب واُداسی اور بے سکونی کی کیفیت بھی ان کی شخصیت میں شامل تھی۔جو ان کی ازدواجی زندگی میں ناکامی کا پیش خیمہ تھی۔انھوں نے اپنے ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ وہ اپنے ذہن کی بدولت سکون اور چین سے محروم رہی۔شاید جینیس (jenius) لوگوں کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہو۔ان کے کزن ان سے ملنے ان کے گھر اسلام آباد گئے۔گھر اور ڈرائنگ روم کی تزئین وآرائش دیکھ کر پوچھا کہ پروین تم خوش تو ہو؟ ان کا جواب تھا کہ ظاہری طور پر جو کچھ نظر آتا ہے وہ سب سچ نہیں ہوتا۔وہ اپنے اندرونی دکھ کو ظاہری زیب وزینت اور مسکراہٹ کے پردے میں چھپاتی رہیں۔لیکن اپنی زندگی کے اس المیے کو کبھی بھی اپنی معاشرتی یا پیشہ ورانہ زندگی پر اثر انداز نہیں ہونے دیا۔

---

[۱]۔جاوید وارثی، پروین شاکر کے خطوط نظیر صدیقی کے نام (کراچی، نشاطِ ادب، مشہور پریس، ۱۹۹۶)۱۸

پروین شاکر کی قریبی سہیلی رفاقت بھی شعروشاعری سے دلچسپی رکھتی تھیں۔مگر انھیں افسوس تھا کہ شادی کے بعد انھیں اپنے اس شوق سے دستبردار ہونا پڑا۔لیکن پروین ہمیشہ رفاقت کو یہ سمجھاتی رہتی تھیں کہ تم گھریلو خاتون بن کر ایک مکمل زندگی گزار رہی ہو۔اس لیے تم مجھ سے بہتر ہو۔جبکہ وہ خود سب کچھ ہو کر بھی ایک ادھورے پن کے ساتھ تنہا زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔

پروین شاکر اکثر و بیشتر کامرہ رفاقت کے پاس چھٹیاں گزارنے چلی جاتیں۔کامرہ پاکستان میں ایک صحت افزا مقام ہے۔پروین اپنی عیدیں بھی وہیں گزارتیں اور رفاقت کی محبت کا یہ عالم تھا کہ وہ ہمیشہ عید کا جوڑا ان کے لیے تیار رکھتیں۔پروین رفاقت کو ڈانٹتیں کہ سہاگنیں عید کے کپڑے پہنے ہوئے اچھی لگتی ہیں جو وہ نہیں ہے۔

یہ سب باتیں ان کے وجود میں موجود خلا ویرانی کو ظاہر کرتی ہیں کہ وہ اپنی موجودہ زندگی سے اور ماضی میں اپنے کیے ہوئے فیصلے سے مطمئن نہیں تھیں۔وہ اپنے بیٹے مراد کو بہت چاہتی تھیں اس کے مستقبل کے بارے میں بہت زیادہ فکر مند تھیں۔وہ اُسے نیورو سرجن بنانا چاہتی تھی۔وہ ازراہ مذاق اپنے بیٹے سے کہتی تھیں کہ اس کا ایک مریض تو اس کے گھر میں موجود ہے۔اپنے بیٹے کی پسند و ناپسند کا خیال رکھتیں اس کے لیے خود کھانے بناتیں۔جب مراد چودہ برس کا ہوا تو سید مراد علی کے نام کی تختی ان کے گھر پر جگمگانے لگی۔وہ بہت زیادہ پُر اعتماد دکھائی دیتی تھی۔ان کے مطابق جب ایک لڑکا جوان ہوتا ہے۔تو اس کی ماں مضبوط تر ہو جاتی ہے۔ وہ اپنے بیٹے کو ایک رات کے لیے بھی تنہا نہیں چھوڑتی۔نسوانی احساسات کو جس جذبے کی سچائی کے ساتھ پیش کیا وہ صرف انہی کے لئے مخصوص ہو کر رہ گیا۔

وفات

پروین شاکر ۲۶ دسمبر ۱۹۹۴ء کو ایک کار حادثے میں جاں بحق ہوگئی وہ صبح اپنی کار پر دفتر کے لیے روانہ ہوئی۔ کار ڈرائیور چلا رہا تھا کہ سامنے سے بس نے ٹکر ماری دی۔ ڈرائیور نے تو اسی لمحہ دم توڑ دیا۔ پروین شاکر کا سر پھٹ گیا اور دماغ باہر نکل آیا۔ انہیں ہسپتال لے جایا گیا۔ دن کے ڈیڑھ بجے وہ انتقال کر گئی۔ مرنے سے پہلے فنون شمارہ ۲۳۔۲۴ میں اس کی غزلیں شائع ہوئی تھیں جن میں ایک شعر تھا۔

تیرے پیمانے میں گردش نہیں باقی ساقی
اور تیری بزم سے اب کوئی اٹھا چاہتا ہے

پروین کی ناگہانی موت پر ہندو پاک کے بے شمار ادباء و شعراء نے اظہار افسوس کرتے ہوئے تعزیتی خطوط لکھ کر ان کی قدر و منزلت کا اعتراف کیا۔ ہم یہاں کتابچہ خوشبو کی شاعرہ پروین شاکر کے حوالے سے کچھ ایسی شخصیتوں کے خطوط نقل کر رہے ہیں جن کی شعر و ادب اور فلم میں نہایت اہمیت ہے۔

سلیم اعتراز احسن

میں پروین شاکر کا ایک پجاری ہوں یہ بہت بڑا المیہ ہے کہ پروین شاکر جیسی خوبصورت اور خوب سیرت شاعرہ ہم سے بچھڑ گئی ہیں انہوں نے کہا میں نے پروین شاکر کی تمام شاعری پڑھی ہے وہ بہت منفرد شاعرہ تھیں۔ ان کی شاعری کی مثال ہمارے ادب میں نہیں مل سکتی۔ پروین شاکر کو شاید اپنے چلے جانے کا علم تھا۔ کیونکہ جب اس نے اپنی آخری کتاب "ماہ تمام" مجھے دی تو میں نے اس سے پوچھا کہ تم نے ابھی سے منتخب کلام کیوں شائع کر دیا۔ ابھی تمہاری بہت عمر باقی ہے تو پروین شاکر خاموش ہوگئی اور تھوڑی دیر بعد کچھ سوچتے ہوئے بولی کہ زندگی کا کس کو یقین ہے اور کون جانتا ہے کہ اس نے کتنے سانس اور جینا ہے۔ اعتراز حسن نے کہا کہ

زندگی کو برتنے کا سلیقہ جانتی تھی۔ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور دنیا کے بہترین تعلیمی ادارے ہارورڈ یونیورسٹی کی تعلیم یافتہ تھی اور وہاں ایک عرصے تک برصغیر کی شاعری پر لیکچر بھی دیتی رہی لیکن وہ ایک مکمل ترین عورت تھی اور اس کی وفات سے جو خلا پیدا ہو گیا میں سمجھتا ہوں وہ بمشکل بھرے گا۔

جناب احمد ندیم قاسمی

احمد ندیم قاسمی کو مسقط میں اس جان لیوا حادثے کی خبر ملی انہوں نے ٹیلیفون پر سسکے ہوئے کہا کہ میری سب سے پیاری بیٹی آج مجھے چھوڑ کر چلی گئی۔ قاسمی صاحب نے دکھ سے بوجھل لہجے میں کہا کہ پروین مجھ سے پیار کرتی تھی اور مجھے اپنا باپ کہا کرتی تھی۔ لیکن وہ مجھے دھوکا دے گئی اور خاموشی کے ساتھ چلی گئی۔ انہوں نے کہا کہ نا صرف وہ قلم قبیلے کی آبرو تھی بلکہ اردو شاعری کا حسن بھی۔ انہوں نے کہا کہ میں بہت بدقسمت ہوں آخری وقت میں اپنی بیٹی کا چہرہ بھی دیکھنا نصیب نہ ہوسکھا۔۔

جناب احمد فراز

احمد فراز نے پروین شاکر کی المناک موت پر اظہار تعزیت کرتے ہوئے کہا کہ اردو شاعری میں بہت بڑا خلا پیدا ہوگیا ہے انہوں نے کہا کہ پروین شاکر اپنے دور کی بڑی انسان تھیں۔ انہوں نے خوشبو کے سفر سے اپنا آغاز کیا اور ماہ تمام پہ یہ روشن آفتاب ڈوب گیا۔ احمد فراز نے رنجیدہ لہجے میں کہا کہ مجھے یقین نہیں آرہا کہ نرم لفظوں میں گفتگو کرنے والی اور عزت واحترام کی علامت پروین آج ہمیں چھوڑ گئی ہیں۔ انہوں نے کہا کہ پروین شاکر کی شاعری اردو شاعری میں ایک نئی روایت تھی۔ اس نے عورت کے خالص ترین جذبات کو اپنی شاعری میں اس طرح سمویا کہ شاعری ایک انوکھا روپ اختیار کرگئی ۔ انہوں نے کہا کہ میں اس کی خوبی کی تعریف کروں۔ وہ جامع صفات تھی۔ ان کا لہجہ، ان کی شاعری، ان کا رکھ رکھاؤ اور ان کی ذہانت سب کچھ منفرد تھا۔ وہ ایک بہت بڑی عورت تھی اور بڑے لوگوں کی طرح اسے کوئی ختم نہیں کرسکتا۔

انور مسعود

چندروز پہلے میری ملاقات پروینؔ سے ہوئی،۔وہ بہت اُداس تھی۔میں نے اُداسی کی وجہ پوچھی تو مفہوم مسکراہٹ کے ساتھ بولی آج کل میں زندگی کے بارے میں سوچ رہی ہوں ۔اس لئے دل خود بخود اُداس ہو جاتا ہے۔اور میں اس کا مطلب کیا تھا۔انور مسعود نے کہا کہ پروینؔ کو مردہ نہ کہیں وہ زندہ ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گی وہ پاکستان کی واحد شاعرہ تھی جس کی مثال دی جاسکتی ہے آج اس سانحے پر پاکستان کے قلم قبیلے پر کڑا وقت آن پڑا ہے۔

کشور ناہید

کشور ناہید نے روتے ہوئے کہا کہ آج میری بہن مجھ سے بچھڑ گئی ہے۔انہوں نے کہا کہ جس طرح پروینؔ شاکر گئی، جانے والی اس طرح تو نہیں جاتے۔انہوں نے مزید کہا کہ یہ مہینے ہم پر بہت بھاری گئے ہیں ۔پہلے ظہیر کاشمیری پھر احمد داؤد اور اب پروینؔ شاکر ہمیں چھوڑ کر چلی گئیں۔پروینؔ میری بہت اچھی دوست تھی۔وہ میرے سامنے غزلیں لکھتی اور ان پر بحث کرتی۔مجھے یقین نہیں آرہا کہ میرے سامنے یہ جو زخمی جسم پڑا ہے۔پروینؔ شاکر کا ہے۔

ایاز ظہیر کاشمیری

پروینؔ شاکر سے جدید اردو ادب کا سارا گلستان مہک رہا ہے۔وہ ان چند شاعروں میں سے جن کو اس دور کی شعری دریافت کہنا چاہیے ۔پروینؔ نے اردو شاعری کے قارئین کے دل و دماغ کو جزبے کی جس سچائی سے متاثر کیا اس کی مثال مشکل سے ملتی ہے۔اس شخصیت کی ناگہانی موت پاکستان اردو ادب اور سچ سے محبت کرنے والوں کے لئے نا قابلِ تلافی نقصان ہے۔اللہ تعالیٰ اسے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ

پروینؔ شاکر کے دستخط کے بغیر جدید شاعری کا منظر نامہ نامکمل ہے۔

رفاقت گورایا

پروینؔ شاکر کی موت جدید اردو ادب کے لئے بہت بڑا نقصان ہے۔

عین تمبولوی

نوجوان شاعر عین تمبولوی نے کہا کہ پروینؔ شاکر کی شاعری ہم نوجوانوں کے لئے مشعلِ راہ ہے۔ان جیسی بڑی شاعرہ اردو ادب میں پیدا ہونا ناممکن ہے۔

محسن احسان

پروینؔ شاکر کو پڑھ کر مجھے ہمیشہ تازہ ہوا میں سانس لینے کا احساس ہونے لگتا ہے انھوں نے اردو شاعری کو نئے اسلوب اور خوبصورت جزبے سے روشناس کرایا ہے۔

ضمیر جعفری

وہ میری بیٹوں جیسی تھی ۔مجھ سے جب بھی ملتی اتنی محبت اور احترام سے پیش آتی کہ میرا سیروں خون بڑھ جاتا تھا۔میں نے جو رکھ رکھاؤ اور تہذیب پروینؔ کے ہاں دیکھی ہے وہ مجھے کہیں نظر نہیں آتی۔میں یہ کہوں گا کہ میری پیاری بیٹی آج ہمیشہ کے لئے مجھ سے روٹھ گئی۔ہے۔

شبنم شکیل

شبنم شکیل جو میت کے پاس دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھیں انہوں نے بین کرتے ہوئے کہا کہ پروینؔ شاکر بہت خوبصورت تھی اسے نظر لگ گئی۔انھوں نے ہر مرحلے کو شکست دی تھی لیکن موت سے شکست کھا گئی۔ وہ تو خاموشی کے ساتھ گزر گئی مگر ہمیں چھوڑ کر چلی گئی۔

راشد شاہین

پروین شاکرؔ صاف گو شاعرہ تھی۔ ان کی شاعری فہمیدہ ریاض کے بعد اردو ادب کی بہترین شاعری میں شمار ہوتی ہے۔ وہ نوجوان نسل کی مقبول شاعرہ تھیں۔ ان کی وفات سے اردو ادب ایک بے مثال شاعرہ سے محروم ہو گیا۔

ملکہ ترنم نور جہاں

پروینؔ شاکر کی شاعری میں وہ ردھم ہے جو بڑے بڑے شاعروں کی شاعری میں ہوتا تھا۔ ان کی موت سے ہم ایک بہت بڑی شاعرہ سے محروم ہو گئے۔

اداکار محمد علی

پروینؔ شاکر کی موت اُردو ادب کے لئے بہت بڑا سانحہ ہے ۔

اداکار ندیم

دنیا کی بڑی شاعرہ اور ایک اچھی قابل عورت سے محروم ہو گئی۔

اداکار بابر علی

مجھے ان کی ناگہانی موت کا سن کر بہت افسوس ہوا۔ اُردو ادب ایک بہت بڑی شاعرہ سے محروم ہو گیا۔

اداکار نوید احمد

نوجوان اداکار نوید احمد نے بڑے دکھ سے کہا کہ پروینؔ شاکر کی موت سے اردو ادب کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے نوجوان نسل میں انکی شاعری کریز بن چکی تھی۔ ن کی شاعری سے میں خود بہت متاثر تھا۔

جان ریمبو افضل

پروین شاکر کی موت ایک عہد کی موت ہے۔

سعود

ان کی موت سے اُردو ادب کو نا قابل تلافی نقصان پہنچا ہے۔ بلاشبہ وہ اُردو ادب کا قیمتی سرمایہ تھیں اس کے علاوہ ریما ، نیلی ، بابرہ شریف ، صاحبہ ، نیلو ، نرگس ، اداکار شان جاوید شیخ ، سلیم شیخ نے پروین کی صفات پہ گہرے دُکھ اور غم کا اظہار کیا اور ان کی موت کو نا قابل تلافی نقصان کیا۔

پروین شاکر کی موت کے بعد اسی رات بی بی سی نے پروین شاکر کی اپنی آواز میں ان کا کلام کاسٹ کیا۔ بی بی سی نے ان کی مکلم حیات اور شاعری پر تبصرہ پیش کرتے ہوئے ان کو اُردو کی سب سے بڑی شاعرہ قرار دیا اور ان کے منفرد و اسلوب پر انہیں اُردو ادب مہارانی قرار دیا۔ ان کی شاعری ہر وقت خوشبو بکھیرتی رہے گی۔

باب دوم

پروین شاکر کی نظم نگاری

(الف) اردو نظم نگاری کا منظر نامہ

(ب) پروین شاکر کی نظمیہ شاعری

اردو نظم نگاری کا منظر نامہ

اردو نظم کی روایت ایک مستقل اور تفصیل طلب موضوع ہے۔اس موضوع پر پروفیسر حامدیؔ کشمیری، وزیر آغا، سلیم احمد اور وہاب اشرفی سے لے کر کوثر مظہری تک نے بہت کچھ لکھا ہے لیکن میرا مقالہ پروینؔ شاکر (شخصیت اور شاعری) ہے۔ پروینؔ شاکر نے غزلوں کے علاوہ نظمیں بھی لکھی ہیں ۔اس لیے پروینؔ شاکر کی نظم نگاری کے امتیازات کا اُن کے عہد تک کی اُردو نظم نگاری کے خصوصیات سے رشتہ قائم کرنے کی غرض سے میں نے اپنے مقالے کے اِس باب میں اُردو نظم نگاری کی روایت کو اختصار کے ساتھ جائزہ پیش کیا ہے۔ تا کہ یہ اندازہ ہو سکے پروینؔ شاکر کی نظم نگاری ماقبل کی نظم نگاری سے کس حد تک مشابہت کا رشتہ رکھتی ہے اور انھوں نے کہاں کہاں زبان، موضوع اور نظریات کے حوالے سے جدوجہد سے کام لیا ہے۔

یہ بات تو سب جانتے ہیں کہ ادب کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ایک کو نثر کہتے ہیں اور دوسری کو نظم یا شاعری۔

جس تحریر میں ردیف، قافیہ اور وزن ہوتا ہے اُس تحریر کو نظم یا شاعری کہتے ہیں لیکن جس کلام میں ردیف، قافیہ، بحر اور وزن نہیں ہوتا اُسے نثر کہتے ہیں اِس لیے نظم و نثر کا فرق واضح کرنے کے لیے کہا جاتا ہے ۔کہ'' جو کلام موزوں وہ شعر ہے اور کلام غیر موزوں نثر ہے۔'' مطالعہ کی آسانی کے لیے شاعری کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ایک کو نظم کہتے ہیں اور دوسری کو غزل۔نظم اور غزل دونوں اردو شاعری کے ستون مانے جاتے ہیں اور دونوں ہی ہمہ گیر مقبولیت کے حامل ہیں اردو شاعری کا بہت بڑا سرمایہ نظم پر مشتمل ہے نظم نے ابتداء سے عہد بہ عہد کے سماجی ادبی اور ثقافتی تقاضوں کا ملحوظِ خاطر رکھ کر اپنی ہیئت اور موضوع میں قابلِ قدر اضافے کیے۔ جس طرح نظم کا دامن وسیع سے وسیع تر ہو گیا اور دوسرے اصناف کے مقابلے میں اظہار کرنا آسان بھی ہو گیا۔ یہی وجہ ہے کہ نظم میں لگ بھگ ہر ایک شاعر اپنے دل کی بات کو ظاہر کرتا ہے یہ اس لئے

آسان اور ممکن ہے کہ شاعر اپنے ذوق و ذہن اور فہم و فراست کو کام میں لا کر نظم کی کسی بھی ہیئت میں جزبات و احساسات کو پیش کرتا ہے۔نظم کی صنف فکر و دانش کی روئیدگی اور بلندی سے تعمیر و تکمیل کی منزلیں طے کرتی ہے جب کہ غزل جزبہ و احساس اور کیفیت و تاثر کی صنف پزیر ہے۔غرض نظم کی تخلیق و تعمیر میں شاعر کے ادراک و احساس اور فکر و استدلال کی آزمائش ہوتی ہے۔''نظم'' یہ عربی اصطلاح اُردو میں فارسی کے توسط سے پہنچتی ہے ۔جس کے معنی ہیں پرونا، آراستہ کرنا، موتیوں کو تاگے میں پرونا، لڑی، انتظام، بندوبست یا کلام موزوں وغیرہ ویسے تو غزل کے سوا ہر موزوں کلام کو نظم کہہ سکتے ہیں۔لیکن اصلاً نظم سے مراد وہ شعری صنف ہے جس میں کسی موضوع پر ربط و تسلسل کے ساتھ خیالات کا اظہار کیا جائے۔یعنی جس میں کوئی قصہ، کوئی تجربہ یا کوئی خیال تسلسل کے ساتھ پیش کیا جائے۔نظم میں ہر شعر معنوی اعتبار سے دوسرے شعر سے وابستہ ہوتا ہے۔اِس لئے نظم میں موضوع کے اعتبار سے وحدت ہوتی ہے گویا نظم کی بنیادی صفت و وحدت اور خیالات کا تسلسل ہے۔نظم کی اس بنیادی صفت کے بارے میں آل احمد سرور یوں بیان کرتے ہیں :

> ''نظم کی مثال ایک دریا کی سی ہے جس میں طرح طرح کی نشیب و فراز ہیں۔کہیں وہ چٹانوں کا سینہ چیر کر نکلتا ہے۔تو کہیں میدانوں میں متانت اور وقار کے ساتھ بہتا ہے۔لیکن دریا میں ایک تسلسل اور وحدت ہوتی ہے۔''[۱]

شاعری کی دیگر اصناف قصیدہ، مثنوی، مرثیہ اور رباعی وغیرہ بھی سوائے غزل کے نظم کے دائرے میں شمار ہوتی ہیں۔قصیدہ، مثنوی ، مرثیہ اور رباعی وغیر خاص موضوعات کے لئے مخصوص ہیں اور زمانہ قدیم میں یہ

۱۔جدید نظم کی ہئیت و تشکیل ایک مباحثہ جدید نظم نمبر سوغات ص:۱۹۱، بنگلور

اصناف مقبول رہی ہیں۔ موضوعات کے علاوہ ہیئت یعنی مصرعوں اور بندوں کے ترتیب کے اعتبار سے بھی دورِ قدیم میں مسدس، مخمس، ترجیح مند جیسی اصناف و اسالیب رائج رہیں۔ اس اصناف کے مخصوص اصول وضوابط تھے جن میں شاعروں کو سختی سے عمل کرنا پڑتا تھا وہ ان اصناف کے مخصوص اصول وضوابط کے پابند رہ کر ہی ان پر طبع آزمائی کرتے تھے لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انسانی زندگی میں سیاسی، سماجی، تعلیمی، اور تہذیبی سطح پر کافی تبدیلیاں عمل میں آئیں جدید خیالات کا ظہور ہوا تو نظم کی پرانی اصناف میں بھی تبدیلی کی ضرورت محسوس ہوئی اسی طرح جدید نظم کا آغاز ہوا۔

جدید نظم ایک داخلی صنف ہے۔ یعنی شاعرانہ تجربے کی داخلی پیش کش جدید نظم کی صورت ہے۔ یہ شاعر کے انفرادی ردِعمل کا اظہار ہے۔ اس میں شاعرہ کا تخیل، سوز وگزار، جزبہ، احساس اور اُس کا حسی کیفیت کا ایک خوبصورت امتزاج پایا جاتا ہے جو انسان کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

جدید نظم جدید ذہن سے پوری طرح مشابہت رکھتی ہے۔ کیونکہ جدید دور کا انسان طرح طرح کی پریشانیوں، الجھنوں، اور کشمکش واضطراب کا شکار ہے۔ اس طرح جب شاعر داخلی تجربات کو الفاظ کے پیکر میں ڈھالتا ہے تو نظم سے بہتر کوئی اور صنف کا آمد نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ اس میں وسعت بھی ہے اور لچک بھی ہے۔ پروفیسر حامدی کشمیری جدید نظم سے متعلق یوں اظہار خیال کرتے ہیں:

> ''موجودہ تصور کے اعتبار سے نظم ایک مکمل تخلیقی یا شاعرانہ تجربے کے
> فنکارانہ اظہار کا نام ہے۔ شعری تجربہ جب شاعر کی داخلیت شخصیت
> کے آتش خانوں میں تپ کر نکھرتا ہے اور پھر پُر اسرار تخلیقی عمل کے
> تحت موزوں، حسین اور مترنم الفاظ کے قالب میں اس انداز
> سے ڈھل جاتا ہے۔ کہ قاری کا دل و دماغ متاثر ہوئے بغیر نہ رہے

تو نظم معرض وجود میں آتی ہے۔نظم کے مختلف اجزاء اور حصے داخلی اور
خارجی طور پر نظم کی تعمیر و تشکیل میں برابر کا حصہ ادا کرتے ہیں۔
اجزاء کل کے ساتھ ہم آہنگ ہو جاتے ہیں شاعر کا
مشاہدہ، احساس، جزبہ ادراک تخیل۔حسیات ایک مرکب جمالیاتی
صورت میں ڈھل جاتے ہیں اور پھر ہیئت کے اعتبار سے ایک تجلی قاری
کے دل و دماغ کے نہاں خانوں میں روشنی کرتی ہوئی گزر جاتی ہے۔'' [۱]

شاعر اپنے گرد و پیش کی تمام اشیاء سے براہِ راست رابطہ قائم کرتا ہے اور پھر اپنے ذاتی خیالات، تجربات اور مشاہدات کی روشنی میں نتیجہ اخذ کرتا ہے۔لیکن ایسی صورت میں خارجی اور داخلی دونوں دنیاؤں سے اُسے گہرا تعلق رکھنا پڑتا ہے۔ان دونوں حالتوں کی باہمی آویزش ہی نظم کی صورت ہے بقول وزیر آغا:

''غزل کل کی جانب سے باہر کو لپکتی ہے لیکن نظم اپنی مکمل انفرادیت
کے باعث خارجی زندگی کی جانب سے اجتماعی لاشعور آتی ہے۔
غزل کا رُخ اندر سے باہر کی طرف ہے ،جبکہ نظم کا
رُخ باہر سے اندر کی طرف ہے۔'' [۲]

خارجی ماحول اور زندگی شاعر کے انفرادی جذبات و احساسات اُس کے مخصوص نظریات جب مربوط طریقہ سے کسی خاص موضوع میں ڈھل جائیں تو نظم کی تشکیل وجود پاتی ہے جو اپنی مکمل ترین صورت

۱۔ پروفیسر حامدی کشمیری، جدید اُردو نظم اور یورپی اثرات (نئی دہلی: ایس۔ایچ، آفیسٹ ،۲۰۱۰) ۱۶۸
۲۔ وزیر آغا، اُردو شاعری کا مزاج (دہلی: روشان پرنٹرس، ۲۰۱۷) ۶۴

میں انفرادیت کا اظہار ہے۔

چونکہ ہمیں یہاں یہ دیکھنے سے غرض ہے کہ نظم نگاری کی ابتداء کہاں سے ہوئی اور موجودہ صورت تک پہنچنے سے پہلے اُسے کن کن مرحلوں سے گزرنا پڑا کیونکہ نظم کا جو تربیتی تصور ہے اور اُس کی ہیئت جو آج ہے وہ ابتداء میں ایسی نہیں تھی۔ اس سلسلے میں تفصیل میں جانے کا موقع نہیں لہٰذا نظم نگاری کی روایت ایک جمالی خاکہ موضوع کے تسلسل کے لحاظ سے پیش خدمت ہے۔

پچھلے ایک سو سال کے عرصے میں جدید نظم کو کافی فروغ حاصل ہوا۔ اس دور میں بھی اگر چہ کچھ شاعروں نے نظم کی قدیم اصناف پر طبع آزمائی کی لیکن جدید نظم کو قبول عام حاصل ہوا۔

تاریخی اعتبار سے دیکھا جائے تو نظم نگاری کی باقاعدہ ابتداء حالؔی اور آزاؔد سے ہوتی ہے۔ حالؔی اور محمد حسین آزاؔد نے صوبہ پنجاب کے گورنر کرنل ہالرائیڈ کے اشارہ پر انجمن پنجاب قائم کی تھی۔ حالؔی اور آزاؔد غزل کے فنی کردار سے مطمئن نہ تھے بلکہ غزل میں صوفیانہ اور مبتذل مضامین باندھے جارہے تھے وہ قوم کے لیے انھیں مضر سمجھتے تھے۔

چنانچہ حالؔی اور آزاؔد نے شعوری طور پر موضوعاتی نظمیں لکھنے کی شروعات کی۔ اِس ضمن میں ان کی نظمیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں جن کا ذکر آگے کیا جائے گا۔

اگر دیکھا جائے تو غزل کی طرح نظم کی ابتداء بھی دکن سے ہوتی ہے۔ دکن میں شاعری کا آغاز صوفیائے کرام نے مذہبی ضرورتوں کے تحت کیا اور اس کام کے لیے غزل سے زیادہ نظم ہی کارآمد صنف تھی ان صوفی بزرگوں نے مذہب، تبلیغ اور رشد و ہدایت کے لیے مثنوی کی ہیئت میں مختصر منظومات پیش کیں۔ دکن میں چونکہ بادشاہت کا نظام رائج تھا ان کی خوشامد کے لیے قصیدے لکھے جاتے تھے اور وہاں اُردو نثر نے بھی کوئی قابل ذکر ترقی نہیں کی تھی چنانچہ داستانیں بیان کرنے کیلئے مثنوی جیسی صنف کو استعمال کیا جانے لگا اور مثنوی کو کافی

فروغ حاصل ہوا۔

اردو اصناف شعر میں نظم کو ایک خصوصی حیثیت حاصل ہے جب کہ غزل اردو کی مقبول ترین صنف ہے۔ مثنوی، مرثیہ اور قصیدہ کو بھی مقبولیت حاصل ہوئی ہے لیکن یہ ہماری مروجہ متداول اور روایتی اصنافِ سخن ہیں۔ قدیم میں بھی ایسی نظموں کی خاصی تعداد ہے جو مختلف ہیئتوں میں ایک ہی موضوع اور کسی ایک خاص ہیئتوں عنوان کے تحت لکھی گئیں اور محض ہیئت کی بنیاد پر کبھی ان کو مثنوی کہا گیا۔ کبھی قصیدہ اور کبھی مسدس تاہم اس نوع کی نظموں کی مقبولیت کے اپنے اپنے جواز تھے۔ نظم میں کسی ایک موضوع پر تسلسل کے ساتھ اظہار خیال کیا جاتا ہے۔ نظم میں موضوعات ایک سے زیادہ بھی ہوسکتے ہیں۔ لیکن یہ سب بنیادی موضوع کے تحت یا اس سے مربوط و منسلک ہوتے ہیں۔ نظم کا ایک مرکزی خیال ہوتا ہے جس کے گرد پوری نظم کا تانا بانا بنا جاتا ہے۔ نظم کی ایک اہم خصوصیت ارتقاء بھی ہے۔ طویل نظموں میں یہ ارتقاء واضح ہوتا ہے۔ مختصر نظموں میں یہ ارتقاء نہیں ہوتا اور اکثر بیشتر ایک تاثر کی شکل میں ابھرتا ہے۔

دکنی نظم بالعموم مرثیہ، قصیدہ، اور مثنوی کی شکل میں وجود میں آئی۔ بظاہر ہیئت اور موضوع کے اعتبار سے یہ اصناف ایک دوسرے سے مختلف نظر آتی ہیں مگر اپنی خاصیت کے اعتبار سے نظم ہی کے زمرے میں آجاتی ہیں۔ مثنوی تفصیل کا فن ہے اس لیے نظم ہی کا مزاج رکھتی ہے۔ جبکہ قصیدے میں تشبیب، گریز، مدح اور دُعا کے مختلف مراحل نظم کے ایک " کل " کو ہی پیش کرتے ہیں۔ مرثیہ میں ایک طرف تو رزمیہ عناصر کے بیان میں قصیدے کا لہجہ جھلکتا نظر آتا ہے۔ تو دوسری طرف اس کا مزاج نظم کا سا ہے۔ اس لیے دکنی دور میں مثنوی ،مرثیہ، قصیدہ کی ترویج وترقی دراصل نظم کی ہی ترویج وترقی کے مختلف مراحل ہیں۔

دکنی دور دو حصوں پر مشتمل ہے

''پہلا دور جسے بہمنی دور کہا جاتا ہے اس دور کا زمانہ چودھویں اور پندرھویں صدی پر محیط ہے۔''۱؎

اس دور میں آزریؔ، نظامی اور خواجہ بندہ نواز گیسودراز دکا کلام زیادہ اہمیت رکھتا ہے موضوع زیادہ تر تصوف اور مذہب کی تبلیغ ہے تاہم اس دور میں عشقیہ داستانیں لکھنے کا آغاز ہو گیا تھا۔ بقول نصیرالدین ہاشمی گیسو دراز کن کے شاعر قرار پاتے ہیں انھوں نے چند رسالے تصوف کے موضوع پر اور چند نظمیں لکھی ہیں۔ ان کی نظم ''چکی نامہ'' بارہ بندوں پر مشتمل ہے۔ تازہ تحقیق کی رو سے خواجہ بندہ نواز گیسودراز کے والد سید یوسف شاہ راجوؔ کی چند نظمیں بھی ملی ہیں اُن میں ''چکی نامہ'' اُردو کی پہلی نظم قرار دی جا سکتی ہے اس نظم میں انہوں نے چکی کے گیت کی صورت میں عورتوں کو مذہبی حقائق یاد دلائے ہیں۔ اُن کی نظموں کا رجحان زیادہ تر اخلاقی و روحانی ہے اُس دور میں عشقیہ داستانیں بھی لکھی گئیں۔ مگر زیادہ تر موضوعات اور تصوف ہی رہے۔

''دوسرا دور قطب شاہی اور عادل شاہی دور پر مشتمل ہے جو کہ سولہویں اور سترہویں صدی عیسوی پر محیط ہے''۔۲؎

اس دور میں لاتعداد شعراء نے طبع آزمائی کی۔ اُس دور میں کافی شعراء نے طبع آزمائی کی مگر نظم کے سلسلے میں محمد قلی قطب شاہ، ابراہیم عادل شاہؔ، میراںؔ ہاشمی، غواصیؔ، نصرتیؔ، مقیمیؔ، جنیدیؔ، طبعیؔ، غلام علیؔ، شوقیؔ، رستمیؔ، ابن نشاطی، اور سیوک وغیرہ کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان میں سے ووجہیؔ نے عشقیہ داستان ''قطب مشتری'' لکھی غواصیؔ نے سیف الملوک و بدیع الجمال جبکہ ابن نشاطیؔ نے ''پھول بن'' مثنوی لکھی ہیں۔ انھوں نے طبع زاد مثنویاں لکھیں ورنہ اس دور میں عام طور سے فارسی تراجم کی بھر مار ہے۔ قصائد کے ضمن میں سلطان قلی قطب شاہ، علی عادل شاہ اور نصرتی کے نام ہیں اور رشمیہ شاعری کے سلسلے میں رستمیؔ، ہاشمیؔ کے علاوہ

۱؎۔ وزیر آغا: اردو شاعری کا مزاج (دہلی، روشان پرنٹرس، ۲۰۱۷) ۲۸۶

۱؎۔ وزیر آغا: اردو شاعری کا مزاج (دہلی، روشان پرنٹرس، ۲۰۱۷) ۲۸۶

درجنوں دوسرے شعراء کا نام لیا جا سکتا ہے ۔(مثلاً عید، نوروز، شبِ قدر، ولادت، سالگرہ بسنت، برسات، شاہی محل، سبزی ترکاری وغیرہ) پر قطبؔ شاہ، ظلؔ اللہ، شاہیؔ، نصرتیؔ، اور شوقیؔ وغیرہ نے طبع آزمائی کی ہے ان کی شاعری کے دو پہلو خاص ہیں عقیدتی یا مذہبی اور ارضی عشق ۔ان کی شاعری سے ان کی قوتِ تخیل، فطرت پرستی ۔منظر نگاری میں مہارت اور عشقیہ جذبات و احساسات کا اندازہ ہوتا ہے اُن سے پہلے کسی بھی شاعر نے منظر نگاری کی طرف با قاعدہ توجہ نہیں دی ۔قطب شاہ کی شاعری کا ایک بید نمونے کے طور پر دیا جاتا ہے ۔ جو انھوں نے ''باغ محمد شاہی'' پر لکھی ۔

ے چمن کے پھول کھلتے دیکھ سکھیاں کا مکھ یاد آیا
سہاتا تھا محمد پھل نمن اُن کا نیں سار

ے وسے نا سک کلی چنبا بھواں دو پات ہیں تس کے
بھنور تل دیکھ اُس جا گا ہوا حیران من سارا

ے سب خوشے واکھ لاکھاں کے ثریا سنبلا ہے جوں
سہے اس واکھ منڈوا سو جیا انبر کہن سارا [۱]

یہ نظمیں ارتقاء گہرائی اور تعمیر کی کمی کے باوجود نظم کی اولین کوشش کے سلسلے میں کافی اہمیت رکھتی ہیں ۔اس دور کے رجحانات و معاشرت کے نقشے واضح طور پر ان نظموں میں دکھائی دیتے ہیں ۔دکنی شاعری فارسی شاعری کی پیروی میں پروان چڑھی جس کی وجہ سے اس میں تخلیقی صفات نہ ہونے کے برابر ہیں ۔ یہ شاعری صرف خارجی اشیاء واقعات و تجربات تک محدود ہے اس میں واردات قلب اور ذات کے اظہار سے گریز کیا گیا ہے ۔ان میں جگ بیتی کا سا انداز ہے ۔شاعر محض داستان گو اور تماشہ بین بن کر رہ گیا ہے ۔عشقیہ شاعری

---

۱ ۔کلیات سلطان محمد قلی قطب شاہ مرتبہ ڈاکٹر زور، ص: ۶۵

محبوب کی پرستش اور سراپا نگاری تک محدود ہے جبکہ شاعری میں خارجی اشیاء کے ساتھ ساتھ ذاتی محسوسات کا پایا جانا بہت ضروری ہے دکنی شاعری کو تبلیغ اور دیگر مذہبی ضرورتوں کے لیے استعمال کیا گیا۔اس لئے دکنی شاعری کو خارجی شاعری قرار دے سکتے ہیں ۔یہ نظمیں نظم کے معیار پر تو پورا اترتی ہیں لیکن ان میں اعلیٰ شعری صفات غائب ہیں ۔۱۷۰۰عیسوی میں ولی کے سفر دہلی کے ساتھ ہی اردو شاعری کا نیا دور شمالی ہند میں شروع ہوتا ہے نظم کی کئی اصناف کو وہاں فروغ حاصل ہوا۔نظم کی ایک صورت مثنوی کا ارتقاء بھی شمالی ہند میں ہوا۔اٹھارہویں صدی سے ۱۸۵۷ کے غدر تک کے درمیانی عرصے میں غزل کے مقابلے میں نظم کسی بھی طرح پست دکھائی نہیں دیتی۔اس زمانے میں داخلی محسوسات کے اظہار کے لیے غزل جبکہ خارجی زندگی اور خارجی اشیاء کے بیان کے لیے مثنوی، قصیدہ جیسی اصناف میں طبع آزمائی ہونے لگی جس سے نظم ایک خاص فضا میں پابند ہوکر رہ گئی۔ایک طرف تو نظم ایرانی تقلیدی عناصر سے دامن نہ بچاسکی۔دوسری طرف ہندوستان میں نظم کا مزاج گیت کے مزاج سے قریب تھا۔جس کے تحت نظم نے بت پرستی،سراپا نگاری اور پوجا کے رجحان کو اپنایا اور نظم کو خارجی موضوعات کے لیے واقف کر دیا اس دوران بعض شعراء نے مزاج کے بجائے ہیئت دی اور مثنوی میں دیگر موضوعات شامل کر کے مثنوی کا دامن کافی وسیع کر دیا۔یہ دور مثنوی کا دور مانا جاتا ہے اس سے پہلے اور دکنی دور کے بعد بھی لاتعداد مثنویاں لکھی گئیں ولی کی مثنوی شکل صورت کی تعریف میں لکھی گئی۔

''مثنوی در تعریف صورت '' موجودہ شکل میں ایک اچھی نظم کا نمونہ ہے۔سراج اورنگ آبادی کی ''بوستانِ خیال'' اور آبرو کی موعظتِ آرائش معشوق سے لے کر داغ کی ''فریاد داغ'' وغیرہ دوسو برس کے طویل عرصے میں سینکڑوں مثنویاں لکھی گئیں لیکن ان مثنویوں میں زیادہ تر تقلیدی عناصر کی بھرمار ہے۔ایسے میں مثنوی کی روائتی انداز میں تبدیلیاں پیدا ہونے لگیں اور داخلی کیفیات و واردات قلب بھی مثنویوں میں قلمبند ہونے لگے ۔ایسے میں مثنوی نظم کے اصل معیار کے قریب تر ہوگئی ۔اُس دور کی مثنویوں میں میر حسن کی

’’سحرالبیان‘‘، مومنؔ کی ’’قولِ غمگین‘‘ مرزاؔ شوق کی ’’زہرعشق‘‘ اورسید میر آثر کی معاملاتِ عشق اورخواب وخیال خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ یہ مثنویاں جدید نظم کے قریب تر دکھائی دیتی ہیں۔

میر حسن کی ’’ سحرالبیان‘‘ منظرنگاری، جدید نگاری سادگی اور جزئیات نگاری میں بے مثال ہے۔اس مثنوی کی تصنیف کو دو برس گزر چکے ہیں ۔اس طویل مدت میں کوئی ایسی مثنوی سامنے نہیں آئی جس کی خصوصیات کے اعتبار سے’’سحرالبیان‘‘ کے مدِ مقابل پیش کیا جا سکے۔اس کے بعد ’’گلزارنسیم‘‘ بھی لکھی گئی اس میں وہ خوبیاں موجود نہیں جو ’’سحرالبیان‘‘ میں ہیں اُس دور کی زیادہ تر مثنویاں تخلیقی فضا کے اردگرد گھومتی ہیں۔تاہم مرزا شوقؔ کی ’’مثنوی زہرعشق‘‘ بدلتے ہوئے رجحان کی عکاسی کرتی ہے کیونکہ اس میں تخلیقی دنیا سے حقیقت کی طرف آنے کی روش صاف طور پر نظر آتی ہے۔

اُردو نظم کی اس دور میں قصیدہ، ہجو، مرثیہ، مثنوی اور واسوخت جیسی اصناف کو بہت ہی فروغ حاصل ہورہا تھا۔ یہ معاشی ومعاشرتی انتشار کا دور تھا۔اعلیٰ قدریں رخصت ہورہی تھیں ، بادشاہت کا تصور موجود تھا، بادشاہوں کی شان میں قصیدے لکھے جاتے تھے جو مصنوعی اسلوب اور مصنوعی فضا کی پیداوار تھے۔ بادشاہت کے خاتمے کے بعد ان کا وجود بھی ختم ہوگیا۔سوداؔ کی بعض ہجوؤں میں نظم کی کچھ خصوصیات ملتی ہیں ۔ یہ وہ ہجو ہیں جو شخص حملوں سے پاک ہیں۔ان کا قصیدہ ’’درہجواسپ‘‘ اور ’’تر پت سنگھ کا ہاتھی‘‘ میں تمثیلی انداز میں اپنے دور کے فوجی نظام کی بدحالی وابتری اور سماجی خرابی وناہمواریوں کو تضحیک کا نشانہ بنایا گیا ہے، ہجویات کے ساتھ شہرآشوب بھی لکھے گئے۔ یہ بھی نظم کے اصل معیار سے دور دکھائی دیتے ہیں۔

اردو نظم کے ارتقاء کے سلسلے میں مرثیے کی اہمیت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا۔مرثیے نظم کی آئیندہ ترقی کے لیے خاص ممد ومعاون ثابت ہوئے ۔خلیقؔ ،ضمیرؔ، انیسؔ و دبیرؔ نے بہت عمدہ مرثیے لکھے اُردو شاعری میں منظرنگاری جذبات واحساسات کی عکاسی کا رجحان مرثیوں کا ہی مرہونِ منت ہے۔

آ گے چل کر اردو شاعری کا عہد زریں آ تا ہے۔ جو میرؔ، دردؔ اور سوداؔ سے منسوب ہے۔ یہ بحثیت مجموعی طور پر اپنی غزل گوئی کے لئے مشہور ہے اور نظیرؔ کے علاوہ کسی نے نظم کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں کی اس لئے نظیرؔ کے علاوہ کسی شاعر کو نظم گو شاعر کا درجہ نہیں دینا مشکل معلوم ہوتا ہے۔ نظیرؔ اکبر آبادی اس دور کا تنہا ایسا شاعر ہے جس نے روایت سے الگ ہو کر شاعری کی نظم کو اپنے تجربات و خیالات کا وسیلہ بنایا۔ نظیرؔ کا یہ تجزیہ بالکل نادر اور انوکھا تھا۔ انھوں نے خاص لوگوں کے بجائے عام لوگوں کے لئے شاعری کی۔ نظیرؔ اکبر الہ آباد میں رہتے ہوئے بھی ایک باشعور اور حساس فن کار کی طرح سارے ملک کی تقدیر، اس کی زبوں حالی اور برگشتگی کا مظاہرہ کر رہے تھے اور تباہی و بربادی کے اس روح فرساد نظارے سے متاثر ہو رہے تھے۔ نظیرؔ نے اپنی اکثر نظموں میں اس کا ذکر کیا ہے ۔ مسلسل جنگ، لوٹ مار، قتل عام، آبادیوں اور شہروں کی ویرانی و بربادی، فصلوں کی تباہی صنعت و حرفت کی بے قدری، بیروزگاری اور ان سے پیدا ہونے والی معاشی، معاشرتی وقتیں اور اخلاق سوزی کے واقعات وغیرہ یہی عوامل تھے جن میں نظیرؔ کی شاعری پروان چڑھتی ہے اور یہی سیاسی و سماجی پس منظر ان کی مختلف نظموں کے موضوعات بنتے ہیں۔

نظیرؔ کا تنوع اور ان کے معاملات بہت کم شاعروں کے حصے میں آئی ہیں ۔ آج اردو نظم کافی آگے بڑھ چکی ہے۔ لیکن نظیرؔ کی حیثیت ایک روشن مینار کی سی ہے جو بہت سارے نظم نگاروں کی راہ روشن کر رہے ہیں ''خالص نظم'' کے باب میں نظیر اکبرآبادی کا نام ہی بہت اہم نام مانا جاتا ہے۔ ان کا شمار جدید شاعری کی تحریک کے پیش رووَں میں ہوتا ہے۔ ویسے تو انھوں نے دیگر اصناف پر بھی طبع آزمائی کی۔ لیکن خالص نظم کی ابتداء اُن کا بڑا کارنامہ ہے۔ نظیرؔ سے پہلے شاعری کا تعلق بادشاہ اور امراء سے ہوتا تھا نظیرؔ نے شاعری کو سماج اور زندگی سے جوڑ دیا اس لیے انھیں عوامی شاعر کہا جاتا ہے۔ دنیا کی بے ثباتی میلے ٹھیلے مذہبی دلچسپیاں ان سب کی متحرک صورتیں دیکھنے کو ملتی ہیں ۔ ان کی شاعری میں وطن کی دھرتی سے والہانہ لگاوَ کا احساس ہوتا ہے۔ اس کے

ساتھ ساتھ گہرے فلسفیانہ خیالات اور علم وحکمت سے پر نکات بھی زیر بحث ہوئے ہیں ۔اس سلسلے میں سید طلعت حسین لکھتے ہیں:

''نظیر اکبر آبادی کی حیثیت محض شاعر کی نہیں بلکہ ایک مفکر اور مصلح کی بھی ہے۔ انھوں نے انسانی زندگی کے ہر شعبے کا مشاہدہ بہت قریب سے کیا اور انسان کو کامیابی کا سلیقہ سکھایا۔ اُن کی شاعری گلُ وبلبل کی شاعری نہیں بلکہ انسانی زندگی کی مکمل تصویر ہے جس میں ہر انسان اپنے خدوخال آسانی سے دیکھ سکتا ہے''۔ ۱؎

نظیرؔ کی مشہور و معروف نظموں میں آدمی نامہ، بنجارہ نامہ، عید، شب برات، روٹی نامہ وغیرہ قابل ذکر ہیں نمونے کے طور پر نظیر کی نظم بنجارہ نامہ سے ایک بند پیش خدمت ہے:

؎ ٹک حرص و ہوس کا چھوڑ میاں مت دیس و بدیس پھرے مارا
قزاق اجل کا لوٹے ہیں دن رات بجا کر نقارا
؎ کیا بدھیا ،بھیسنا بیل شتر کیا گوئیں پلا سر بھارا
کیا گیہوں چاول موٹھ مٹر کیا آگ دھواں اور انگارا
سب ٹھاٹ پڑا رہ جاوئے گا جب لاد چلے گا بنجارا ۲؎

نظیرؔ کی نظموں میں تجربے کا عمل نمایاں ہے اچھے شاعر کی خوبی ہے کہ جو بھی تجربہ حاصل کرے اس کا ردِعمل اور جزبہ

۱؎۔سید طلعت حسین نقوی، نظیر اکبر آبادی کی نظم نگاری (نئی دہلی : ایجوکیشنل پبلی کیشنز ہاوس، ۱۹۹۱) ۲۷
۱؎ ۔ سید طلعت حسین نقوی، نظیر اکبر آبادی کی نظم نگاری (نئی دہلی، ایجوکیشنل پبلی کیشنز ہاوس ،۱۹۹۱)۲۰۸

انفرادی ہونا چاہیئے۔اگر وہ انفرادی ردِعمل کا اظہار کرتے تو یقیناً جدید اردو نظم کے بانی قرار پاتے۔

اُردو شاعری کی تاریخ پرنظر ڈالیں تو اندازہ ہوتا ہے۔کہ حالؔی اور آزادؔ جدید اُردو شاعری میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔حالؔی اور اُن کے رفقاء یعنی محمد حسین آزادؔ ، شبلی نعمانی،اسمٰعیل میرٹھیؔ اور اکبر آلہٰ آبادیؔ کا زمانہ وہ تھا کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ناکامی کے بعد مسلمان ہر لحاظ سے پسماندہ ہو چکے تھے ایسے میں سر سیدؔ احمد خان نے مسلمانوں کی احیائے نو کا بیڑا اُٹھایا جسے تہذیبی نشاۃ الثانیہ کا نام دیا گیا۔اس تحریک کے ذریعے سرسید مغربی طرزِ تعلیم اور مغربی علوم وفنون سے استفادہ کرنے کی ضرورت پر زور دیا ۔

اس تحریک کے زیر اثر نیچرل شاعری کی تحریک شروع کی جس کے تحت جدید نگاری کی ابتداء ہوئی۔مغربی نظموں کے ترجموں کے ذریعے نظم نگاری کا تصور پروان چڑھنے لگا ۔۱۸۵۷ء کے بعد جدید نظم کے اولین علمبرداروں میں محمد حسین آزادؔ کا نام سرفہرست ہے۔انھیں اس بات کا احساس ہو چکا تھا کہ نئی تہذیب اور نئے علوم وفنون کے اثرات سارے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے رہے ہیں ۔جس سے یہاں کی تہذیب تبدیل ہوا رہی ہے بدلتے ہوئے حالات نے نظم کا نیا تصور قائم کرنے میں مدد دی۔کرنل ہالرئیڈ اس وقت پنجاب کے سررشتہ تعلیم کے منتظم اعلیٰ تھے۔ان کے مشورے اور لاہور کے ہندو مسلم اور سکھ علماء فضلاء کی مدد سے ۲۱ جنوری ۱۸۶۵ء کو محمد حسین آزاد نے انجمن پنجاب قائم کیا۔ اس کا مقصد نظم کو فروغ دینا تھا۔ہالرائیڑ نے درسی کتابوں کے لیے موضوعاتی نظمیں لکھوائیں ۔حالؔی اور آزادؔ کی کوششوں سے اردو شاعری ایک مخصوص دائرے سے نکلی ۔نئے موضوعات اور مسائل شاعری میں داخل ہوئے۔روائتی اور بے جان شاعری کے بدلے سچے مشاہدات و تجربات کے اظہار پر زور دیا گیا۔

موضوعاتی نظمیں لکھنے کی ابتداء کی گئی اس ضمن میں آزادؔ کی شب قدر، گنجِ قناعت، ابر کرم، زمستان، خواب امن وغیرہ، جبکہ حالؔی کی برکھارت، نِشاط امید، حبِ وطن، مناظرہ رحم وانصاف جیسی نظمیں قابلِ ذکر ہیں جو

انجمن کے مشاعروں میں پڑھی گئیں یہ نظمیں چونکہ خاص مقصد کے لیے لکھیں گئیں۔اس لیے ان میں سماج کی اعلیٰ قدریں زیر بحث ہیں ۔ان میں واعظانہ اور اصلاحی رنگ غالب ہے۔ حالیؔ، اکبرؔ، آزادؔ اور ان کے دیگر ہم عصر شعراء نے نظم کے موضوعات کو وسیع کر دیا۔جس سے جدید اُردو نظم کے لیے راہ ہموار ہوگئی۔ حالیؔ کی شاعری کا مقصد چونکہ قومی اصلاحی اور معاشرتی برائیوں کا قلع قمع کرنا اور قوم کی اخلاقی تربیت کرنا تھا ۔اِس مقصد کے پیش نظر انھوں نے ''چپ کی داد''، ''ماجات بیوہ'' اور ''شکوہ ہند'' جیسی نظمیں لکھیں جن سے اُن کی دردمندانہ طبیعت کا اندازہ ہوتا ہے اور طبقہ نسواں کے تئیں ان کے جزبات واحساسات کا پتہ چلتا ہے۔

حالیؔ کا سب سے بڑا کارنامہ ''مقدمہ شعروشاعری'' ہے۔اصلاً یہ ان کی شعری کے مجموعے کا مقصد تھا لیکن آخر کار اسے ایک مستقبل کی کتاب کی حیثیت حاصل ہوگئی ۔پروفیسر آل احمد سرور نے اسے اردو شاعری کا پہلا مینی فیسٹو کہا ہے کیونکہ حالیؔ نے پہلی باضابطہ طور پر یہ بحث کی ہے کہ شاعری کسے کہتے ہیں، شاعر ہونے کے علاوہ کون سی شرطیں ضروری ہیں اور شاعری میں کیا خوبیاں ہونی چاہئے۔

آزادؔ نے جدید نظم سے متعلق اپنے خیالات نثر ونظم دونوں میں بیان کئے ہیں۔اس ضمن میں اُن کی نظمیں اُردو شاعری کو تاریخ میں ایک خاص اہمیت رکھتی ہیں کیونکہ یہ جدید نظم کی اولین کوشش ہیں۔

نظم نگاری کے میدان میں آزادؔ اور حالیؔ کے بعد شبلیؔ بھی ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔شبلیؔ نعمانی بنیادی طور پر ناقد تھے لیکن انھوں نے ایک محقق، مورخ اور شاعر کی حیثیت سے بھی اپنی شناخت قائم کیا۔انھوں نے پہلے تو اصلاحی شاعری کی۔اس کے بعد بیسویں صدی کے سیاسی حالات کے پیش نظر سیاسی نظمیں لکھنے شروع کیں۔ان میں اُن کی نظم ''ہنگام''، ''طرابلس و بلقان'' نمونے کے طور پر دی جاسکتی ہیں۔وہ اپنی صبح اُمید میں نادر اور معنی خیز تشبیہوں، استعاروں اور دل پزیدتر کیبوں کے استعمال سے حسن پیدا کرتے ہیں۔کلیم الدین احمد نے صبح امید کو مسدس حالی پر ترجیح دی ہے۔نظم نگاری کے چوتھے اہم ستون اسمٰعیل میرٹھی ہیں نظم نگاری کا خاص میدان ہے۔

جدید نظم نگاری کی روایت جو حالؔی اور آزادؔ سے شروع ہوتی ہے اُسے آگے بڑھانے میں اسمٰعیل میرٹھی نے اہم کردار ادا کیا۔ اسمٰعیل میرٹھی نے تصور اور تخیل میں موضوع تلاش کرنے کے بجائے اپنے اطراف کا بغور مطالعہ کیا اور روزمرہ زندگی کے واقعات فطری مناظر، گھریلو اشیاء اور پالتوں جانوروں کو اپنی نظموں کا موضوع بنایا اور ان پر چھوٹی چھوٹی نظمیں اکثر بچوں کے لئے لکھیں۔ انجمن پنجاب کے تحت ہونے والے مشاعروں سے پہلے ہی انھوں نے موضوعاتی نظمیں لکھنے شروع کر دی تھیں۔ بیانیہ اور فطری شاعری ان کی نظموں کا خاص جوہر ہے ''گرمی کا موسم''، ''ہوا چلی''، ''رات''، ''برسات''، ''شفق''، ''دال کی فریاد''، ''چپاتی'' ، وغیرہ اسی طرز کی نظمیں ہیں۔ حب الوطنی اور معاشرتی مسائل بھی ان کی نظموں کا موضوع بنے ہیں۔ بچوں کی شاعری میں بھی وہ کافی امتیاز رکھتے ہیں ۔ وہ بچوں کی نفسیات سے آگہی رکھتے تھے اس لیے انھوں نے بچوں کے لئے کافی نظمیں لکھیں۔

'اسلم کی بلی، کوا، پن چکی، ہماری گاڑی، ایک جگنو اور بچہ، ایک بچہ اور ماں، یہ نظمیں خاص طور سے بچوں کے لیے لکھیں گئیں ہیں مگر ان سے ان کے تجربے اور مشاہدے کی گہرائی کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے ہیئتی تجربے بھی کئے ہیں ۔ دو نظمیں قوافی کی پابندی کے بغیر بھی لکھی ہیں اس طرح معریٰ نظم کی داغ بیل انہی کے ہاتھوں پڑی۔ اسمٰعیل میرٹھی کے بعد اکبر آلہٰ آبادی کا نام بھی خصوصیت کا حامل ہے انھوں نے طنز و مزاح کے اسلوب کے لئے امکانات سے اردو نظم کو روشناس کیا۔ انھوں نے انگریزی نظموں کا مطالع کیا تھا۔ برق کلیسا' اور جلوہ دربار دہلی ان کی انفرادی رنگ کی نظمیں ہیں۔ انھوں نے چھوٹی چھوٹی نظموں میں بھی فطرت کی مصوری کے نمونے پیش کیے ہیں ۔ انھوں نے شاعری کی شروعات ، رومانی غزلیات سے کی اور پھر وقت و حالات کے تقاضوں کے مطابق اپنے دور کی برائیوں اور خامیوں کو بیان کرنے کے لیے طنزیہ انداز اپنایا۔ یہ وہ دور تھا جب اردو کی نظمیہ شاعری کے دوسرے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ اس میں زیادہ تر شعراء رومانی تحریک سے

جڑے ہوئے تھے اور بعض نے آزادؔ اور حالیؔ کی حب الوطنی کی تحریک کو آگے بڑھایا سیاسی موضوعات پر نظمیں لکھیں اس دور کے شعراء میں وحیدالدین سلیمؔ، منشی درگاہ سہائے، سرور جہاں آبادیؔ، تلوک چندؔ محروم، سورج نرائن مہرؔ، چکبستؔ، نادر کاکورویؔ، ہمایوںؔ، ظفر علی خاںؔ، خوشی محمد ناظمؔ اور عظمت اللہ وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ اختصار کے پیشِ نظر صرف چند شعراء کا ذکر کیا جائے گا۔ اکبرالہ آبادی کے دور میں سرور جہاں آبادی نے بھی نظمیہ شاعری کی تاریخ میں اہم کردار ادا کیا۔ انھوں نے اپنے پیش ور شاعروں کے خطوط پر اپنی شاعری کو استوار کیا۔ ان کی شاعری کا سب سے بڑا امتیاز جوش بیان ہے۔ پھر ان کی خوبصورت تشبیہات اور تراکیب کی معنویت دوسرے شعراء سے انھیں ممتاز کرتی ہے۔ سرورؔ جہاں آبادی کی اہمیت یہ ہے کہ انھوں نے نئے موضوعات پر پُر جوش نظمیں لکھی ہیں۔ اپنے وطن سے وہ شدید محبت کرتے تھے۔ اسی جذبہ کا اظہار اپنی نظموں میں انھوں نے ولولہ انگیز لب ولہجہ میں کیا ہے۔

جدید موضوعاتی نظموں کے نمونے تو اُن کے سامنے موجود ہی تھے۔ انگریزی ادب پر ان کی کافی نظر تھی انھوں نے انگریزی نظموں کے منظوم ترجمے کئے ہیں۔ انھوں نے اخلاقی اور اصلاحی نظمیں لکھیں اور جدید نظم نگاری کے افق کو مزید وسیع کر دیا۔ سوزِ بیوہ، اجڑی ہوئی محفل، یادِ وطن، قومی نوحہ، جلوہ اُمید، کارزارِ ہستی وغیرہ ان کی مشہور نظمیں ہیں۔ حالیؔ، اکبرؔ اور ان کے دیگر ہم عصر شعراء نے نظم کے موضوعات کو وسعت بخشی جس سے جدید اُردو نظم کے لیے راہ ہموار ہوگئی لیکن حقیقتاً جدید اردو نظم کا آغاز اقبالؔ سے ہوتا ہے جدید نظم کی تاریخی اور فنی ارتقاء میں اُن کا کردار بہت اہم ہے بلا شبہ اقبالؔ بیسویں صدی کے وہ عظیم شاعر ہیں جنھوں نے موضوعات کی رنگارنگی نے اردو نظم کے دامن کو کافی وسیع کر دیا۔ اقبالؔ کے سامنے حالیؔ، نظیرؔ، آزادؔ، شبلیؔ، اور اسمٰعیل میرٹھیؔ کی نظمیں بطور نمونہ موجود تھیں۔ انھوں نے نہ صرف اس سلسلے کو آگے بڑھایا بلکہ اردو میں نظم نگاری کے وقار و معیار بلندی عطا کیا۔ اقبالؔ اردو کے اہم مفکر اور فلسفی ہیں انھوں نے اپنی نظموں کے

ذریعہ دنیا کے سامنے اپنے مخصوص فکر وفن کو پیش کیا۔ان کی نظموں میں ربط وتسلسل ہے۔ مدلل اور مربوط فلسفہ ہے ایک مخصوص انداز فکر ہے۔اقبآل کے مخاطب ہمیشہ وہ انسان رہے ہیں جو حرارت، یقین محکم اور عمل پیہم سے خالی اور جمود و تعطل کا شکار تھے۔انھوں نے اپنی نظموں کے ذریعے ان کے مردہ دلوں میں زندگی کی روح پھوکنے کی کوشش کی اور کامیاب زندگی گزارنے کا تصور پیش کیا۔ان کی کچھ اہم نظمیں خضر راہ، مسجدِ قرطبہ، ساقی نامہ، ذوق وشوق، والدہ مرحوم کی یاد میں، شمع اور شاعر انھوں نے داخلی وخارجی زندگی کے بیان کے لئے نظم کو استعمال کیا البتہ ہیئت کے لحاظ سے مثنوی، مسدس اور ترکیب بند کی روایت کو اپنایا۔اقبآل نے اپنی شاعری کے پہلے دور کا آغاز اپنی مشہور نظم نالہ یتیم سے کیا۔اس دور کی دوسری اہم نظمیں ہیں ہمالہ، نیا شوالہ اور ترانہ ہندی وغیرہ۔ گویا اس زمانے میں ہندوستان اور ہندوستان کی محبت ان کی توجہ کے مرکز تھے۔اس وقت ان کی زندگی میں حب الوطنی اپنے دیس کی محبت کا جزبہ اپنے شباب پر تھا۔ اقبآل، آزآد اور حآلی کی نظم نگاری کی تحریک سے متاثر تھے انھوں نے پرانے شعراء کی روایت سے بھی استفادہ کیا موضوع اور فن میں جدت کے اعتبار سے اُن کی نظم کافی آگے نکل گئیں۔ان نظموں میں ان کی فکر وتخیل کی بلندی کے ساتھ ساتھ وطن سے محبت، اتحاد و اتفاق اور انسانیت کے درد کا احساس ملتا ہے۔اقبآل کی شاعری کا دامن بہت وسیع ہے۔صحیح معنوں میں اقبآل نے اُردو نظم کو ایک بالکل ہی نئے انقلاب سے روشناس کیا ان کی شاعری کا منبع وماخذ قرآنِ حکیم ہے اُن کے ہاں فلسفہ بھی ہے۔عشق وتصوف کے مضامین بھی، تاریخ وتہذیب کے نکات بھی ہیں اور انھوں نے قوم پرستی کا احساس بھی اپنی نظموں میں اُن دشوار سوالات کو حل کرنے کی کوشش کی ہے جن کا تعلق تاریخ، عمرانیات، سیاسات، اور روحانیت وغیرہ سے ہے۔انھوں نے عمل اور خودی کا انوکھا تصور کیا۔اقبآل کے نزدیک خودی میں ہی انسان کی کامیابی کا راز پنہاں ہے۔اُن کی نظمیں شمع وشاعر، خضرِ راہ، شکوہ جواب طلوع اسلام، شعاعِ امید، مسجد قرطبہ، ذوق وشوق، ساقی نامہ، جبریل وابلیس، والدہ مرحوم کی یاد میں فکر وفن کی بلندیوں پر ہیں اُن کے کلام میں جوش

اور جذبہ کی فراوانی ہے۔غرض یہ ہے کہ جدید اُردو نظم پر ان کے اثرات بہے دور رس اور گہرے ہیں۔نمونے کے طور پر اقبالؔ کی نظم ''مسجد قرطبہ'' کے چند اشعار پیشِ خدمت ہے۔

سلسلئہ ، روز و شب نقش گر حادثات
سلسلئہ ،روزوشب،اصل حیات و ممات

سلسلئہ، روزوشب ، تار حریرِ دورنگ
جس سے بناتی ہے ذات اپنی قبائے صفات

سلسلئہ ، روزوشب ساز اول کی فغان
جس سے دکھاتی ہے ذات زیروبم کائنات [۱]

اقبالؔ نے اس نظم میں جزبے اور فکر کی گہرائی سے بہت ترتیب کے ساتھ خیالات کا اظہار کیا ہے۔اس نظم کا نچوڑ یہ ہے کہ کائنات کی سب سے بڑی طاقت عشق وایمان کی قوت ہے جس کے سامنے زوال اور فنا ٹھہر نہیں سکتے یہ لازوال طاقت مٹی کو سونا اور فانی چیزوں کو غیر قانونی بنانے کی صلاحیت رکھتی ہے''مسجد قرطبہ'' تو فنا ہوسکتی ہے لیکن اُس کے معماروں کا جزبہ عشق جس کے تحت انھوں نے اس کی تعمیر میں حصہ لیا وہ ہمیشہ زندہ جاوید رہے گا۔

اُردو نظم گوئی کی روایت کے اس تزکرے میں پنڈت برج نرائن چکبستؔ کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔انھوں نے ملی جُلی شاعری کی اُس روایت کو آگے بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا جس کی شروعات آزادؔ اور حالیؔ سے ہوتی ہے۔چکبستؔ حقیقت میں قومی شاعر تھے ۔ان کا اصل مقصد یہ تھا کہ اس زمانے کے قومی تحریکوں کی طرف

۱۔ کلیات اقبال ص،۹۳

اربابِ وطن کو رغبت دلانا اور وطن کے نوجوانوں کو وطن کی محبت اور اس کی ترقی کی طرف متوجہ کرنا تھا۔ان کا طریقہ یہ تھا کہ مغربی تہذیب وتمدن کا دامن چھوڑنے بغیر اگر مغربی تہذیب میں کوئی اچھی بات ملی ہے تو اسے اختیار کر لینا چاہئے۔اسی خیال کے تحت وہ ہوم رول کے مطالبہ کے دل سے حامی تھے۔ چکبستؔ نے حب الوطنی کے جذبے سے سرشار نظمیں لکھیں اور عوام میں سیاسی شعور بیدار کرنے کی کوشش کی۔اُن کا مجموعہ " صبح وطن "حُب الوطنی کے جذبات سے معمورر ہے اور اُن کی شاعری میں ہندوستانی تہذیب وثقافت کی جھلکیاں دکھائی دیتے ہیں۔ اخلاق و کردار،مناظر قدرت بھی اُن کی شاعری کا موضوع بنے ہیں۔ انھوں نے کوئی بڑا گنجلک فلسفہ یا کوئی نظریہ حیات پیش نہیں کیا بلکہ وطن کی مٹی یہاں کے موسم اور یہاں کے لوگ ان کے شاعری کا موضوع ہیں۔

اقبالؔ کے زمانے میں ترقی پسند تحریک کی شروعات ہوئی اُس دور میں جوش ملیح آبادی کا ذکر بھی ضروری ہے۔جنھیں شاعرانقلاب،شاعرفطرت اور شاعر شباب کہا جاتا ہے۔ان کی شاعری اُس دور کے اہم رجحانات کا نمایاں اثر ہے۔جب جوشؔ نے نظم نگاری شروع کی تو اس وقت اردوشاعری میں اقبالؔ کے فلسفیانہ افکار ،چکبستؔ کی قومی شاعری اور رومانیت کے عناصر اُردو نظم میں داخل ہو چکے تھے۔اس لیے جوشؔ کی شاعری میں انقلابی رنگ کے ساتھ ساتھ انسان دوست،مناظر فطرت کی دلکشی اور حسن وعشق کے مرقعے بھی ہیں۔جوشؔ قوم پرستی،ہندو مسلم اتحاد،حب وطن،جمہوریت،امن اور آزادی خیال کے پجاری ہیں اور انہوں نے ان خیالات کو اپنی ہزاروں نظموں میں بڑے دلچسپ اور خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔ یہاں شک کی کوئی گنجائش نہیں کہ شاعری میں خاص کر نظم میں نئے رجحانات کے باوجود اردو کی تاریخ میں مستقبل کی دنیا ان کو بہت بلند مقام دے گی۔اُن کے پاس لفظوں کا بے بہانہ خزانہ ہے جسے وہ بے دریغ لٹاتے ہیں اُن کے تصور انقلاب میں اگر چہ اتنی گہرائی اور وسعت نہیں۔وہ انقلاب کو وسیع معنی نہ دے سکے اُن کے ہاں انقلاب ایک شعری موضوع اور

ایک نعرہ بن کر رہ گیا ہے۔لیکن خیالات کی رعنائی اور جذبات کی شدت میں کوئی اُن کا مقابلہ نہیں۔ملاحظ ہو:

کیا ہند کا زنداں، کانپ رہا ہے اور گونج رہی ہیں تکبیریں
اکتائے ہیں شاید کچھ قیدی اور توڑ رہے ہیں زنجیریں
دیواروں کے نیچے آکر یوں جمع ہوئے ہیں زندانی
سینوں میں تلاطم بجلی کا آنکھوں میں جھلکتی شمشیریں [۱]

جوشؔ کی طرح حفیظؔ نے شاعری کی شروعات رومانیت سے کی لیکن بعد میں اُن پر اقبالؔ کا اصلاحی رنگ غالب آگیا۔''شاہنامہ اسلام'' حفیظؔ کا بہترین کارنامہ ہے تاریخی واقعات اور خصوصیت کے ساتھ جب وہ مذہبی تاریخ سے متعلق ہوں۔اس طرح بیان کرنا کہ تاریخ مسخ نہ ہونے پائے۔ساتھ ہی مذہبی جوش وولولہ بھی حقیقت نگاری پر غالب نہ آنے پائے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ شعریت اور لطافت بھی باقی رہے۔بڑا مشکل کام ہے لیکن انھوں نے شاہ نامہ اسلام میں مسلمانوں کی عظمت رفتہ کے نقوش واضح کئے ہیں۔انھوں نے پاکستان کا قومی ترانہ ہی ترتیب دیا۔ایک لاکھ قومی ترانوں میں سے حفیظ کے ترانے کو ہی سندِ قبولیت حاصل ہوئی۔حفیظؔ کی شاعری میں منظر کشی، جزبات واحساست کی عکاسی اور ہندوستان کی تہذیبی وثقافتی زندگی کے مرقعے ملتے ہیں اس سلسلے میں سحر چاند کی سیر، برسات تاروں بھری رات وغیرہ نظمیں قابلِ ذکر ہیں۔

علی گڑھ تحریک کے بعد اور شعوری تحریک جس نے ہمارے ادب کو انقلابی تبدیلیوں سے دوچار کیا۔ وہ ترقی پسند تحریک تھی۔ترقی پسند تحریک کی بنیاد ۳۶۔۱۹۳۵ء میں عمل میں آئی۔اس کے مفکرین ومصنفین مارکس کے فلسفے سے متاثر تھے۔اس کا مقصد شعر وادب کو جدید خطوط پر استوار کر کے اسے عوامی خواہشات کا ترجمان بنانا اور معاشرتی وانفرادی سطح پر ایک انقلاب آمیز تبدیلی لانا تھا۔

---

[۱] اومکار کول، مسعود سراج، اردو اصناف کی تدریس (نئی دہلی: قومی کونسل برائے اردو زبان، ۲۰۰۸) ۱۱۹

ترقی پسندوں نے طبقاتی نظام اور سرمایہ داری کی مخالفت کی کیونکہ تہذیبی وتمدنی سطح پر انحطاط وپستی کی کیفیت اسی نظام کی دین تھی ۔ان کی نزدیک اشترا کی نظام ہی انسانیت کی فلاح و بہبود کا ضامن تھا۔ترقی پسندوں کے پیشِ نظر یے کا مقصد بھی تھا کہ انگریزی سامراج کی ایک آواز ہوکر مخالفت کی جائے اور اقتصادی معاشی ومعاشرتی ، ، ناہمواریوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی جائے اور ادب کو سماج کے ساتھ جوڑ دیا جائے جن شعراء نے اپنی نظموں کے ذریعے اس مقصد کو فروغ دیا۔ان میں فیضؔ احمد فیضؔ ،مجازؔ ،ساحر لدھیانویؔ ، کیفی اعظمیؔ ،سردار جعفریؔ ،مخدومؔ ،سلام مچھلی شہری ، جان نثارؔ اختر ،اختر انصاریؔ ، نیازؔ حیدر ،علی جواد زیدیؔ ، پرویز شاہدیؔ ، جذبیؔ وغیرہ اہم ہیں ۔ان میں سے فیضؔ ،ساحرؔ اور مجازؔ کے یہاں رومانیت وحقیقت پسندی کا امتزاج دکھائی دیتا ہے ۔وہ بات تو رومانیت سے شروع کرتے تھے لیکن ان حقیقت پسندی پر ٹوٹتی تھی ۔مثال کے طور پر فیض احمد فیضؔ کا یہ شعر:

ے اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا

اقبالؔ کے بعد فیضؔ عہد جدید کے سب سے بڑے شاعر مانے جاتے ہیں۔اُن کا نام ترقی پسند شعراء میں بڑے احترام سے لیا جاتا ہے۔فیضؔ خالص ترقی پسند نظم گو شاعر ہیں ۔رومان کے راستے سے حقیقت کی طرف نکل آنے کا عمل اس کے یہاں واضح دکھائی دیتا ہے۔ان کی شاعری میں قدیم شعراء کا وزن اور فنکارانہ حسن بھی ملتا ہے اور نئی زندگی کی بے چینی کے ساتھ ساتھ انقلابی حوصلہ بھی ملتا ہے ۔وہ روایت سے اس قدر ہٹتے نظر آتے ہیں جتنا وہ اپنے خیالات کے اظہار کے لئے ضروری سمجھتے ہیں ۔وہ اپنا وقت تجربوں میں صرف نہیں کرتے بلکہ ان کی نظمیں جو بھی پڑھتا ہے۔اسے ایک دردانگیز، پُر اُمید اور طاقت اور جدت کا احساس ہوتا ہے۔وہ اپنے ذاتی غم کو کائناتی غم میں بدلنے کی سعی کرتے ہیں۔

اُن کی شاعری کی ابتداء اگر چہ رومانیت سے ہوئی لیکن جلد ہی ترقی پسندی کے اثرات نمایاں ہونے لگے "نقشِ فریادی جو ۱۹۴۱ء میں شائع ہوا تھا اس میں رومان سے حقیقت کی طرف آنے کی روش واضح ہے۔

''دستِ صبا'' دوسرا مجموعہ جو زندان کی تنہائیوں میں لکھا گیا۔''دست صبا'' کی اشاعت تقسیمِ ہند کے وقت عمل میں آئی اُس وقت ترقی پسندوں کا موضوع چونکہ ملکی آزادی تھا۔اس مجموعے میں فیضؔ نے بھی اپنے وطن سے والہانہ محبت کا اظہار کیا ہے اور اس بات کا برملا اظہار کیا ہے کہ آزادی کی خوابوں کی تعبیر بہت بھیا نک صورت میں سامنے آئی ہے۔انکی نظم ''صبح آزادی'' زبان زدعام ہوئی، تنہائی، صبح آزادی، مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ، بول کہ لب آزاد ہیں تیرے، نثار میں تیری گلیوں پہ، ہم جو مارے گئے تاریک راہوں میں ،شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں، شاہکار نظمیں ہیں جو ترقی پسندانہ جذبات و احساسات کی نمائندگی کرتی ہیں۔

ترقی پسندوں نے غزل کے بجائے نظم کو ہی اپنے اظہار کا وسیلہ بنایا۔ظاہر ہے کہ نظم کا دامن زندگی کی حقیقتوں کو سمیٹنے کی غزل کے مقابلے میں زیادہ صلاحیت رکھتا ہے اسی لئے ترقی پسند شعراء کی بدولت نظم کو زیادہ فروغ حاصل ہوا۔ملک آزادی کے بعد کئی دوسرے بڑے مسائل سے دوچار ہوا تو ترقی پسندوں نے اُن مسائل یعنی طبقاتی تفاوت، معاشرتی اور سیاسی مسائل کو بھی نظموں کا موضوع بنایا۔

بعض شعراء نے آزادی کے بعد ترقی پسندی سے انحراف بھی کیا لیکن اس انحراف سے نظم متاثر نہیں ہوئی بلکہ اس میں ہیئت اور موضوع کے اعتبار سے تجربے ہوتے رہے۔

ترقی پسندوں کے شانہ بہ شانہ اُردو ادب میں ایک اور تحریک فروغ رہی جسے حلقہ اربابِ ذوق کہا جاتا ہے ۔جنھوں نے ترقی پسندوں کی مخالفت کی انھوں نے خیال کی نسبت فن کی طرف زیادہ توجہ دی اور ہیتی اعتبار سے بھی نظم میں نئے تجربات کئے۔نظم معریٰ اور آزاد نظم کو فروغ دیا۔ آغاز میں جن شعراء نے نظم معریٰ اور آزاد نظم کو اپنے احساسات کے اظہار کا وسیلہ بنایا۔ان میں ن۔م۔راشدؔ، میراجیؔ اور تصدیق حسینؔ خالد کے نام لئے جا

سکتے ہیں بعد میں بہت سے شعراء نے آزاد اور پابند نظمیں لکھیں جن میں فیض احمد فیضؔ ،سردار جعفریؔ، مختار صدیقیؔ ، یوسف ظفرؔ، قیوم نظرؔ، اختر الایمانؔ، مجید امجدؔ وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

میرا جیؔ آزاد نظم کے سب سے بڑے معمار ہیں انھوں نے جدید اُردو نظم کو موضوع اور ہیئت دونوں اعتبار سے نئی وسعتوں سے ہمکنار کیا اور اردو نظم کو ذہنی ونفسیاتی تجربات کے اظہار کا وسیلہ بنایا۔ انیسویں صدی کی علامت نگاری اور فرائیڈ کے نظریات کے زیر اثر جنسی علامتیں ان کے ہاں زیادہ استعمال ہوئی ہیں۔ اس لئے فرائیڈ کے نظریات کی اشاعت وفروغ کے حوالے سے ہی ان کی شہرت ومقبولیت ہوئی ۔''لبِ جوئبار'' ''ایک شام کی کہانی'' ،'' دوسری عورت''، '' نا محرم''، '' دھوکا''، ''کٹھور''، ''مجھے گھر یاد آتا ہے''، ''سرسراہٹ''،'' نارسائی''،'' اندھا طوفان'' میں علامتوں کے ذریعے جنس کو ہی موضوع بنایا گیا ہے کئی علامتی نظموں میں ابہام پایا جاتا ہے اور وہ مشکل سے سمجھ میں آتی ہیں۔ مثلاً '' اندھا طوفان'' اور'' بعد کی اڑان'' کہی نظمیں علامتی ہونے کے باوجود اپنا مفہوم واضح کرتی ہیں۔ مثلاً ''اونچا مکان'' اور'' کلرک کی نغمہ محبت'' جیسی نظمیں قابلِ ذکر ہیں بلاشبہ وہ نئے دور کے نفسیاتی رجحان کے عکاس تھے۔ میرا جیؔ کا مطالعہ کافی وسیع تھا انھوں نے کئی یورپی شاعروں کی نمائندہ نظموں کے ترجمے بھی کیے۔

''دھوبی کا گھاٹ'' او''اجنتا کے غار'' میں شعور کی رو کی تکنیک استعمال کی گئی ہے۔ انھوں نے اپنی نظموں میں ''شعور کی رو کی تکنیک'' بھی استعمال کی ہے جن میں شاعری ذہن میں مختلف النوع خیالات ایک تواتر کے ساتھ ذہن کے پردے پر چلتے رہتے ہیں اور انفرادیت کے لحاظ سے اتنے اثر انگیز ہیں کہ قاری متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ غرض کہ میرا جیؔ نے موضوع اور ہیئت کے اعتبار سے جدید اردو نظم کا دامن وسیع کر دیا اور اپنے بعد آنے والے نظم نگاروں پر گہرے اثرات مرتب کئے۔ جدید اردو نظم کی ترقی کے لئے نئی راہیں استوار رکھنے میں میرا جیؔ ،فیضؔ اور ن۔م۔راشدؔ ایک خاص مقام رکھتے ہیں فیضؔ ترقی پسند گروہ سے تعلق رکھتے تھے

جبکہ میراجی اور راشد حلقہ سے وابستہ تھے میراجی اور راشد میں یہ بات مشترک ہے کہ دونوں نے اپنے خیالات کو ترسیل کیلئے آزاد نظم کو ہی منتخب کیا۔

اُردو نظم اور غیر معروضی نظم کے میدان میں راشد نے کافی تجربے کئے۔انھوں نے بیسویں صدی میں اردو نظم کو تصور، ہیئت اور اسلوب کی جدت کے اعتبار سے مغربی نظموں سے ہم آہنگ کرنے میں ایک نمایاں مقام حاصل کیا۔انھوں نے اپنی فنی بصیرت سے کام لے کر اردو نظم کو مغربی شاعری کی سطح پر لا کھڑا کر دیا۔راشد نے جدید اردو نظم کا ایک نیا معیار قائم کرنے میں یورپی نظم کے نمونوں کو سامنے رکھا ہے۔اور انھوں نے اس طرح اردو نظم کا نیا معیار قائم کرنے کی سعی کی ہے راشد کی ذہن وفکر پر ادب کے مطالعہ نے نئے تشکیلی اثرات مرتسم کیے۔انھیں شخصی تجربات کے اظہار کے لئے نئے شعری پیمانوں کی ضرورت محسوس ہوئی۔چنانچہ انھوں نے نظم آزاد کو اپنی شخصیت کے اظہار کا وسیلہ بنایا۔ یہ حقیقت ہے کہ غزل کے مقابلے میں راشد کا رجحان نظم کی طرف زیادہ ہے۔راشد کی شاعری دوسری جنگِ عظیم اور ہندوستان کی جدوجہد آزادی کے دوران پروان چڑھی۔اس لئے اُس دور کا سیاسی رجحان اور وہ رویے جو جنگ عظیم کے بعد انسانوں کا مقصد بنے اُن کی شاعری پر حاوی نظر آتے ہیں۔اُن کی شاعری میں قدرے اقبال کا رنگ بہت جھلکتا دکھائی دیتا ہے کیونکہ وہ بھی آزادی کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے۔ان کی شاعری کے موضوعات عشق،سیاست اور مذہب رہے ہیں۔انگریز حکمرانوں سے نفرت،انسان کی بے بسی ولاچاری،معاشی ومعاشرتی بدحالی کا شدید احساس اُن کی نظموں میں جلوہ گر ہے۔''ماوریٰ''اور'' ایران میں اجنبی'' انہی خیالات کی صدائے بازگشت ہیں اُن کے نزدیک پورے ایشیاء کی متحدہ جدو جہد ہی آزادی کی نقیب بن سکتی ہے۔من سلویٰ،میرے بھی ہیں کچھ خواب" میں اس قسم کے خیالات کا اظہار ملتا ہے۔

نفسیاتی الجھنیں اور ذہنی مایوسی کا ذکر''رقص'' ،''دریچے کے قریب''،''خودکشی''،''اجنبی عورت''،''نارسائی''،

صبا ویران'' میں ملتا ہے۔ اُن کی شاعری میں ایک طرف تو اساطیری دیو مالائی تہذیب کے نقوش ہیں دوسری طرف مشرقی تہذیبی عناصر بھی ہیں۔'' صحرا'' ، اور'' ریت'' کے تلازے بھی اُن کی نظموں میں عام استعمال ہوئے ہیں۔

''حسن کوزہ گر'' ،''ابولہب کی شادی''،'' اسرافیل کی موت''،''خودکشی''،''اجنبی عورت''،''صحرانورد پیر دل''،راشد کی نمائندہ نظمیں ہیں۔اوراُردونظم کے باب میں اہم اضافہ ہیں۔راشد کی ایک نظم''من سلویٰ'' نمونے کے طور پر پیش کی جاتی ہےاس سے راشد کی نظم کا موضوع اسلوب اور رجحان سمجھنے میں مدد ملے گی۔

بس ایک زنجیر
ایک ہی آہنی کمند عظیم
پھیلی ہوئی ہے
مشرق کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک
میرے وطن سے تیرے وطن تک
بس ایک ہی عنکبوت کا جال کہ جس میں
ہم ایشیائی اسیر ہوکر تڑپ رہے ہیں [۱]

جدید اُردو نظم کو فن و معنی کے لحاظ سے وسعت عطا کرنے میں ایک اوراہم نام اختر الایمان کا ہے ان کے یہاں فیض اور راشد کی طرح سماجی اور معاشرتی مسائل سے گہری دلچسپی ہے۔ان کی فکری توجہ کا مرکز زندگی کی بدلتی ہوئی قدریں ہیں۔اختر الایمان کے غم میں زیاں کا ایک گہرا احساس شامل ہے۔اختر الایمان کی نظمیں اس کیفیت کی عکاس ہیں فیصلہ،مسجد، پرانی فیصل،تنہائی میں ، جواری، پگڈنڈی،تعمیر، واپسی، دستک،شکوہ اور یاد

۱۔ عقیل احمد صدیقی، جدید اُردو نظم کا نظریہ عمل (علی گڑھ،ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاوس،۱۹۹۷)۲۰۲

میں اس سلسلے کی نمائندہ نظمیں ہیں ۔اختر ایمان نے کمزور نظمیں لکھیں لیکن ان کی کامیاب فکری اور فنی عظمت کے چند کے چند نئے گوشے روشن کرتی ہیں ۔خاص طور پر ان کی یہ نظمیں دست ، یادیں اور ایک لڑکا ،فکری عمق ، ایمائی اثر آفرینی اور اسلوب کی انفرادیت کے اعتبار سے جدید نظموں میں منفرد مقام رکھتی ہیں ۔اختر الایمان نے جس دور میں ایک الگ شاعر کی حیثیت سے اپنی پہچان کرائی ۔اُس وقت کے جدید شعراء دو الگ الگ ادبی گروہوں سے وابستہ تھے ۔لیکن اختر الایمان نے ان دنوں سے الگ رہ بھی ہر دور سے تعلق رکھا اور اپنا ایک انفرادی رنگ برقرار رکھا ۔ان کے ہاں نظموں کا بہت گہرا اور واضح شعور موجود ہے اُن کی نظمیں فکر و خیال ،ندرت وجدت کے باعث جدید آہنگ لئے ہوئے ہیں ان کے یہاں ہمیں معریٰ نظمیں زیادہ دکھائی دیتی ہیں ان کی نظموں کی بنیادی موضوع معاصر انسان سے مایوسی ،،فریب ،،دل شکستگی ،وقت کا تصور ،بین الاقوامی سطح پر مختلف ممالک کا آپسی انتشار اور اُس سے پیدا ہونے والے مسائل ہیں ۔اُن کے ہاں اعلیٰ انسان قدروں کے زوال کا گہرا احساس پایا جاتا ہے ۔ انھوں نے زندگی کو اقدار کے حوالے سے دیکھنے سوچنے اور سمجھنے کی کوشش کی ہے ۔اُن کی اپنی زندگی کے تلخ تجربات وحادثات کا اظہار بھی ملتا ہے ۔مثال کے طور پر " نیند سے پہلے ،محرومی ، وداع ، فیصلہ ،تھکن ،جیسی نظموں میں مایوسی اور افسردگی کا احساس پایا جاتا ہے ۔اکثر و بیشتر نظمیں علامتی شاعری کی واضح مثال ہیں ۔مسجد ، پرانی فیصل ، جواری ،اور پگڈنڈی ،علامتی اسلوب لئے ہوئے ہیں ۔لیکن ان تمام کے باوصف وہ زندگی سے خفا نہیں بلکہ ان تلخ حادثات کو زندگی کے روشن حقائق کی طرح تسلیم کرتے ہیں ۔نمونے کے طور پر اختر الایمان کی نظم ''ایک لڑکا'' سے ایک بند :

مجھے ایک لڑکا جیسے تند چشموں کا رواں پانی
نظر آتا ہے یوں لگتا ہے جیسے اِک بلائے جان
مرا ہم زاد ہے ہر گام پر ہر موڑ پر جولاں

اُسے ہم راہ پاتا ہوں یہ سائے کی طرح میرا
تعاقب کر رہا ہے جیسے میں مفرور ملزم ہوں
یہ مجھ سے پوچھتا ہے اخترالایمان تم ہی ہو

اس نظم کا بنیادی موضوع اس لڑکے کی اندرونی کشمکش ہے یہ علامتی نظم ہے اس میں نئی اور پُرانی علامتوں کا امتزاج ملتا ہے ملک کی تقسیم کے کچھ عرصہ تک اُردو شعر و ادب پر ترقی پسندی کے رجحانات چھائے رہے۔لیکن ۱۹۵۸ء تک پہنچتے ہوئے اِن کی جگہ نئے رجحانات نے لے لی جنھیں جدیدیت کا نام دیا گیا۔جدیدیت کا یہ دور پچیس سال کے عرصے پر محیط رہا۔ یہ دور نئی نظم کا دور مانا جاتا ہے جو فرد کی تنہائی اور بیچاری پر منتج ہے جس میں شعراء نے ذات سے کائنات تک کا سفر کیا۔اِس دور کی نظموں میں ذاتی اور نئی علامتوں کا استعمال کیا گیا ہے جن کی وجہ سے شاعری میں ابہام اور ترسیل جیسے مسائل پیدا ہوئے۔نظموں کی تفہیم کے لیے تحلیل نفسی ،معروضی تلازمات کو بروئے کار لانے کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔جدیدیت کی علمبرداروں میں چند ایک نام اس طرح سے ہیں۔وزیر آغا،بلراج کومل،کمار پاشی،عمیق حنفی،ساقی فاروقی،مخمور سعیدی، جیلانی کامرانی، عادل منصوری۔افتخار جالب،محمد علوی،شہریار، زاہد فاروق،اور فاروق حسن شامل ہیں۔ساتویں دہائی تک جدیدیت اپنے عروج پر پہنچ چکی ہیں ۔ایسے میں جدیدیت کے روبہ زوال تو نہیں ہوئی لیکن اس میں مزید توسیع پیدا ہوئی جو اس دہائی میں جدیدیت کے ساتھ مساوی سفر کرتی ہیں۔جو صلاح الدین پرویز اور بعض دوسرے شعراء کی نظموں میں نظر آتی ہے۔

ساتویں دہائی کے بعد آٹھویں دہائی کی نظم میں مابعد جدیدیت کے آثار واضح طور پر نظر آتے ہیں۔اس دور کی نظم محض ہیتی تجربوں کا نام نہیں بلکہ اُن احساسات سے عبارت ہے جن میں آج کے دور کا انسان الجھا ہوا ہے ۔دنیا جہاں ترقی کے بامِ عروج پر ہے وہاں انسان کے مسائل اور زندگی کی پیچیدگیوں میں اضافہ ہوا ہے۔اِن

حالات و مسائل نے شعراء کے اُن افکار کو جنم دیا جنھیں مابعد جدیدیت کا نام دیا گیا۔اب شاعری صرف ذات سے کائنات کا سفر نہیں بلکہ آٹھویں دہائی کی نظم کا موضوع تنہائی، رشتوں، قدروں اور احساسات کی شکست وریخت کا نام ہے۔جبکہ اس دور کی نظم میں داخلیت کے ساتھ ساتھ خارجیت کا امتزاج بھی ہے زندگی کے مثبت رویے بھی ہیں اور ابہام کے ساتھ ساتھ صراحت بھی ہے۔اس اصطلاح کے تحت جن شعراء نے نظمیں لکھیں ان میں فاروق نازکی، شاہد ماہلی، مظفر ایرج، شین کاف نظام، پرتپال سنگھ بیتاب، خلیل مامون عبدالاحد ساز، ڈاکٹر صادق شامل ہیں۔شائستہ یوسف کی نظم ''سمندر اور میں'' خالد جاوید کی نظم ''وعدہ'' حمیرارحمٰن کی ''دھنک''، نصیر احمد ناصر کی ''کھڑکیاں''، معراج راعنا کی ''نیند''، سلیم شہزادہ کی ''گرتے پتوں پہ لکھی نظم میرے شبد''، خالد سعید کی ''پیاسِ آشفتہ'' اسی رجحان کی عکاسی کرتی ہیں۔بقول حامدی کشمیری:

''نئی نظمیں مختلف النوع تجربات مثلاً محرومی، آرزو، جنسیت، انسانی روابط، بدنی لزت، فطرت اور ثقافت سے تجدید رشتگی، خود نگری اور تلاش وجستجو کے رنگوں سے روشن ہیں۔'' [۱]

اس دور کا شاعر فطری طور پر آزاد ہے اور کھلی آنکھوں سے باہر کی دنیا کا نظارہ کر رہا ہے۔اپنی بات کو ہر انداز میں کہنے کا حوصلہ رکھتا ہے یہی وجہ ہے کہ آج کا شاعر اپنے تجربات واحساسات کا اظہار پابند نظم، نظم معریٰ اور آزاد نظم کے ساتھ ساتھ نثری نظم میں کر رہا ہے۔

۱۹۸۰ء کے بعد شعراء نے دنیا کو درپیش مسائل سے متاثر ہو کر نظمیں لکھیں جن میں بے روزگاری دنگے فسادات انتہا پسندی، ایودھیا کا سانحہ، بے وطنی وہجرت کا کرب جیسے موضوع عام ہیں۔پچھلی تین چار دہائیوں

۱۔ کشمیری حامدی۔جدید اردو نظم اور یورپی اثرات (نئی دہلی) ایس ایچ آفیسٹ پرنٹرز، ۲۰۱۰ء ۵۱۷

سے خواتین شاعرات نے اُردو شاعری کے میدان میں بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔ جنھوں نے تانیثی شاعری کے حوالے سے اپنی الگ شناخت بنائی اور اُردو نظم کے باب میں موضوعات کے اعتبار سے کچھ اضافے کئے ہیں جو ہمیں عام طور پر مرد شعراء کے یہاں نظر نہیں آتے ہیں ۔موضوعات کے ساتھ ساتھ لب و لہجے میں بھی ان خواتین شاعرات کے یہاں تبدیلی کا احساس پایا جاتا ہے۔اس ضمن میں اگر چہ بہت سے نام گنوائے جاسکتے ہیں لیکن یہاں اختصار کے پیشِ نظر صرف چند ایک کا ذکر کیا جائے گا۔

اِن میں شفیق فاطمہ شعریٰ، اداجعفریؔ، فہمیدہ ریاضؔ، ساجدہ زیدیؔ، زاہدؔہ زیدی، کشور ناہیدؔ اور پروینؔ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ان شاعرات نے اپنے منفرد طرزِ فکر، مخصوص لب و لہجے اور اسلوب کی بنا پر اُردو شاعری کو تانیثی شاعری سے مالا مال کیا۔اُن کے یہاں غزلوں کے ساتھ ساتھ کامیاب نظموں کے تجربے دکھائی دیتے ہیں بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ اُن کا غالب رجحان نظموں ہی کی طرف ہے بلاشبہ یہ نظمیں نسوانی بیداری کی نئی حیثیت سے عبارت ہیں جن میں عورت کی حیثیت اُس کی ذہنی و نفسیاتی پیچیدگیوں، آرزوؤں اور ارمانوں کو موضوع بنایا گیا ہے۔ان شاعرات کے ہاں گھر آنگن کی زندگی کی گہما گہمی کے ساتھ ساتھ اس موضوع کے اظہار کے لیے علامتیں اور استعارے بھی وضع کئے گئے ہیں یعنی نسوانی علامتوں کا التزام پایا جاتا ہے۔

اِس سلسلے میں شفیق فاطمہ شعریٰ ایک اہم کڑی کے طور پر جانی جاتی ہیں اُن کے یہاں موجودہ عہد کی شعری روایت کے ساتھ ساتھ دورِ جدید کے تجربات اور ایک عورت کے مسائل کا احساس بھی خاص طور سے نمایاں ہے وہ چونکہ ایک مذہبی گھرانے سے تعلق رکھتی ہیں اُن کی ذہنی نشونما میں اسلامی تعلیمات کا کافی گہرا اثر ہے جو اُن کی شاعری سے مترشح ہے۔اُن کے یہاں اکثر تلمیحات اسلامیات سے اخذ کی ہوئی ہیں۔اُن کی نظموں میں بھی بااحتجاج کی فراوانی ہے۔لیکن یہ کیفیات اُس احتجاج سے مختلف ہیں۔جو "نسائی تحریک" کی دین ہے۔مثلاً ایک نظم ''گلۂ صفورہ'' کا موضوع قرآنی قصے سے ماخوذ ہے جس میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے۔کہ آج بھی

عورت کو اُس کا جائز مقام و مرتبہ نہیں مل سکا اسی قسم کی ایک اور نظم "سیتا اور صفورہ " ہے اِس میں دو پُرانے کردار آج کی عورت کے استعارے کے طور پر استعمال ہوئے ہیں اِسی طرح کی کئی نظموں میں احتجاجی لے اور نسائی احساس کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔''زوالِ عہدِ تمنا''، ''بازگشت''، ''تتلی کی پرواز''، ''چراغ تہہ داماں '' ''یادنگر صدب صحرا''، جیسی نظمیں کلاسیکی مزاج رکھتے ہوئے فکر وفن کے لحاظ سے نیا تجربہ ہیں۔

یہ بات واضح رہے کہ جدید اُردو شاعری کے حوالے سے اُردو شاعرات میں محترمہ ادا جعفری صاحبہ کو خاتون اول کی حیثیت حاصل ہے ۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے پہلی دفعہ صیغہ تانیث استعمال کرتے ہوئے اپنے جذبات واحساسات کا اظہار کیا اس طرح تانیثی شاعری کو جدید تجربات و رجحانات سے ہم آہنگ کر کے ایک نئی شان اور وقار عطا کیا جب کہ اُس دور میں اِس طرح کی پہلی آواز تھی جس نے خواتین کے حوالے سے شاعری کے لئے نئی سوچ کے دریچے وا کر دئے ۔اِس کے علاوہ ان کی شاعری کا بنیادی وصف فکر واسلوب کی جدت بھی ہے ان کی شاعری صرف اظہار ذات نہیں بلکہ اظہار کائنات بھی ہے اور خواتین کے اندرونی احساسات کی عکاسی بھی ہے یہی وجہ ہے ادا جعفری کی شاعری نے بعد میں آنے والی شاعرات پر گہرے اثرات مرتسم کئے ہیں ۔اُن کے بنائے ہوئے راستے پر باقیوں کے لیے چلنا پہلے دشوار تھا بلکہ آسان ہو گیا انھوں نے اپنے محسوسات کے اظہار کے لیے غزل سے زیادہ نظم کو پسند کیا پہلا شعری تجربہ جس سے ان کی پہچان ہوئی ''میں ساز ڈھونڈتی رہی '' کی شکل میں منظرِ عام پر آیا اِس کے بعد ''شہر درد'' تیسرا ''غزالاں تم تو واقف ہو'' چوتھا ''سازِ سخن ایک بہانہ ہے'' کی صورت میں یکے بعد دیگرے آتے گئے ۔اُن کی شاعری میں لطافت کے ساتھ سوز وگزار بھی ہے باقیوں کی نسبت پروین شاکر کی شاعری پر ادا کے اثرات نمایاں ہیں۔

پاکستانی شاعرات کے میدان میں مرد شعراء سے معیار و مقدار کے اعتبار سے بہت آگے ہیں۔شاعری میں پاکستانی شاعرات کی طویل فہرست میں فہمیدہ ریاض ایک معتبر حیثیت کی مالک ہیں اُن کی شاعری غزلوں سے زیادہ نظموں پر مشتمل ہے۔انھوں نے سب سے پہلے عورت کی نفسیات کو شاعری کا موضوع بنایا۔عورت کے خیالات واحساسات کو شعری پیکر عطا کر کے خواتین شاعرات میں نمایاں مقام حاصل کرلیا۔انھوں نے جو کچھ بھی کہا وہ ڈھکے چھپے لفظوں میں نہیں ہے بلکہ بہت واضح اور دوٹوک انداز میں کیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ خواتین کے جذبات واحساسات کے اظہار میں بے با کی و بے حجابی کے لحاظ سے وہ پہلے نمبر پر ہیں اُن کی شاعری ایک ایسی باغی عورت کی نمائندگی کرتی ہے ۔ جس نے معاشرے کی استحصالی اقدار کو ماننے سے انکار کر دیا ہے جسے وہ چپ چاپ صدیوں سے سہتیلی چلی آرہی تھی۔فہمیدہ ریاض ہمیشہ عورت کے مساویانہ حقوق کے لیے کوشاں ہیں اس کے علاوہ انھوں نے مرد عورت کی تقسیم کوتوڑ کر ایک انسانی شخصیت کے حوالے سے بھی اپنی دھوپ" منظرِعام پرآئے۔اُن کی اکثر نظموں میں بلند وبانگ لہجے میں مردِاساس معاشرے پر طنز کیا گیا ہے نمونے کے طور پر ایک نظم پیش کی جاتی ہے جس کا کردار ''حرم سرائی'' تہذیب کی نمائندگی کرتا ہے جس کے جنگل میں عورت بے بس و مجبور پھڑ پھڑا رہی ہے۔

یہ لونڈیاں ہیں ،

کہ یرغمالی، حلال شب بھر رہیں، دمِ صبح در بدر ہیں

یہ باندیاں ہیں

جناب کے نطفۂ مبارک کے نصف ورثے سے معتبر ہیں

یہ بیبیاں ہیں

کہ زوجگی کا خراج دینے، قطار اندر قطار باری کی منتظر ہیں

یہ بچیاں ہیں
کہ جن کے سر پر پھرا جو حضرت کا دستِ شفقت
تو کمسنی کے لہو سے ریش سپید رنگین ہو گئی ہے
حضور کے حجلہ معطر میں زندگی خون رو گئی ہے ۱

فہمیدہ ریاض نے ایک شادی شدہ عورت کے نازک ترین احساسات کو پہلی بار صفحہ قرطاس کی زینت بنایا ہے۔ وہ ایسی عورت کی نمائندگی کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں جو ہر لحاظ سے آسودہ، مطمئن اور مکمل زندگی گزار رہی ہے ''لاؤ ہاتھ اپنا لاؤ ذرا'' میں انھی خیالات کی نمائندگی ملتی ہے۔

لاؤ ہاتھ اپنا لاؤ ذرا
چھو کے میرا بدن
اپنے بچے کی دل کا دھڑکنا سنو
ناف کے اُس طرف
اس کی جنبش کو محسوس کرتے ہو تم؟ فہمیدہ ریاض ۲

جدید اردو شاعری کا دامن رنگا رنگ موضوعات نت نئے تجربات و مشاہدات سے مالا مال کرنے والی ہستی ساجدہ زیدی ہیں جنھوں نے اقدار کی شکست و ریخت کو شاعری کا موضوع بنایا ہے۔

اُن کے نظموں کی تعداد بھی بہت زیادہ ہے اُن کے ہاں فلسفہ وجودیت کا کافی اثر ہے ہستی و نیستی سے

---

۱ ڈاکٹر عتیق اللہ خواتین کی نظموں میں فکر کے اسالیب مشمولہ بیسویں صدی میں خواتین اردو ادب، (نئی دہلی، ایجوکیشنل) ۱۷۳
۲ ڈاکٹر عتیق اللہ، بیسویں صدی میں خواتین اردو ادب (نئی دہلی: ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاوس) ۱۸۱

متعلق سوالات اُن کی نظموں میں اُبھرتے ہیں ''شبِ چراغ''، ''ادراک کا یہ لمحہ مختصر''، ''سمندر کے سینے کے خاموش اسرار''، ''آتشِ سیال''، ''رقص دردِ دیگر'' وغیرہ اُن کی نظمیں مانی جاتی ہیں جو داخلیت و خارجیت کا حسین امتزاج ہیں ساجدہ زیدیؔ کی شاعری عورت کی تیئں سماج کا رویہ عورت کے استحصال، سیاست و مادیت وغیرہ جیسے موضوعات سے عبارت ہے۔

اِسی سلسلے کی ایک اور اہم کڑی زاہدہ زیدیؔ ہیں جن کی شاعری جدیدیت کی تحریک کے اس پاس یعنی ۱۹۷۰ء کے دہائی کے دوران پروان چڑھی۔ چونکہ اُس دور میں شاعری میں داخلیت کا رجحان بڑھتا جارہا تھا اس لئے زاہدہؔ کی شاعری انہی خیالات وواقعات کا آئینہ ہے اس میں احساس زیاں ہے جو مٹتی ہوئی قدروں کا پیش خیمہ ہے۔ اظہارِ ذات بھی ہے اُن کی شعری کائنات دونوں رنگوں سے عبارت ہے جس میں خوشیاں بھی ہیں اور غم بھی ہیں۔ دیگر خواتین شاعرات کی طرح باغیانہ رویہ نہیں ہے۔ اُن کی نظموں میں ایہام بھی ہے اور جدیدیت کی گہری چھاپ بھی۔

مرداساس معاشرے میں عورت کے وجود کی اہمیت منوانے، سماجی دباؤ، استحصال اور مساویانہ حقوق کے لیے جدوجہد میں بہت سی خواتین شاعرات کا اہم حصہ ہے انھوں نے کم وبیش تقریباً ایک ہی جیسے رویے کا اظہار کیا ہے۔ لیکن اظہار کے طریقے کی نوعتیں اور پیمانے کچھ الگ طرز کے ہیں۔ ہر کسی کے اظہار کا اپنا منفرد طریقہ ہے۔ اس سلسلے میں اک بلند آواز تانیثی تحریک کی زبردست علمبردار اور حامی کشورؔ ناہید کی ہے۔ جنھیں کسی نے جھانسی کی رانی کہا تو کسی نے پھولن دیوی، اردو شاعرات کی صف میں باغی شاعرہ بھی کہی جاتی ہیں۔ کیونکہ وہ بلند و بانگ لہجے میں اپنے عورت ہونے کا اعلان تو کرتی ہیں۔ لیکن اُن کی بندشوں یا پابندیوں کو ماننے سے انکار کرتی ہیں۔ جو ایک مشرقی معاشرہ صنفِ نازک ہونے کے ناطے عورت پر عائد کرتا ہے وہ ایک ایسی عورت کی نمائندگی کرتی ہیں جو اپنا آپ منوانا جانتی ہے جو اپنے حقوق کے حصول کے لیے لڑنے مرنے کو تیار

رہتی ہے۔ تانیثی تحریک کا اثر اُن کی شاعری سے منعکس ہوتا ہے۔اُن کی شاعری کا موضوع عورت کے جذبات واحساسات کے بیان کے ساتھ عورت کے مسائل بھی بنے ہیں۔اُن کے ہاں آج کی جدید عورت کے مسائل ہیں جو باشعور ہوئے ہیں اپنی زندگی کے تلخ تجربات و حقائق سے دو بدور ہتی ہیں ۔ ''جارورب کش''،''گھاس تو مجھ جیسی ہے''،'' نیلام گھر''،''تم سے''،''ترائسیا شہر بھنبھوڑ''،''آبِ خشک اورآگ''،''فادر کمپلکس''،''کتنی چاہت والے لوگ تیرے دیوانے''،''اس کا تب تقدیر لکھ''،''میں کون ہوں''،''اینٹی کلاک وائز'' جیسی نظمیں کشور ناہید کے فکروفن کی نمائندگی کرتی ہیں۔مغرب کی جدید نظموں کے تجربے بھی انھوں نے کیے ہیں۔

اُن کی نظموں کا بلند و باہنگ لہجہ تانیثیت پسند شاعرہ کی حیثیت سے اُن کی نظریاتی وابستگی کی شدت اور وحدت کو ظاہر کرتا ہے۔انھوں نے تانیثی فکر کے اظہار کے لیے دو قسم کے اسلوب منتخب کئے ہیں۔ایک اسلوب نثری نظموں کا ہے۔دوسرا آزاد نظموں پر مشتمل ہے جس میں الفاظ،علامتیں اور فنی لوازمات کا کچھ اِس طرح سے اہتمام کیا گیا ہے۔کہ جو انہیں نہ صرف تانیثیت پسند شاعرہ بلکہ ایک قابلِ توجہ شاعرہ کی حیثیت سے ان کی اہمیت منوانے کے لیے ثبوت فراہم کرتا ہے۔فہمیدہ ریاض کے مقابلے میں کشور ناہید نے نہ صرف تانیثیت پسند شاعرہ کی حیثیت سے فکری وفنی لحاظ سے اپنی شناخت بنالی اوراپنی ہم عصر شاعرات سے آگے بڑھ گئیں۔ چاہے نثر ہو یا نظم تانیثی تحریک کو اُس کے لوازمات کے ساتھ برتنے کا سلیقہ رکھتی ہیں۔کشور ناہید کی شاعری میں عورت کے ساتھ روا رکھے گئے رویئے کے نتیجے میں مراد جارہ داری والے معاشرے کے خالف شدید ردِعمل کا اظہار ملتا ہے جس میں فکری بغاوت کے ساتھ وہ شعریت کے حسن کو بھی ملحوظ رکھتی ہیں۔

بیشک تانیثی تحریک کی نمائندہ شاعرات میں کشور ناہید اور فہمیدہ ریاض ایک معتبر حیثیت رکھتی ہیں۔اِن کی گونج بعد کی شاعرات کے لب و لہجے میں کسی نہ کسی حد تک سنائی دیتی ہے۔

۱۹۶۰ـ۷۰ء کے آس پاس نمایاں ہونے والی اُردو شاعرات کے موجودہ منظر نامے میں پروینؔ شاکر خواتین کی نئی نسل کی نمائندہ بن کر ابھریں جنھوں نے موضوعات کی رنگارنگی، اسلوب و تجربات کی ندرت اور نسائی جذبوں کو اپنے مخصوص لب و لہجے میں شاعرانہ پیکر عطا کر کے تانیثی شاعری میں ایک امتیاز حاصل کیا۔ اُن کی ہم عصر شاعرات کے بیان میں بے باکانہ انداز و لہجہ کے یہاں دکھائی تو دیتا ہے لیکن بہت کم۔ بعض کے یہاں تو مرد عورت کی تقسیم ہی ختم کر دی گئی ہے۔ جس طرح کہ فہمیدؔہ ریاض ہیں۔ پروینؔ شاکر کو یہ فوقیت حاصل ہے کہ انھوں نے نہ صرف اپنے عورت ہونے پر فخر کیا بلکہ عورت سے وابستہ محسوسات کا برملا اظہار کیا۔ اُردو کے مشہور نقاد اور محقق ڈاکٹر گوپی چند نارنگ پروینؔ شاکر کی شاعری سے متعلق اپنی رائے کا یوں اظہار کرتے ہیں۔

> ''پروینؔ شاکر اُردو کی ایسی خوش اظہار، خوش کلام اور خوش ادا
> شاعرہ تھیں۔ جن کے بغیر جدید شاعری کا منظر نامہ ادھورا ہے۔
> پروینؔ شاکر کو نظم اور غزل پر یکساں قدرت حاصل تھی جن نسائی
> آوازوں نے اردو میں ایک الگ پہچان قائم کی تھی وہ اُن میں
> سے خاص تھیں۔ اُن کا کارنامہ یہ ہے کہ نسائیت کے گہرے اور
> پراوئیٹ جزبات کو نہایت خوش سلیقی سے شعری اظہار تک لے آتی ہیں۔
> اُن کے لہجے میں ایک خاص طرح کا رچاؤ، غنائیت اور بانکپن ہے
> ایک فطری بانکپن اور نکھار اور اجلی اجلی رنگت جو صبح کھلنے والے پھول
> میں ہوتی ہے۔ اپنے رنگ و روپ میں ڈوبا ہوا اور اپنے حسن پر نازاں'' [۱]

---

[۱] ماہنامہ آجکل (نئی دہلی: پبلی کیشنز پٹالیہ ہاوس، مارچ ۱۹۹۵)ء : ۴۶

پروین شاکر کی شعری کائنات غزل اور نظم دونوں اصناف سے عبارت ہے اگر انھوں نے ایک طرف اپنے خیالات کو غزلوں کو پیراہن دیا ہے تو دوسری طرف اپنی فکر کو نظموں کے سانچے میں ڈھال کر شہرِ سخن کو جلا بخشی ہے۔ پروین شاکر کے پانچوں شعری مجموعے جواب تک منظر عام پر آ چکے ہیں۔ اُن میں غزلوں کی نسبت نظموں کی تعداد کافی ہے۔ نظمیں لکھنے سے انہیں کافی دلچسپی رہی ہے اور اس میں وہ کامیاب بھی رہی ہیں انھوں نے اپنی سوچ اور فکر کو نظموں میں زیادہ واضح اور بہتر طریقے سے اُجاگر کیا ہے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اُن کی شہرت نظموں کی بہ نسبت غزلوں کی وجہ سے ہوئی ہے لیکن جب اُن کی پانچوں شعری مجموعوں میں شامل نظموں کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات واضح ہوتی ہے وہ غزلوں کی نسبت انہی نظموں میں زیادہ پُر وقار، سنجیدہ اور مقدس نظر آتی ہیں اور ایسا بھی نہیں ہے کہ وہ غزل کے کمرے سے نکل کر نظم کے صحن میں داخل ہوتی ہیں جس طرح کے نظیر صدیقی اور دیگر لوگوں کا کہنا ہے۔ اگر چہ کئی نظمیں جن میں وہ بے باک نظر آتی ہیں اور کچھ موضوعات جو غزلوں میں بیان ہوئے ہیں۔ وہ نظموں میں بھی دہرائے گئے ہیں۔ لیکن پھر بھی سنجیدہ نظموں کی تعداد زیادہ ہے اس طرح اُن کی نظموں کا لہجہ غزلوں سے کافی حد تک مختلف ہے اُن کی غزلوں میں جو آزاد خیالی ہے وہ نظموں میں نہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انہیں بھی غالب کی طرح غزل کی تنگ دامنی کی شکایت رہی ہے۔ نظموں میں چونکہ غزل کی نسبت براہِ راست اظہار کو وصف پایا جاتا ہے اور میرے خیال سے نسائی رویوں کے اظہار کے لیے نظم ہی بہترین صنف ہے جہاں تک نظموں کی ہیئت کا تعلق ہے انھوں نے پابند، آزاد اور معریٰ نظم میں اپنے خیالات کا اظہار و ابلاغ کیا ہے اور نثری نظمیں بھی پائی جاتی ہیں لیکن اُن کے یہاں سب سے زیادہ آزاد نظمیں ہیں۔ جن میں انھوں نے اپنے تجربات و مشاہدات کا اظہار بیانیہ اور کہانی کے رنگ میں کیا ہے۔

چونکہ اس باب کا دوسرا حصہ پروین شاکر کی نظمیہ شاعری کے حوالے سے ہے۔ اس میں پانچوں مجموعوں

میں شامل نظموں کا جائزہ لیا جائے گا۔ان نظموں کی اچھی خاصی تعداد پائی جاتی ہے۔اس لیے اِن میں نمائندہ نظموں کا انتخاب بھی بہت مشکل کام ہے اوران تمام نظموں کا فرداً فرداً جائزہ لینا بھی کوئی آسان کام نہیں۔اس لئے میں نے اس باب میں مجموعی طور پران کی نظموں کا جائزہ لینے کی کوشش کی ہے۔

پروین شاکرا گرچہ اردو شاعری کی حیثیت سے ملکی وغیر ملکی سطح پر جانی جاتی ہیں۔لیکن انہیں انگریزی پر بھی کافی دسترس حاصل تھی۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے انگریزی ادب میں ایم۔اے کی ڈگری حاصل کی تھی اور اپنی پیشہ ورانہ زندگی کا آغاز بھی انگلش لیکچرر کی حیثیت سے کیا تھا۔ایسا لگتا ہے کہ وہ انگریزی شاعری سے متاثر رہی ہیں خاص طور پر انگریزی شاعر ڈن سے،اُن کے یہاں اکثر و بیشتر انگریزی طرز کی نظمیں موجود ہیں بعض نظموں کے عنوان بھی انگریزی میں ہیں۔جس طرح کی ویسٹ لینڈ،ٹماٹوکیچ اپ،نک نیم،مسفٹ،کتھارس ، Good to see you, Hot line ،وینٹی دی نیم۔از۔انگریزی کے علاوہ فارسی،عربی اور کہیں کہیں ہندی کے الفاظ بھی اُن کی نظموں کی زینت بنے ہیں جو اُن کی تحریر کے حسن کو دو بالا کرتے ہیں۔ایسی مثالیں ہماری اردو شاعری میں بہت کم ملیں گی۔ اُن کی نظمیں اسلوب اور خیالات کے اعتبار سے جدید ہونے کے ساتھ ساتھ منفرد ہیں۔انھوں نے مغربی جدیدیت کے رنگ میں رنگنے کی کوشش کبھی نہیں کی بلکہ اُن کے اسلوب کی جڑیں اُن کی اپنی ذات اور اُن کے ماحول سے وابستہ ہیں۔انھوں نے جو بھی لکھا اپنے ذہن اور روح کے تقاضوں کے مطابق لکھا۔ اُن کی نظمیں موضوعات کے اعتبار سے بھی متنوع اور رنگارنگ ہیں۔گہرائی سے دیکھا جائے تو اُن کی نظمیں تخلیقیت پسندی،تاثیر آفرینی اور عصری حیثیت،سیاسی وسماجی شعور اور ادراک جیسی خصوصیات سے مالا مال ہیں۔

اُردو زبان کے معروف استاد اور محقق ڈاکٹر ابوالخیر کشفی نے پروین شاکر کی نظم نگاری کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے:

''پروین شاکر کی بیشتر نظمیں اُس کی اپنی ذات، اُس کے محبوب اور اُس کی
پھیلی ہوئی کائنات کا مطالعہ تذکرہ اور صحیفہ ہیں۔ ان کی نظموں میں بے حد
پھیلاؤ اور بے حد ارتکاز ہے۔ یہ یکجائی آپ کو آسانی سے کسی اور جدید فن کار
کے ہاں نہیں ملے گی'' ۔[۱]

پروین شاکر کی تمام نظمیں تقریباً غیر معمولی ہیں ۔ پروین نے ان میں اپنے جزبات و محسوسات، تجربات و مشاہدات کو قلمبند کیا ہے۔ ان کی نظموں کا موضوع کئی مشہور ہستیاں بھی بنی ہیں۔ اُن کے یہاں بہت زیادہ طویل نظمیں نہیں ہیں۔ جبکہ اکثر نظمیں ڈرامائی اور افسانوئی طرز پر ہیں۔ جن میں کوئی فکر وخیال نظم کا عنوان بنا ہے یعنی آغاز بھی ہے اور اختتام بھی۔ پوری نظم پڑھنے کے بعد ہی قاری پر نظم کے مفاہیم اُجاگر ہوتے ہیں۔ جو شروع سے تو طربیہ انداز میں ہوتی ہیں۔ لیکن اُن کا اختتام کامیڈی یا المیہ پر منتج ہوتا ہے۔ اب ہم پروین شاکر کے پہلے مجموعے ''خوشبو'' کی طرف آتے ہیں ''خوشبو'' اُن کے اُس دور کے کلام پر مشتمل ہے جب وہ نوعمر تھیں اور اُن کے شعور میں ابھی پختگی نہیں آئی تھی۔ اس لئے خوشبو کسی حد تک اُن تلخ حادثات سے معرّیٰ ہے جو ''صد برگ'' اور خود کلامی'' کا جوہر ہے۔ اگر چہ یہ ابتدائی نظمیں ہیں لیکن اس کے باوجود اُن کے پختہ شعور کا پتہ دیتی ہیں۔ زبان و بیان کے لحاظ سے بھی پختگی اور فنی ہنر مندی کا احساس نمایاں ہے۔ خود لکھتی ہیں۔

''خوشبو کی اشاعت میری پندرہ برس سے پچیس برس کے دوران کی شاعری ہے
بعد میں آنے والے مجموعے ایک مختلف نوعیت کے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس دوران

۱؎ آغا مسعود حسین، مضمون اک خوشبو تھی جو اُڑ گئی، مشمولہ 'خوشبو پھول تحریر کرتی ہے''، مرتبہ: ڈاکٹر سلطانہ بخش (اسلام آباد ،لفظ لوگ پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء) ۱۳۷

ایک قاری کی نقطہ نظر سے ''خوشبوؔ'' اور ''خود کلامی'' کے مابین خاصا فاصلہ دکھائی دیتا ہے [1]

بلا شبہ ''خوشبوؔ'' ایک معصوم، الہڑ اور شوخ دوشیزہ کے جزبات و احساسات کی ترجمان ہے جو پہلے پہل کےُ ان دیکھے'' ان چھوئے اور '' ان کہے جذبوں سے آشنا ہو کر ایک ایسی سرسبز وادی میں قدم رکھتی ہے۔ جہاں تا حدِ نظر پھول ہی پھول ہیں لیکن پھول چنتے چنتے اُس کی آشنائی کانٹوں سے بھی ہو جاتی ہیں اور وہ اپنے ہاتھ لہولہان کر بیٹھتی ہے اور اس وادی حسن و عشق کی داستان کانٹوں کی چھبن سمیت سب بے خوف و خطر کہہ ڈالتی ہے بس یہی کہانی ''خوشبوؔ'' کا موضوع ہے۔ اس لیے 'خوشبوؔ' میں محبوب کے لیے والہانہ جزبات، خود سپردگی کے لطیف احساسات کے ساتھ ساتھ محبوب کی بے اعتنائی و بے رخی، ناکامی و نا اُمیدی، بے بسی اور تنہائی جیسے موضوعات کثرت سے ہیں۔ انھوں نے رومانی تجربوں کے ساتھ ساتھ زندگی کے تلخ حقائق سے نظریں نہیں چرائیں بلکہ زندگی کے یہ دونوں پہلو اُن کے یہاں متوازی طور پر دکھائی دیتے ہیں۔ بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ وہ غموں کو زندگی کی ٹھوس حقیقتیں سمجھ کر خوش دلی سے مقبول کر لیتی ہیں اُن کی شاعری خوشی اور غم کا سنگم معلوم ہوتی ہے۔ آفتاب احمد خان نے پروینؔ شاکر کی شاعری کے بارے میں بالکل صحیح کہا ہے کہ:

> ''پروینؔ شاکر نے اپنی شاعری کے سفر کا آغاز ''خوشبوؔ'' کے وطن یعنی خوش رنگ پھولوں، خوشنما رنگوں اور خوش نوا طائروں کی وادی سے کیا مگر جلد ہی زندگی نے اُن کی راہ میں کانٹوں کے جال بچھا دئے چونکہ وہ طبعاً گلشن پرست واقع ہوئی ہیں لہٰذا انھوں نے پھول ہی نہیں چُنے، کانٹے بھی سمیٹ لئے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ان کی شاعری میں غم و خوشی کی لہریں بیک وقت ابھرتی ڈوبتی نظر آتی ہیں۔ تخلیق کی دیوی اُن کے ہاں بہ چہرہ تبسم بہ چشم تر

---

[1] ، ڈاکٹر سعادت سعید ، ماہِ تمام نا تمام، بشمولہ معاصرہ (مرتبہ عطاء الحق قاسمی، امجد اسلام امجد) ۶۴

آئی ہے''۔[۱]

پروین شاکر کے یہاں عورت کی خوشیاں غم، دکھ سکھ، جزبے، احساس، علامتوں، تشبیہوں اور استعاروں کی شکل میں اظہار پا گئے ہیں۔ موضوعات کی رنگارنگی تجربات کی فراوانی اُن کی نظموں میں زندگی پیدا کر دیتی ہے۔ ایسی زندگی جس میں ٹھہراؤ نہیں بلکہ ثیما بیت ہے۔ ''خوشبو'' میں شاعرہ زیادہ تر حصارِ ذات میں الجھی ہوئی ہیں ویسے تو رومانی میں کافی وسعت اور گہرائی ہے ہر کام پر نت نئے تجربوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ لیکن اِس حصار'' میں انھوں نے روزن بھی رکھے ہیں جن کے ذریعے وہ باہر کی دنیا کا مشاہدہ کرتی رہتی ہیں۔ اور بیرون 'حصار'' کی ہوا 'حصار' کے اندر کی خوشبوؤں سے ٹکراتی رہتی ہے۔

ہوا اور نظروں کے اسی لمس کے سہارے انھوں نے اپنے اندر کی لڑکی کو منکشف کر دینے کی خدا سے جو دعا مانگی تھی وہ 'خوشبو' میں پوری ہوتی نظر آتی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ''خوشبو'' میں اُن کے اندر کی معصوم شبنمیں رخساروں اور حیران آنکھوں والی لڑکی پوری منکشف ہو چکی ہے جب بھی تو اُسے چاند کی تمنا کرنے کی عمر میں ذات کے شہر ہزار در کا اسم عطا کر دیا گیا۔ جسے وہ ''آشوب آگہی''[۱] کے عذاب سے تعبیر کرتی ہیں یہ آشوب آگہی کا سفر ''خوشبو آگہی کا سفر 'خوشبو'' سے شروع ہو کر 'صد برگ'، 'خود کلامی'، 'انکار'، 'کفِ آئینہ' تک جاری و ساری رہتا ہے اور ''ماہِ تمام'' کی صورت میں اختتام کو جا پہنچتا ہے۔ یہ ''آشوب آگہی'' ہی تو ہے جس کی مختلف صورتیں ہمیں اُن کی پوری شاعری میں جلوہ گر نظر آتی ہیں۔

نوعمر لڑکیوں کی نفسیات اور جزباتی کیفیات کی اتنی سچی اور اتنی واضح عکاسی اتنے سلجھے ہوئے انداز میں کسی اور کے یہاں مشکل سے ہی ملے گی۔ محبت کا المیہ بدن و روح میں کانپنے اور تھرتھراہٹ کی کیفیت پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اُن کی شاعری میں اور خاص طور سے پہلی کتاب ''خوشبو' میں شامل نظمیں انہی خیالات کی

---

[۱] ڈاکٹر سعادت سعید، ماہِ تمام ناتمام (مرتبہ عطا الاحق قاسمی، امجد اسلام امجد) ۶۰

آئینہ دار ہیں اور یہی پروینؔ کی شناخت کا باعث بنیں۔ نمونے کے طور پر مندرجہ ذیل نظمیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ 'احتیاط'، 'اعتراف'، 'کشف'، 'گماں'، پیار'، بس اتنا یاد ہے، پہلے پہل، کنگن بیلے کا، کانچ کی سرخ چوڑی، پکنک اور اندیشہ ہائے دور دراز، وہ تو خوشبو ہے، ہواؤں میں بکھر جائے گا وغیرہ پیش کی جاسکتی ہے۔ کشف کا ایک بند اس طرح ہے:

ہونٹ بے بات ہنسے
زلف بے وجہ کُھلی
خواب دکھلا کہ مجھے
نیند کس سمت چلی
خوشبو لہرائی، مرے کان میں سرگوشی کی
اپنی شرمیلی ہنسی میں نے سُنی
اور پھر جان گی
میری آنکھوں میں ترے نام کا تارہ چمکا! [۱]

'کشف' میں ایک لڑکی کے حوالے سے مختلف جزباتی کیفیات کا اظہار ہے جیسا کہ عنوان سے ہی ظاہر ہوتا ہے کہ اچھوتے جذبوں کا انکشاف ہورہا ہے وہ جذبے ابھر کر سامنے آرہے ہیں۔

جن سے وہ پہلے انجان تھی۔ تبھی تو ہونٹ خود بخود مسکرانے لگتے ہیں زلف بے وجہ کھلتی ہے تن من میں خوشبوئیں بسیرا کرنے لگتی ہیں جو اِس بات کا ثبوت ہیں کہ کوئی خوابوں کا شہزادہ من میں آبسا ہے۔ فضا میں جلتے نگ بج اٹھے ہیں۔ تبھی جاگتی آنکھوں میں سپنے سجنے لگتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ اپنی شرمیلی ہنسی خود اپنے لئے

۱۔ پروینؔ شاکر ، خوشبو مشمولہ ماہ تمام (اسلام آباد ، مراد پبلی کیشنز ، ۱۹۹۴) ۳۰

بھی حیرت کا باعث بنی ہے۔ دوسری نظم 'احتیاط' میں بھی یہی کیفیات ملتی ہیں۔ چند بند ملاحظ ہوں۔

سوتے میں بھی
چہرے کو آنچل سے چھپائے رہتی ہوں
ڈر لگتا ہے
پلکوں کی ہلکی سی لرزش
ہونٹوں کی موہوم سی جنبش
گالوں پر رہ رہ کے اُترنے والی دھنک
لہو میں چاند رچاتی اس ننھی سے خوشی کا نام نہ لے لے
نیند میں آئی ہوئی مسُکان
کسی سے دل کی بات نہ کہہ دے! ۱؎

اس نظم میں کچی عمر کی لڑکیوں کی سادگی اور معصومیت کا ذکر ہے کہ اس عمر میں لڑکیاں صرف خوابوں میں کھوتی ہیں انھیں ان کی تعبیر سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ وہ کسی کو چاہنے اور چاہے جانے کو زندگی کی معراج سمجھ لیتی ہیں۔ جس کو چاہتی ہیں سوتے جاگتے میں صرف اُسی خیال اور تصور میں کھوئی رہتی ہیں۔ من چاہے ساتھی کے تصور سے ہی گالوں پر شفق پھوٹتی ہے ہونٹ بے وجہ مسکرانے لگتے ہیں۔ کسی کو پالینے کی خوشی دنیا کی ہر شئے سے بڑھ کو ہوتی ہے۔ محبت سے متعلق ان معصوم تاثرات کو پلکوں کی ہلکی سی لرزش، ہونٹوں کی موسوم سی جنبش، گالوں پر اترنے والی دھنک، لہو میں چاند رچاتی خوشی جیسے لفظی ترکیبوں، استعاروں اور پیکر تراشی کے

۱؎۔ پروین شاکر، خوشبو مشمولہ ماہ تمام (اسلام آباد، مراد پبلی کیشنز، ۱۹۹۴) ۲۸

ذریعے بہت عمدگی سے بیان کیا گیا ہے۔ اِس طرح کے احساسات کا اظہار نظم 'پہلے پہل' میں ہوتا ہے۔ جس میں ایک لڑکی کے جزبات کی عکاسی کی گئی ہے جو پیار کی کونپل پھوٹنے کے بعد کچی عمر کے جزبوں سے لبریز ہے۔ اپنے محبوب سے ملنے کے بعد اس قدر خوش ہے کہ اِسی خوشی کو چھپانا چاہ رہی ہے مگر وہ نہیں چھپتی۔ ہر قدم پھونک پھانک کر رکھتی ہے۔ ہر آہٹ پر چونک جاتی ہے اپنے آپ سے بھی ڈر جاتی ہے۔ کہ کہیں چہرے کی پھونک کی تمتماہٹ جو کہ محبوب سے ملنے کی وجہ سے ہے اُس 'راز' کو فاش نہ کر دے۔

چند بند ملاحظہ ہوں :

شکن چُپ ہے
بدن خاموش ہے
گالوں پہ ویسی تمتماہٹ بھی نہیں، لیکن
میں گھر سے کیسے نکلوں گی
ہوا، چنچل سہیلی کی طرح باہر کھڑی ہے
دیکھتے ہی مسکرائے گی [1]

یہاں تک کہ ہوا سے بھی بچنا چاہتی ہے۔ کیونکہ ہوا کے ہاتھ اگر یہ 'خوشبو' لگ گئی تو پھر وہ اُسے زمانے بھر میں پھیلا دے گی اور پھر زمانہ تو سدا سے ظالم ہی ٹھہرا۔ اِس میں کوئی شک نہیں کہ پروین کی ''خوشبو'' والی شاعری ایک نوعمر لڑکی کے پہلے پہل کے جزبوں کی مہک سے مزین ہے۔ معصوم جذبے اور احساسات چاند اور چاندنی موتیے، گلاب، بارش اور دھنک کے رنگوں، تتلیوں کی شکل میں تشبیہہ و استعارات کا روپ دھار کر

---

[1]۔ پروین شاکر، خوشبو مشمولہ ماہ تمام (اسلام آباد، مراد پبلی کیشنز، ۱۹۹۴) ۴۲

اظہار پاتے ہیں۔ ان میں سوز و گداز بھی ہے اور قلبی واردات کا آئینہ بھی۔اظہار کی پرتوں میں تہہ در تہہ معنی کا ایک جہاں آباد ہے جو خوشبوؤں خوابوں خیالوں یادوں اور تاثرات سے عبارت ہے۔اُن کی ساری شاعری عورت کے نفسیاتی منظر نامے کی پوری ترجمانی کرتی ہے، کیونکہ انہیں عورت کی نفسیات کا تجزیہ کرنے میں کمال حاصل ہے۔نفسیاتی بسیرت سے کام لیتے ہوئے پروین شاکر نے گونگے جزبوں کو قوت گویائی عطا کر کے عشق و محبت کے احساسات کی بہت خوبصورت رنگ میں تہذیب کی ہے ۔

پروین شاکر خواہ کتنی ہی بیروکیٹ اور سماجی نقاد کیوں نہ بن جائیں۔ بنیادی طور پر ایک روایتی عورت ہونا حق سمجھتی ہیں۔ پروین شاکر کی نظموں کے موضوعات نظم کے متن سے پوری طرح میل کھاتے ہیں نظم کے عنوان کو دیکھ کر ہی نظم کا قاری اندازہ کر سکتا ہے کہ نظم کس سے متعلق ہے اس میں کیا مواد ہو سکتا ہے۔''خوشبو'' میں شامل نظمیں رومان و جمالیات میں رچی بسی ہوئی ہیں۔مثال کے طور پر'خوشبو" میں شامل نظموں کے عنوانات کچھ اس قسم کے ہیں۔'کنگن بیلے کا'، 'بسنت بہار کی نرم ہنسی'، 'گوری کرت سنگھار'،'بنفشے کا پھول'، 'دھوپ کا موسم، رات کی رانی کی خوشبو سے کوئی یہ کہہ دے '،خوشبو کی زبان ،سرِ شاخِ گل،'' کانچ کی سرخ چوڑی''،'خوشبو کی طرح دیگر مجموعوں میں بھی یہ رجحان کارفرما نظر آتا ہے۔یعنی نظم کا عنوان نظم کو سمجھنے میں بھی بہت مدد دیتا ہے۔اس سلسلے میں نظیر صدیقی اپنے خیالات کا اظہار کچھ اس طرح سے کرتے ہیں:

''چونکہ وہ شاعری میں صرف اظہار کی ہی نہیں ابلاغ کی بھی قائل تھی۔اس لئے اُن کی نظموں کے ذاتی اور داخلی ہونے کے باوجود پڑھنے والوں کو اُن کی شاعری کے ادراک میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی۔اُن کی نظموں کے عنوانات قاری کو بڑی مدد دیتے ہیں اُن کی بیشتر نظموں کو پڑھنے کے بعد جب اُن پر دوبارہ نظر پڑتی ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے عنوان نے نظم کے تجربے کو'' crystalize'' کر دیا ہو اُن کی نظموں میں جس عشق کی

مصوری ملتی ہے وہ سادہ بھی ہے اور ''sophisticated'' بھی ہے ا؎

پروین کی نظموں میں ہر طبقے کی عورت اپنے ذہنی و جزباتی رویوں سمیت جلوہ گر ہے چاہے مزدور پیشہ عورت یا اعلیٰ سوسائٹی سے تعلق رکھنے والی خاتون، ان پڑھ گھریلو عورت ہو یا اعلیٰ عہدے پر فائز، سب کے اپنے مسائل اور المیے ہیں۔ اپنی سوچیں، خواب، آرزوئیں، امنگیں ہیں وہ دکھ درد بھی موضوع بحث بنے ہیں۔ جو حوا کی بیٹی کے مقدر کی لکیروں کا خاصہ ہیں۔ مرد اساس معاشرے میں عورت کو مزدور سمجھ کر اُس کا استحصال, ظلم، انصافی جیسے موضوعات پر تفصیلی اظہارِ خیال ملتا ہے۔ وہ معاشرے کے فرسودہ رسم ورواج سے بغاوت کرتی ہیں اور یہی جزبہ انہیں جبر و حبس کے موسموں کی نفی کرنے پر مائل کرتا ہے۔ معاشرے کی تنگ نظری اور دوہرے نظامِ معیار کا ذکر اُن کے ہاں بہت موثر انداز میں ملتا ہے وہ عورت کی بے بسی پر کڑھتی ہیں اس لئے مزاحمتی طرز کا اندازِ بیان نہ صرف ان کی نظموں میں بلکہ غزلوں میں بھی ملتا ہے۔ پروین کے یہاں احتجاج کی کئی صورتیں ہیں۔ پہلی احتجاجی صورت مرد اساس معاشرے میں عورت سے ناانصافی کے حوالے سے ہے۔ اُن کے مطابق مرد اجارہ داری والے اس معاشرے میں عورت کو کس کس طرح اپنے ارمانوں کا گلہ گھونٹنا پڑتا ہے۔ معاشعرے کیسی کیسی حدیں اور رکاوٹیں اُس پر لاگو کرتا ہے اور عورت کی بے بسی و مجبوری دیکھئے کہ اُسے دوسرے درجے کے شہری کی حیثیت سے نہ چاہتے ہوئے بھی ان خود ساختہ روایت وقوانین کی پاسداری کرنی پڑتی ہے جس بات کے لیے عورت معیوب ومعتوب ٹھہرائی جاتی ہے۔ وہ مرد کے لیے باعث افتخار سمجھی جاتی ہے۔ عورت کے جذبات و احساسات پسند وناپسند کی کوئی قدر و قیمت نہیں وہ دوسروں کے طے کردہ بنے بنائے سانچے میں ڈھلنے کے لئے اپنے آپ کو مجبور پاتی ہے۔ اُن کے یہاں کئی نظموں میں عورت کے بے زبانی اور مظلومیت کا اظہار ملتا ہے ۔ جن میں عورت کے استحصال

ا؎ نظیر صدیقی، زخمِ جگر سے نقش ہنر تک کا ایک سفر'' مشمولہ خوشبو کی ہمسفر، مرتبہ ڈاکٹر سلطانہ بخش ۲۰۰۲

کے کئی رنگ ہیں۔ ان میں ناٹک، مجبوری، نارسائی، پہرے، بنفشے کا پھول، نک نیم، کتوں کا سپاسنامہ، کنیا دان، بشیرے کے گھر والی، اسٹینوگرافر جذبہ، پوسٹ ڈائز آئیٹم، لیڈی آف دی ہاؤس خاص طور قابلِ ذکر ہیں۔ ان نظموں میں موضوعات کے علاوہ ان کی فنی ہنر مندی کے بہت عمدہ نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں جو انہیں اپنی ہمعصر شاعرات سے ممتاز کرتے ہیں۔ آج جبکہ دنیا ترقی کے بامِ عروج پر ہے بظاہر عورت مردوں کے شانہ بشانہ زندگی کے ہر موڑ پر گامزن ہے ایسے میں اُس کی تحقیر و تذلیل کے طریقے نئے ہیں۔ لیکن نوعیت وہی پُرانی ہے جو صدیوں پہلے تھی نظم 'صرف ایک لڑکی' میں تمثیلی انداز میں شاعرہ عورت کو سماج کے خود ساختہ رسم و رواج میں جکڑی ہوئی عمر قید کی ملزم بتاتی ہیں۔ اس نظم میں لفظوں کی سب کڑیاں باہم مربوط ہیں۔ نظم کے مرکزی موضوع سے مناسبت رکھتے ہوئے تلازمے نظم میں جان پیدا کر دیتے ہیں۔ اِسی قسم کی ایک نظم 'بنفشے کا پھول'' کا تجزیہ پیشِ خدمت ہے۔ یہ نظم وڈز ورتھ کی نظم Aviolet under a hidden rock' سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہے۔ اس میں علامتی انداز میں بنفشے کی کہانی ہے جو جنگل کی وسیع و عریض کیف آور مست ہواؤں میں پنپنے سے لے کر ایک امیر آدمی کے ڈرائنگ روم کی زینت بننے تک کے عمل پر مشتمل ہے اصل میں شاعرہ اس کے ذریعے یہ بات واضح کرنا چاہتی ہیں کہ ایک لڑکی کی زندگی کا سہانا بچپن بابل کے دیس میں گڈے گڑیا کے بیاہ رچانے، ساون رتوں میں جھولے جھلانے، روپہلے سپنے سجانے میں بیت جانا ہے۔ انجان ماحول اور انجان لوگوں میں وہ اپنے اندر کیسی گھٹن اور اپنی تمناؤں، امنگوں اور خوابوں پر کیسے کیسے جبر محسوس کرتی ہے۔ فرائض اور ذمہ داریوں کے انبار کے ایک لامتناہی سلسلے میں پھنس کر کس طرح اپنے آپ سے بچھڑ جاتی ہے وہ بچپن کے اُس سہانے، بے فکرے دور کی پرچھائیوں کو تلاشتی رہتی ہے جو وقت کی بھول بھلیوں میں کہیں کھو گیا ہوتا ہے۔'' نک نیم' میں کم و بیش یہی صورت حال ملتی ہے عورت جس کے وجود سے تصویر

کائنات میں رنگ ہے وہ اپنی اصل حقیقت سے آگاہ ہے۔ پروین شاکر عورت کے اعتبار کی شکست وریخت کا ان الفاظ میں ذکر کرتی ہیں۔

تم مجھ کو گڑیا کہتے ہو
ٹھیک ہی کہتے ہو
جو پہنادو، مجھ پہ سجے گا
میرا کوئی رنگ نہیں
جس بچے کے ہاتھ میں تھمادو
میری کسی سے جنگ نہیں
سوتی جاگتی آنکھیں میری
جب چاہو بینائی لے لو
کوک بھرواور باتیں سن لو
پیار کرو آنکھوں میں بساؤ
اور پھر جب دل بھر جائے
دل سے اٹھا کے طاق پہ رکھ دو
تم مجھے گڑیا کہتے ہو ٹھیک ہی کہتے ہو۔

تمثیلی انداز کی اِس نظم میں گڑیا کے کردار کے ذریعے یہ واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ عورت گڑیا کی طرح بظاہر دل لبھانے والی لیکن بے جان سی مخلوق ہے۔ کیونکہ اس کی زندگی پر دوسروں کی اجارہ داری ہے اس کا مجازی خدا جس رنگ میں اُسے دیکھنا چاہتا ہے وہ اُسی میں رنگی جاتی ہے۔ اُس کا من چاہے تو اُسے

سجائے سنوارنے دل کے سنگھاسن پہ بٹھا دے دل بھر جائے تو پیروں تلے سے زمین کھینچ لے۔ دونوں صورتوں میں وہ روبوٹ کی طرح اپنے آقا کے فرمان کی پابند ہے اُس کے سسٹم میں حکم عدولی کی کوئی گنجائش نہیں مرد کی خوشیوں سے ہی اُس کی سلامتی مشروط ٹھہری ہے وہ خود کچھ بھی نہیں سوائے اس کے کہ جو کچھ وہ اُس کے اندر دیکھنا چاہتا ہے وہ ویسی ہی بننے کی کوشش کرتی ہے۔

پروینؔ شاکر اپنی نظموں میں مرد اساس معاشرے کی عورت پر بالا دستی کا برملا اظہار کرتی ہوئی نظر آتی ہیں تو دوسری طرف ایک ایسی عورت کی نمائندہ بن کرا بھرتی ہیں جو خلوص و وفا کا پیکر ہے۔ ایثار و ہمدردی کی خوگر ہے صبر و رضا کا مجسمہ ہے جو محبوب کے در پر سر جھکانے میں ہی اپنی شان سمجھتی ہے۔ جو ایک بار کسی کو دل دے تو پھر اُس کا اپنا کچھ نہیں رہتا۔ اُس کے خواب خیالات، آرزویں سب ایک شخص سے وابستہ ہو جاتے ہیں۔ جس کے ساتھ وہ زیست کی شاہراہ پر چلنے کا عہد کرتی ہے۔ وہ دل و جان سے اُس کی ہو جاتی ہے۔ اُسے ٹوٹ کر چاہتی ہے اُس کے بغیر اپنا آپ ادھورا سمجھتی ہے۔ پروینؔ کی بہت ہی نظمیں اسی محور کے گرد گھومتی ہیں جو خود سپردگی اور والہانہ محبت کے جزبات سے سرشار ہیں۔ مثلاً 'رفاقت'، 'تشکر'، 'ویسٹ لینڈ'، 'موسم کی دعا'، 'ڈیپارٹمنٹل سٹور'، 'خوشبو کی زبان' اور 'پرزم'، انہی خیالات کو منعکس کرتی ہیں۔ 'پرزم' میں شاعرہ نے تمثیلی انداز میں سورج اور پانی کے قطرے کی علامتوں کے ذریعے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ جس طرح پانی کے قطرے پر سورج کی کرنیں پڑتی ہیں تو اُس میں 'دھنک' کے رنگ پھوٹتے ہیں کہ بالکل اُسی طرح عورت کی زندگی میں ایک مرد کی اہمیت ہے وہ مرد اپنی نظرِ کرم سے اپنی التفات سے اُس کی خوشیوں اور اُمیدوں میں دلکش رنگ بھر دیتا ہے جیسی ہی وہ بے توجہی و بے اعتنائی برتتا ہے تو عورت سادہ و بے رنگ پانی کے ایک قطرے کی مانند رہ جاتی ہے یعنی ویران اور زندگی سے خالی۔ وہ مرد کی بدولت ہی زندگی کے رنگوں سے بھرپور تھرکتی، ناچتی نظر آتی ہے۔

پانی کے اک قطرے میں
جب سُورج اُترے
رنگوں کی تصویر بنے
دَھنک کی ساتوں قوسیں
اپنی بانہیں یوں پھیلائیں
قطرے کے ننھے سے بدن میں
رنگوں کی دنیا کھنچ آئے
میرا بھی اِک سورج ہے
جو میرا تن چھو کر مجھ میں
قوسِ قزح کے پھول اُگائے
ذرا بھی اُس نے زاویہ بدلا
اور میں ہوگئی
پانی کا اِک سادہ قطرہ
بے منظر بے رنگ[1]

یہ ایک حقیقت ہے کہ پروین شاکر کی شاعری کے تخلیقی سوتے تخیل کی مضمون آفرینی کے بدلے تجربات و مشاہدات کی پنہائیوں اور گہرائیوں سے پھوٹتے ہیں۔ ان کی نظموں میں کہیں 'آورد' ہے تو کہیں 'آمد'

---

[1] پروین شاکر۔ خوشبو، مشمولہ، ماہ تمام (اسلام آباد، مراد پبلی کیشنز، ۱۹۹۴) ۴۰

کا احساس ہوتا ہے۔ لیکن دونوں صورتوں میں احساس کی شدت ان کے شعور و حواس پر غالب رہتی ہے۔ دوسری خوبی تصنع اور بناوٹ سے پاک ان کا لب ولہجہ ہے سچے اور حقیقت پسندانہ پیرائے میں ان کے شعری تجربے اظہار پاتے ہیں۔ ان کے مطابق جب کسی خیال یا جزبے کو حقیقت پسندانہ انداز میں بیان کیا جائے تو اس سے تخلیق کا حسن بڑھ جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں پاکیزہ جزبے، اچھوتے خیال، شفاف و نادر سوچیں نرم و نازک لطیف لفظوں کے پیراہن سے مزین ہیں۔ ان کے تجربات اور فکر خیال کے اظہار میں سچائی کی بازیافت ہی شروع سے آخر تک چھائی ہوئی ملتی ہیں اور یہی ان کی انفرادیت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا اسلوب شگفتہ، تر وتازہ اور لطافتوں سے بھرپور ہے جیسے کوئی معطر ہوا جھونکا دھیرے سے چھو کر گزر جائے اور اس میں اتنی تازگی ہو کہ دل و دماغ تازہ ہو جائیں۔

سچ تو یہ ہے کہ پروین شاکر کی شاعری عورت کے جذبات ومحسوسات کی شاعری ہے۔ پروین شاکر کے یہاں جس عورت کا پیکر ابھرتا ہے وہ خالصتاً مشرقی ہے جو پیکر شرم وحیا ہے جو مجسم حسن و وفا ہے وہ اپنی چاہتوں، محبتوں اور قربانیوں میں اتنی مکمل اتنی خالص ہوتی ہے کہ اس انمول خزانے کے آگے اپنا سب کچھ ہار جاتی ہے، اپنا تن من دھن وارد ہوتی ہے۔ لیکن مرد بلند و بانگ دعوؤں کے باوجود بہت کچھ بچا رکھتا ہے۔ عورت کی معصومیت اور سادہ لوحی کہیے کہ وہ سب دوغلا پن اس کی منافقت سمجھ نہیں پاتی، جی جان سے اس پر فدا رہتی ہے اور مرد ان تمام جذبوں کو روند کر اپنی ایک نئی دنیا بسا لیتا ہے۔ ماضی کے ان سب باتوں کو آنے والی کل میں دفن کر کے کھیل پھر سے دُہراتا ہے۔ پروین شاکر کی شاعری میں یہ موضوع بہت واضح طور پر ابھر کر سامنے آیا۔ مرد کی بے وفائی سنگدلی کا شکوہ کبھی تو '' آنے والی کل کا دُکھ '' کی صورت میں ان کے لبوں پر مچلتا ہے تو کبھی '' چاندرات ''اور'' ردِعمل''، ''وہ آنکھیں کیسی آنکھیں'' جیسی نظموں میں نمایاں ہوتا ہے نظم '' چاندرات '' سے چند اشعار:

ہوا ! کچھ آج کی شب کا بھی احوال سُنا
کیا وہ اپنی چھت پر آج اکیلا تھا؟
یا کوئی میرے جیسی ساتھ تھی اوراس نے
چاند کو دیکھ کے اُس کا چہرہ دیکھا تھا؟[۱]

جبکہ دوسری نظم ''وہ آنکھیں کیسی آنکھیں'' میں یہی صورت حال ملتی ہے۔

کسی لمحے تم سے روٹھ کے وہ آنکھیں رو دیں
اور تم نے اپنے ہاتھ سے اُن کے آنسو خشک کیے
پھر جُھک کر اُن کو چُوم لیا
(کیا ان کو بھی) [۲]

پروینؔ شاکر کی نظموں میں ماضی حال اور مستقبل تینوں زمانوں میں جیتی جاگتی نظر آتی ہیں۔زمانے کے یہ تینوں دھارے بظاہرا لگ ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں اور یکے بعد دیگرے بہتے ہوئے چلے جاتے ہیں اور زندگی کو خوشیوں اور غموں کی سوغات دے کر آگے بڑھتے رہتے ہیں۔ پروینؔ کبھی تو حال کے جھروکوں سے مستقبل کے واہمات و خدشات کو تکتی رہتی ہیں اور کبھی ماضی کی یادوں کو آواز دیتی رہتی ہیں۔یادیں جو وقت کی گرد سے دھندلا بھی جائیں لیکن مرتی کبھی نہیں ہمیشہ ہمارے آس پاس سانس لیتی رہتی ہیں۔پروینؔ جب بھی یادوں کے سفر پر نکلتی ہیں تو کئی راتوں کا سارا منظر اُن کی نگاہوں میں تازہ ہو جاتا ہے۔

۱۔پروینؔ شاکر،خوشبو،مشمولہ ماہ تمام (اسلام آباد،مراد پبلی کیشنز:۱۹۹۴)۹۶

۱۔پروینؔ شاکر،خوشبو مشمولہ ماہ تمام (اسلام آباد،مراد پبلی کیشنز:۱۹۹۴)۱۰۹

ماضی جو انھیں بہت عزیز ہے۔ وہ یادوں کے مدفن سے گئی رتوں کی شناسا مہک ''تلاشی'' رہتے ہیں۔'' آج کی رات'' آج کی شب تو کسی طُور گزر جائے گی اور " رات کی رانی کی خوشبو سے کوئی یہ کہہ دے" جیسی نظمیں انہی خیالات کی آئینہ دار ہیں۔

نظم ''رات کی رانی کی خوشبو سے کوئی یہ کہہ دے'' میں وہ گئے موسموں کی شناسا میک سے مشامِ جاں کو معطر کر رہی ہیں جو دل کے زخموں کی صورت میں اُن کے پاس موجود ہے وہ اسی مہک سے اپنی روح کا سنگھار کرنا چاہتی ہیں۔ انہی یادوں کے سہارے بھیگی آنکھیں لیے رت جگا منانا چاہتی ہیں وہ ابر پریشان کی طرح گم گشتہ جزیروں کا طواف کرنا چاہتی ہیں تو کچھ سکون حاصل کر سکیں اور بھولے بسرے زخموں کو کریر کروٹیں، جلن، تڑپ اور کسک کا مزالے سکیں، زخموں کے یہ خزانے ان کے لیے بہت انمول ہیں کیونکہ یہ بہت پیاری ہستیوں کی دین ہیں۔ ملاحظ کریں نظم 'رات کی رانی کی خوشبو سے کوئی یہ کہہ دے:

رات کی رانی کی خوشبو سے کوئی یہ کہہ دے
آج کی شب نہ مرے پاس آئے
آج تسکینِ مشام ِجاں کو
دل کے زخموں کی مہک کافی ہے
یہ مہک آج سرِشام ہی جاگ اٹھی ہے
اب یہ بھیگی ہوئی بوجھل پلکیں
اور نمناک، اُداس آنکھیں لیے
رت جگا ایسے منائے گی کہ خود بھی جاگے
اور پل بھر کے لئے میں بھی نہ سونے پاؤں

دیو مالائی افسانوں کی منتظر موسم گل راجکماری کی خزاں بخت
دُکھی روح کی مانند
بھٹکنے کے لیے
کُو بہ کُو ابرِ پریشاں کی طرح جائے گی
دُور افتادہ سمندر کے کنارے بیٹھی
پہروں اُس سمت تکے گی جہاں سے اکثر
اُس کے گم گشتہ جزیروں کی ہوا آتی ہے! ۱؎

اس طرح سے نظم 'آج کی رات' میں گئے وقت کی یادوں کے سمندر سے اٹھتے تلاطم انھیں نیند کی آغوش میں جانے سے روک رہے ہیں۔ کوئی شوخ سے یاد ضدی بالک کی طرح ان کی انگلی پکڑ کر ایک ایسے سفر پر کلی ہے جہاں سے ماضی کے کچھ دریچے وا ہو جاتے ہیں۔ پیش خدمت ہے 'آج کی رات' کا شعری اقتباس:

نیند پلکوں کی جھالر کو چھوتی ہوئی
اوس میں اپنا آنچل بھگو کے
مرے دُکھتے ماتھے پہ رکھنے چلی ہے
مگر آنکھ اور ذہن کے درمیان
آج کی شب وہ کانٹے بچھے ہیں
کہ نیندوں کے آہستہ رو، پھول پاؤں بھی چلنے سے معذور ہیں۔

۱؎۔ پروین شاکر، خوشبو مشمولہ ماہ تمام (اسلام آباد، مراد پبلی کیشنز، ۱۹۹۴) ۱۹۲

ہر بُن مو میں اک آنکھ اُگ آئی ہے
جس کی پلکیں نکلنے سے پہلے کہیں جھڑ چکی ہیں
اور اب رات بھر
روشنی اور کُھلی آنکھ کے درمیان
نیند مصلوب ہوتی رہے گی! [۱]

نیند کا پلکوں کی جھالر کو چھونا، نیند کا وس میں آنچ بھگونا، آنکھ اور ذہن کے درمیان کانٹے بچھنا، نیند کے نظم آہستہ رو پھولوں کا معذور ہونا، بُن مو میں آنکھ کا اُگ آنا، نیند کا مغلوب ہونا اس نظم میں منتخب لفظوں سے تیار کیے ہوئے حسی پیکر لاجواب ہیں۔

'زخموں کی مہک' کو کئی طرح کے حسی پیکر عطا کر کے بیان کیا گیا ہے یعنی زخموں کی مہک کا رت جگا منانا کو بہ کو بھٹکنا، سمندر کے کنارے بیٹھنا، اس سے پہلے والی نظم میں یادوں کی بھی تجسیم کاری personification کی گئی ہے اور متحرک پیکروں کے ذریعے اسے اُجاگر کیا گیا ہے۔ نیند اور مہک متحرک پیکروں کی صورتیں دی گئی ہیں۔ اس طرح غیر مرئی کو متشکل کر دیا گیا ہے۔ یادوں کا رگ و پے میں اترنا، یادوں کا روپہلا چمکیلا سیال صحراؤں کی شریانوں میں بارش، سروش نکہت کی مانند یاد کے بند دریچوں کو کھولنا، یاد کے دریچوں سے رنگوں کا جھلکنا وغیرہ ان نظموں کی لفظیات اگرچہ نئی نہیں ہیں۔ مگر شاعرہ نے ٹھوس اور اچھوتے پیکروں اور منفرد تراکیب و استعاروں کے پیرائے میں انھیں ڈھال کر نئے معنی و مفاہیم سے آراستہ کیا ہے۔
پروین شاکر کی شعری فکر میں فن اور اس کی نزاکتوں کا شدید احساس ہوتا ہے۔ اس کی نظمیہ شاعری

---

[۱] پروین شاکر، خوشبو مشمولہ ماہ تمام (اسلام آباد، مراد پبلی کیشنز، ۱۹۹۴) ۲۶۷

یہاں تک کہ غزلیہ شاعری میں بھی وحدت تاثر پیدا کرنے کے لئے سادگی، تحریر میں بے ساختگی، روانی، عام فہم زبان، غیر ضروری آرائش سے اجتناب اور خیال کی صحت مندی ناگزیر ہیں خوشبو کی بعض تخلیقات فن کی نزاکتوں، لطافتوں، خیال کی رعنائیوں، بیان کی رنگینیوں اور مناسب صنعتوں سے سجی ہوئی ہیں۔ تخیل اور شعریت پر فکر و فلسفے کا غلبہ نہیں۔ اپنے خیالات کے اظہار کے لئے پروین شاکر کو موزون الفاظ اور موثر انداز بیان بہ آسانی مل جاتا ہے۔ یہ اس کی زبان و بیان پر قدرت کی دلیل ہے جو قاری کے ذوق جمال کی تسکین کا باعث بنتی ہے اور خود فنکار کی تحریر میں تازگی، شگفتگی، رعنائی و دلکشی اور ندرت پیدا کرتی ہے۔

''خوشبو'' کے بعد پروین شاکر کے دوسرے مجموعے ''صد برگ'' کا ذکر کیا جائے۔ ''خوشبو'' کی شاعرہ نے ''صد برگ'' سے اپنی ذات اور فن کا ایک اور در وا کر دیا۔ بلاشبہ پروین شاکر کے پانچوں مجموعے ان کی شخصیت کے ایسے سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں جن کے ذریعے قاری ان کی شخصیت اور فکر فن تک رسائی حاصل کر سکتا ہے۔ ''صد برگ'' میں غمِ جاناں اور غم دوراں کی تصویریں ہیں۔ بغور مشاہدے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ''خوشبو'' کے مقابلے میں ''صدر برگ'' کے موضوعات زیادہ وسیع ہیں۔ حسن و عشق، خود سپردگی کے والہانہ جذبات کے ساتھ عصری مسائل و سیاسی و سماجی شعور اور فکر و فلسفہ کے کئی رنگ ہیں جو کہیں مدھم ہیں تو کہیں بہت گہرے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کی ''صدر برگ'' میں وہ ذات کے حصار سے باہر نکل آئی ہیں۔ اب اُن کے یہاں خوابوں اور خوشبوؤں کا ہی تذکرہ نہیں بلکہ ایک جیتی جاگتی زندگی کا احساس نمایاں ہے۔

''صد برگ'' میں لڑکی سے زیادہ ایک عورت کا سنجیدہ مضبوط اور پر اعتماد لہجہ سنائی دیتا ہے۔ خوشبو کے مدھر و مسحور کن احساسات سے معمور خوابوں اور خیالوں میں رہنے والی لڑکی 'صد برگ' میں زندگی کی کڑی حقیقتوں اور تلخ و تند ذائقوں سے بخوبی آشنا ہو چکی ہوتی ہے۔ وقت و حالات کے بے رحم تازیانے ان کی سوچ اور لب و لہجے میں سختی پیدا کر دیتے ہیں۔ ان کی ذاتی زندگی میں نہ صرف تلخیاں گھل مل جاتی ہیں بلکہ مادرِ وطن پر بھی آمریت

اورظلم و جبر کے بادل سایہ افگن ہو جاتے ہیں۔ لاقانونیت اور قید و جبر کے موسموں میں اُن کا قلم جو نقش رقم کرتا ہے اس میں طنز کی کاٹ اور احتجاجی کی آمیزش شامل ہو جاتی ہے۔

پروینؔ شاکر کے یہاں احتجاج کی کئی صورتیں ہیں جن میں سے ایک تو مردا جارہ داری والے معاشرے میں عورت کے استحصال اور ناانصافی کے حوالے سے ہے جو ازل سے ہی عورت کا مقدر بن چکا ہے ۔

پروینؔ شاکر عورت کو بتانا چاہتی ہیں کہ وہ اپنے آپ کو پہچانے اور اپنے حقوق کے تحفظ کے لیے اٹھ کھڑی ہو وہ یہ جان لے کہ اس کی اپنی ذات اور جسم و جان کے بھی کچھ تقاضے ہیں جو مردا جارہ داری والا معاشرہ دینے کو تیار نہیں۔ جدید دور کی باشعور اور حساس عورت ہونے کے ناطے وہ صرف اپنی ذات سے وابستہ معاملات و مسائل سے نہیں الجھتیں بلکہ اجتماعی شعور کی بناء پر عورت کی نفسیات، اس کے مسائل اور اس کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کا احساس بھی رکھتی ہیں۔ وہ جانتی ہیں کہ مردا جارہ داری والے معاشرے میں عورت ہمیشہ ناکردہ گناہوں کی چکی میں پستی آئی ہے۔ پروینؔ شاکر کی شاعری میں دوسرے احتجاجی صورت معاشرے کے ایک مہذب اور ذی شعور فرد کی حیثیت سے ہے جو معاشی و معاشرتی اقدار کے زوال کی صورت میں جلوہ گھر ہے۔ یہ ناہمواریاں آج کے دور کے انسان کا مقدر بن چکی ہیں۔ پروینؔ شاکر انھیں شدت سے محسوس کرتی ہیں۔ وہ صاف وشفاف پاکیزہ معاشرے کی خواہاں ہیں جہاں سب کو یکساں بنیادی حقوق کے ساتھ ترقی و ترویج کے بہتر مواقع میسر ہوں۔

۱۹۸۰ء میں جب 'صد برگ' لکھی گئی وہ آمریت کا دور تھا۔ ملک میں مارشل لاء (فوجی قانون) لگا ہوا تھا ظلم و جبر کے پہرے تھے سچائی اور حق و انصاف پر بہت سی رکاوٹیں تھی۔ اہلِ ہنر کے لیے دستورِ زبان بندی رائج تھا۔ چونکہ وہ جمہوریت کی علمبردار تھیں۔ جمہوریت کو انسان کا پیدائشی حق سمجھتی تھیں۔ انھوں نے اہلِ وطن کے درد و کرب کو محسوس کیا اس طرح سیاسی موضوعات اور

علامتوں کا سہارا لیا ہے۔

یہ سچ ہے کہ پروین شاکر کی شاعری کا محور عورت اور اس سے وابستہ مسائل تک محدود نہیں ہے۔ بلکہ وہ اپنے اعلیٰ فکر و شعور اور حساس ذہن عصری و سماجی مسائل کا بھی واضح ادراک رکھتی ہیں۔جس کا اظہار ان کی شاعری میں جابجا نظر آتا ہے وہ زمانے کی نبض پر ہاتھ رکھتی ہیں اور ناقدرانہ انداز میں اپنے آس پاس کا جائزہ لیتی ہیں وہ ان تلخ حقیقتوں کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کرتی ہیں جو انسانیت کو گھن کی طرح چاٹ رہی ہیں۔آج کے دور کا انسان ترقی کے بام عروج پر پہنچنے کے باوجود اخلاقی پستی کی انتہاؤں پر ہے۔اگر چہ پُرانے دور کی جہالت نئے رنگ اختیار کر چکی ہے پروین شاکر کی بیشتر نظمیں اسی موضوع کا احاطہ کرتی ہیں جس طرح ''روزِ سیاہ، ماہ گزیدہ لمس زر، ادرکنی، اونٹ کا حافظہ رکھنے والے demone tization شامل ہیں۔جن میں صالح اقدار کی نایابی کو موضوع بنایا گیا ہے۔صحت مند معاشرے کا اصل معیار اخلاقی قدروں پر ہی منحصر ہوتا ہے جب معاشرے کے افراد اخلاقی حدود و ضوابط کی پاسداری نہیں کرتے وہاں پستی و انحطاط کا دور شروع ہو جاتا ہے۔ نظم 'demonetization' میں شاعرہ نے اعلیٰ انسانی قدروں کے زوال کو موضوع بنایا ہے کہ آج کے دور کا انسان مادیت پرستی کی دور میں صالح قدروں سے منحرف ہو کر انسانیت کے مرتبے سے کس طرح گر رہا ہے۔ یہاں تک کہ معاشرے کے نجیب افراد کو بھی منافقت، جھوٹ اور افراد کو بھی منافقت، جھوٹ اور وفاداریوں کے بدلے برداشت کرنا سکھایا جاتا ہے کیونکہ آج کے دور میں شاعرہ کے نزدیک ماضی کے سب عقیدے باطل ٹھہرے ہیں۔حق و انصاف کے پیمانے منسوخ ہو چکے ہیں سماج میں برائیاں، بے ایمانیاں اور جعل سازیاں عروج پر ہیں۔ مثبت اقدار کا فقدان ہے۔ایسا معاشرہ جس کی بنیادیں جھوٹ پر کھڑی ہوں وہاں سر اٹھا کر جینے کی یہی شرائط ٹھہری ہیں۔جب پورے معاشرے کی ہوا ہی ایسی زہریلی ہو تو ہو ہی نہیں سکتا کہ کوئی اس کے زہریلے اور ضرر رساں اثرات سے بچ سکے لیکن اس نظم کے دوسرے حصے میں شاعرہ کا کہنا ہے:

کہ اس دور میں بھی کچھ افراد ایسے ہیں جو اپنے اسلاف سے ملنے والی صالح قدروں کو سرمایہ حیات سمجھ کر اپنا دستور العمل بنائے بیٹھے ہیں ۔ وہ راہِ حق وصداقت کے امین ہیں۔ لیکن ایسے لوگوں کو راہِ مستقیم پر چلنے کے جرم بے گناہی میں پتھروں میں چنوا دیا جاتا ہے اس کے ساتھ ہی شاعرہ کا یہ مشورہ ہے کہ ان لوگوں کے ساتھ ان کے شجرے بھی رکھ دینے چاہیں تا کہ ہزاروں سال بعد ٹیکسالا ہڑپہ جیسے تاریخی شہروں کی کھدائی کی جائے تو وہاں سے ان کے شجرے بھی برآمد ہوں جو ان کے اعلیٰ نسب ہونے کا ثبوت فراہم کرسکیں تا کہ آنے والی نسلیں جان سکیں کہ انھوں نے کس پُر آشوب وپُرفتن دور میں اپنے لہو عقیدے اور ضمیر کی پاسداری کی ہے جس کی انھیں سزا بھگتنی پڑی ہے ملاحظ ہو ''نظم تقیہ'' کا شعری اقتباس:

سواب یہ شرطِ حیات ٹھہری
کہ شہر کے سب نجیب افراد
اپنے اپنے لہو کی حرمت سے منحرف ہو کے جینا سیکھیں۔
وہ سب عقیدے کہ ان گھرانوں میں
ان کی آنکھوں کی رنگتوں کی طرح تسلسل سے چل رہے تھے
سنُا ہے باطل قرار پائے
وہ سب وفاداریاں کہ جن پر لہو کے وعدے حلف ہوئے تھے
وہ آج سے مصلحت کی کھڑیاں شمار ہوں گی
بدن کی وابستگی کا کیا ذکر
روح کے عہدنامے تک فسخ مانے جائیں [۱]

[۱] ۔ پروین شاکر، صد برگ، مشمولہ ماہِ تمام (اسلام آباد، مراد پبلی کیشنز، ۱۹۹۴) ۱۳۵

اس طرح کی دیگر نظمیں ' روزِ سیاہ اور demonetization میں شاعرہ سماجی و معاشرتی پستی و انحطاط کی طرف اشارہ کرتی ہیں 'روزِ سیاہ' میں حق کے لیے سورج اور باطل کے لیے ظلمت کی علامتیں استعمال کر کے معنی و مفہوم کو اُجاگر کرتی ہیں ۔شاعرہ کے نزدیک پورا معاشرہ زوال اور پستی کی طرف آمادہ ہے لوگوں کی نگاہیں اندھیروں کی خوگر ہو چکی ہیں جب قدریں بے مول ہو جائیں روشنی اور تاریکی جیسے لفظ ہم معنی ہو کر رہ جاتے ہیں ۔کیونکہ لوگوں میں بصیرت کا فقدان پایا جاتا ہے جس کی بناء پر وہ اچھے اور بُرے کو پہچان سکیں ۔مجموعی طور پر شاعرہ کے نزدیک پورا معاشرہ بے حسی کا شکار ہو چکا ہے ۔اب کوئی صاحب بصیرت حق و باطل کے فرق کو واضح کرنے کی کوشش کرے تو خلق خدا کے نزدیک وہ کوئی مافوق الفطرت ہستی قرار پاتا ہے ۔نظم کے آخر میں شاعرہ خود سے یہ سوال کرتی ہیں ۔کہ میرے وجدان کا کہنا سچ ہے کہ واقعی سورج قتل ہوا ہے؟ اصل میں شاعرہ اپنی بے پناہ بصیرت کی بناء پر اصل حقائق سے آگاہ ہے ایک اور نظم Demonetization میں بھی نظریہ اور تمثیلی پیرایہ اظہار میں یہی موضوع تکمیل کے مراحل سے گزرا ہے ۔اس نظم میں صالح اقدار کی بے مائیگی کو تند و تیز لہجے میں موضوع سخن بنایا گیا ہے۔ طوالت کے پیش نظر نظم کے چند حصے دیے جاتے ہیں:

قدروں کے نمبر منسوخ ہُوئے
شہر میں کچھ تھا ایسی ٹکسالیں پائی گئی تھیں
جن میں سچ کا چہرہ جھوٹ سے بڑھ کر روشن ڈھلتا تھا
سکون کی نیت میں کھوٹ بہت کم ہونے لگا تھا
وقت کی اصل شناس دہکتی بھٹی میں
سونے اور پیتل کی پرکھ اب تک ممکن تھی!
بازاروں میں لیکن جیسی گرانی تھی

اس عالم میں
افراطِ خواہش، تفریطِ وقت کے ساتھ
نقدِ جاں کی ارزانی ہی ممکن تھی
درہم خودداری، دینار وعزتِ نفس
کوڑیوں کے بھی مول نہ نکلے
اچھا ہُوا
جو ایسی ٹکسالوں پر چھاپے مارے گئے
اور سچائی، نیکی اور عفو اور خودداری کا خزانہ
بحقِ کزب زمانہ ضبط ہوا [ا]

پروین شاکر کی نظمیہ شاعری کے موضوعات کافی رنگارنگ متنوع اور وسیع ہیں۔ یہ نہ صرف ان کے کرب ذات کی کمائی ہے بلکہ غمِ زیست کی کہانی بھی ہے۔ یعنی آپ بیتی بھی ہے اور جگ بیتی بھی، انھیں اس بات کا شدید احساس ہے کہ جاہلیت کے زمانے سے لے کر اب تک یعنی آج کے سائنس اور ٹیکنالوجی کے زمانے میں بھی عورت زندگی کے ہر میدان میں نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ کر رہی ہے اور وقت کافی بدل چکا ہے۔ لیکن عورت کا استحصال بدستور ہو رہا ہے۔

اُسے آج کے جدید معاشرے میں جسمانی عیش و لطف اندوزی کا ذریعہ بھی سمجھا جاتا ہے یہاں کے سب قانون و قاعدے مردوں کے اختراع کردہ ہیں اور عورت کی معصومیت اور مجبوری ان پر عمل آوری کا

ا۔ پروین شاکر، صد برگ مشمولہ ماہِ تمام، (اسلام آباد، مراد پبلی کیشنز ۱۹۹۴) ۲۴۹

باعث بنی ہوئی ہے ۔

اس ضمن میں ''صد برگ'' کی یہ نظمیں جن میں آج کی عورت سے متعلق معاملات ومسائل اُجاگر ہوتے ہیں۔میرے خیال سے نمائندہ نظمیں ہیں۔

لیڈی آف دی ہاوس،تو برمن بلاشندی،کنیا داں،ورکنگ وومین،اسٹینوگرافر، پوسٹ ڈنر آئیٹم،کتوں کا سپاسنامہ،ایک معقول نکاح ،جزبہ وغیرہ نثری نظمیں شامل ہیں۔

'پوسٹ ڈنر آئیٹم' اور کتوں کا سپاسنامہ یہ دونوں نظمیں ڈرامائی طرز پر مشتمل ہیں اوران کے عنوانات سے ہی ظاہر ہوتا ہے کہ طنزیہ آہنگ لیے ہوئے ہیں۔شاعرہ قاری کی توجہ اس طرف مبذول کراتی ہیں کہ جدید دور کی عورت آج بھی کس طرح مردوں کی خوشامد اور چکنی چپڑی باتوں سے استحصال کا شکار ہورہی ہے۔خواہ وہ کسی دفتر میں کام کرنے والے کلرک ہو یا اسٹینوگرافر یا کوئی اور بڑے عہدے پر فائز ہے۔غرض یہ کہ ہر طبقے کی عورت قدم قدم پر کبھی گھٹیا اور اچھے حربوں سے اور کبھی تو مہذب وشائستہ طریقوں سے بھی مردوں کی بیمار ذہنیت کی زد میں آتی رہتی ہے۔

نظم ''پوسٹ ڈنر آئیٹم'' کے شعری کروانے (جو ایک خاتون ہیں) کھانے پہ کچھ لوگوں کو مدعو کیا مگر مہمانوں نے کھانا بنانے والی کے حق میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیے جبکہ وہ شعری کردار خود سمجھتا ہے کہ یہ لوگ مبالغہ آرائی سے کام لے رہے ہیں۔اُسے اس بد نیتی کے پردے میں ان کی کوئی خوائش صاف نظر آرہی ہے ۔اس لیے طنز بھرے انداز میں ان کو منہ توڑ جواب دیا جاتا ہے ۔

آپ کی زُلف کے ہم تو پہلے ہی گویا اسیروں میں تھے
آج تو آپ کے ہاتھ بھی چوم لینے کو جی چاہتا ہے

اتنا مزیدار کھانا پکانا
اتنا بہت کچھ پھر

ہمیں تو کوئی معجزہ ہی لگا
اس پہ حیران کن بات یہ ہے
کہ اتنی تھکن پر
جبین اور ساری پر کوئی شکن تک نہیں
اس ڈنر کے مقابل میں بیگم فلاں کا ڈنر کچھ نہ تھا!
شکریہ
اس پسندگی کا بہت شکریہ
اب یہ فرمائیں، کیا پیش ہو
چائے کافی کہ شاعر[۱]

ان نظموں میں جہاں ایک طرف عورت کے استحصال کے خلاف آواز سنائی دیتی ہے تو دوسری طرف پروین کے مطالعے کی وسعت اور اپنے موضوع پر مکمل گرفت ہونے کا انداز بھی ہوتا ہے۔ جس طرح کے ''کیو بزم کے شاہ پارے، پکاسو کا ہنر، برش دان گاگ کا، رافیل اور ٹشن کی سوچ، ڈومیا کا تخیل، مائیکل انجلو اور ڈونچی کسٹروک، ریمبراں کی مصوری، جان ایک کے اصول کا ذکر کر کے مغربی مصوروں اور تخلیق کاروں کے فن کے بارے میں شاعرہ معلومات فراہم کرتی ہیں۔

''ورکنگ وومین'' اور ''اسٹینو گرافر'' میں مردوں کے شانہ بشانہ کام کرنے والی خواتین کی بے چینی اور گھٹن کو موضوع سخن بنایا گیا ہے کہ اس طرح مردوں کے اس معاشرے میں گھر سے نکل کر عورت کو کن

۱۔ پروین شاکر، صد برگ مشمولہ ماہِ تمام (اسلام آباد، ۱۹۹۴)۲۷۱

مشکلاتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔انھیں مردوں کے تیکھے فقروں اور چھبتی ہوئی نظروں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔اس صورت حال کا سامنا نہ صرف دفتروں میں کام کر لینے والی خواتین کو ہے بلکہ فیکٹریوں کارخانوں اور دیگر اداروں میں کام کرنے والی مزدور پیشہ عورتوں کو بھی اس استحصال کا نشانہ بننا پڑتا ہے۔

نظم ''ایک معقول نکاح'' اور ''کنیا دان'' جیسی نظموں کے موضوعات تقریباً ملتے جلتے ہی ہیں۔ان میں متوسط طبقے کی لڑکیوں کی مجبوری و بے بسی کو منظر عام پر لایا گیا ہے کہ کس طرح یہ معصوم لڑکیاں حالات کے بے رحم تھپڑوں کے آگے اپنے آپ کو بے دست و پا محسوس کرتے ہوئے مجبوری حالات کے آگے سرِتسلیم خم کرتی ہیں۔بھولی بھالی چاندسی لڑکیوں کو ایسے مردوں سے بیاہ دیا جاتا ہے جو شکل وصورت اور عمر یا کسی بھی لحاظ سے ان کے قابل نہیں ہوتے لیکن ان لڑکیوں کے سرپرست یہ سوچ کر مطمئن ہو جاتے ہیں۔کہ تشنہ ہونٹوں، گرسنہ نگاہوں، لٹکتی زبانوں اور بدن گیر غراہٹوں کے عجب گول میں سے ایک ذرا کم ضرر بھیڑیا اپنی نازوں کی پالی کی خاطر چن لائے ہیں۔جس کے پلے باندھ کر اس کے جسم و جان کے رشتے کو برقرار رکھنے کے لیے کم از کم دو وقت کی روٹی کی فکر سے رہائی تو پا لیتے ہیں۔لیکن اس بات سے انجان ہوتے ہیں کہ اس کے عوض ان کی لاڈلی کو عمر بھر کے لیے غم کا موضوع، اُداسی کی تحصیل اور جیسی سوغاتیں کفالت کے لیے ساتھ ساتھ ہوں گی اور اُسے اپنی زندگی کا طویل سفر جلتے سلگتے کی چتا میں جل کر گزارنا ہوگا۔

پروین شاکر کی شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ غیر مرئی عوامل کو مشکل کر دیتی ہیں۔ اور غیر مرئی چیز میں بھی سانس لیتے ہوئے محسوس ہوتی ہیں۔

پروین شاکر کی شاعری میں خاص طور پر ''صد برگ'' میں کربلا کے حوالے سے استعارے اور علامتیں بہت اہمیت رکھتے ہیں جن کے ذریعے وہ اپنے معنی و مفہوم کو زیادہ واضح طور پر اُجاگر کرتی ہیں۔رثائی ادب سے ہٹ کر پچھلے کئی سالوں سے لگ بھگ بیس پچیس برس سے اُردو شاعری میں یہ رجحان ایک نئے تخلیقی رجحان کے

طور پر سامنے آیا ہے اور بہت سے شعراء نے اِسے برتا ہے۔ کربلا کے حوالے سے پانی، فرات، مشکیزہ، علم، سورج ، نیزہ، پیاس جیسے الفاظ بطور علامت و استعارہ کے استعمال ہو رہے ہیں ۔ پروینؔ شاکر کے یہاں بھی اس موضوع کی فراوانی ہے جن سے اُن کے مذہب سے عقیدت اور لگاؤ کا اندازہ ہوتا ہے وہ سماج میں صالح قدروں کے فقدان، خیر و شر کی آویزش، حق کی فتح، نسائی احساس کے درد و کرب کے ساتھ ساتھ جدید دور کے انسان کو درپیش مصائب و آلام، بے بسی و مجبوری اور جہد زندگی کی علامت کے طور پر کربلا کے استعارے کو استعمال کرتی ہیں۔

واوف بعہدک ، کسے کہ کشتہ نہ شد ، علی مُشکل کُشا سے ، ادرکنی ، شامِ غریبان ، یہ تمام نظمیں ایسی ہیں جو استعاروں اور امیجری کے اعتبار سے ''سانحہ کربلا'' کے پسِ منظر سے جڑی ہوئی ہیں۔

نظم ''ادرکنی'' اور ''علی مشکل کشا سے'' میں شاعرہ اس پر آشوب دور کی ہولناکی کے نتیجے میں سسکتی اور کراہتی ہوئی انسانیت کی روح کے لیے اس برگزیدہ ہستی کو خدا کے حضور شفا و مرہم کا وسیلہ بناتی ہوئی نظر آتی ہیں۔

''واوف بعہدک'' نام کی ایک نظم میں حضرت امام حسینؓ کے آخری الفاظ کو بنیاد بنا کر شہادت کا پورا منظر نامہ تخلیق کرتی ہیں جو اپنی ایک ایک جذئیات کے ساتھ نگاہوں کے سامنے ساڑھے چودہ سو برس کی تاریخ کا واقعہ دہرایا دیتا ہے نمونہ کے طور پر اس نظم کا ایک بند:

میں بکھرے ٹکڑوں کو جمع کرتے
بریدہ سر سے بدن نسبت کی تلاش کرتے
کنارہ روح تک شکستہ ہُوں۔ تھک گیا ہُوں
بہت کڑا وقت ہے کہاں اس مجمعؔ عزیزاں میں آج تنہا کھڑا
ہوا ہوں

تمام زخموں سے چور چور ہوں
مگر شہادت گہِ وفا میں
لہو سے رسمِ وضو کی تکمیل کرنے سے قبل
اپنے سجدے کی مستجابی کی تہنیت کچھ کو مل چکی ہے
مرا یہ اعزاز کم نہیں ہے
کہ اتنے تیروں میں ایک بھی تیر وہ نہیں تھا
کہ جو کسی پُشت سے نکالا گیا ہو
ہنگامِ عصرِ مقتل سے سرخُرو ہُوں
کہ میرے توشے میں جتنے وعدے تھے۔اتنے سر ہیں ! [1]

پروین شاکر کی شاعری کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ ''خوشبو'' سے '' کفِ آئینہ'' تک کی مسافت میں جزبات واحساساست کی بڑے موثر انداز میں اس طرح تہذیب کی گئی ہے کہ جزبے سنور اور نکھر کر سامنے آ گئے ہیں اس میں ایک عورت کی زندگی کے مختلف کیفیتوں اور مختلف ادوار پر مشتمل جزبات شامل ہیں خاص طور پر عشق ومحبت جیسے خوش کن اور سرمدی احساسات جو خودرو پودوں کی مانند پھوٹتے ہیں جن سے دل کے نہاں خانے نے خود بخود جگمگا اُٹھتے ہیں۔اس محبت کے عطا کردہ درد بھی راحتیں اورلزتیں بخشتے ہیں۔ 'صد برگ'' میں بھی نشاطِ وصل کی سرشاری اور کیف ومستی کے مختلف رنگ ہیں۔جو درج ذیل نظموں سے منعکس ہوتے ہیں۔ وصال ، سپردگی ، دودھ ، شہد اور شبنم ، بُلاوا ، شرارت ، گیلے بالوں سے چُھنتا سورج ، محبت آشنا ، جمال ہم نشین ، نیگ ، بے پناہی وغیرہ۔

[1]۔ پروین شاکر، صد برگ مشمولہ ماہِ تمام (اسلام آباد، مراد پبلی کیشنز، ۱۹۹۴) ۱۷۴

اِس قبیل کی نظموں میں بہت سیدھے سادھے لفظوں میں حسن وعشق،ہجر ووصال کی کیفیتیں ہیں۔کہیں وسال قرب کی تمنا ہے تو کہیں حسرتیں بھی ہیں اُن کی شاعری میں جذبے کچھ اس طرح سے مجسم ہوئے ہیں کہ بدن، رومان، ولمس کی ساری فضا میں ایک، وقار، پاکیزگی،معصومیت اور رکھ رکھاؤ کا احساس مجغزن رہتا ہے۔ پاکیزہ جزبے لطافت کے ساتھ اظہار پاتے ہیں۔

پروینؔ شاکر کی تیسری کتاب ''خودکلامی'' کے نام سے شائع ہوئی جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے خودکلامی کا مطلب اپنے آپ سے کلام کرنا ہے۔وہ اپنی ذات کے نہاں خانوں میں جھانک کر اپنے ذہن وفکر کے نئے دریچوں سے قارئین کو متعارف کراتی ہیں۔تقدیر کی عطاکردہ ناآسودگیوں اور تنہائیوں کا دبے لفظوں میں گلہ کرتی ہیں۔خودکلامی کے موضوعات غزلوں کی نسبت نظموں میں زیادہ وسیع ہیں۔''خودکلامی'' کی حساس عورت غزل سے زیادہ واضح اور تابناک ہے۔

ایسا بھی نہیں ہے کہ وہ صرف اپنی ذات تک ہی محدود ہوکر رہ گئی ہیں خودکلامی میں اپنی ذات سماج اور کائنات کو سمیٹے ہوئے دیگر مجموعوں کی طرح اس میں بھی سیاسی وسماجی مسائل اور فکر وفلسفہ کے عناصر موجود ہیں۔ البتہ جزبات کا جوش اور والہانہ پن جو''خوشبو'' میں ہے وہ ''صدر برگ''اور''خودکلامی'' میں کم ہیں۔خودکلامی میں شامل زیادہ تر نظمیں علامتی ہیں۔ناانصافی،ظلم اور استحصال کے لئے بھیڑئے کی علامت خاص طور سے استعمال ہوئی ہے۔ انسانیت کی مٹتی ہوئی اقدار پر افسوس کا اظہار یہاں بھی ہوا ہے۔

اِس میں کچھ نظمیں ممتا کے خوبصورت اور پاکیزہ جذبوں سے آراستہ ہیں ایک عورت تخلیق کے مراحل سے گزر کر جو طمانیت وآسودگی محسوس کرتی ہے وہ ان نظموں میں محسوس کی جاسکتی ہے۔یہ نظمیں انھوں نے اپنے اکلوتے بیٹے مراد کے لئے لکھی ہیں۔مثلاً جواز، میرالال ، تیری موہنی صورت، کائنات کے خالق اورنوشتہ میں اپنے بیٹے سے ہم کلام ہیں۔''نوشتہ ''میں اپنے بیٹے سے مخاطب ہوتے ہوئے اِس حقیقت کا برما

اظہار کرتی ہیں کہ دنیا کے دستور کے مطابق ہر بچے کی شناخت اُس کے باپ کے حوالے سے ہوتی ہے۔اگر کوئی بچہ ناسازگاری حالات کے سبب صرف ماں کے ساتھ زندگی گزارنے پر مجبور ہو جائے تو ہمارا سماج اس کے باپ اور بچے کی حیثیت کے بارے میں طرح طرح کے سوالیہ نشان کھڑے کر کے اُس کا جینا دوبھر کر دیتا ہے وہ اپنے بیٹے کے لئے فکرمند ہیں کہ اُسے بھی ''پدر بنیاد'' دنیا میں اپنے یوں ''مادر نشان'' ہونے کی قیمت ادا کرنی پڑے گی'' تیری موہنی صورت'' پیش خدمت ہے۔

ہاں مجھے نہیں پرو ا
اب کسی اندھیرے کی
آنے والی راتوں کے
سب اداس رستوں پر
ایک چاند روشن ہے
تیری موہنی صُورت ا؎

کچھ نظموں میں حسن و عشق ، خود سپرد کی مختلف کیفیتیں بھی اظہار پا گئی ہیں ۔ جس میں دو ساحلی نظمیں ۔ سرشاری ، اُس کی آواز ، آتش بجاں ، ایک وکٹورین شخص سے ، الوداعیہ اور اِک صدا پکارے جاتی ہے ۔تصورات و خیالات کی رُو شاعرہ سے کہاں سے کہاں پہنچا دیتی ہے۔''ایک خوبصورت ڈرائیو'' میں ایک سہانے سے خیال کی طرف متوجہ کرتی ہیں ۔جس کا مقصد یہ ظاہر کرنا ہے کہ من پسند ساتھی کی قربت زندگی کو کتنا دلکش بنا دیتی ہے۔شاہراہِ زیست کے اونچے نیچے رستوں پر چلتے ہوئے ہم مزاج و ہم خیال ساتھی کی ہمراہی کی تمنا کسے نہیں ہوتی ایسا دوست یا ایسا ساتھی جو بن کہے دل سے دل کی بات جان لے۔لیکن یہ

ا؎ پروین شاکر،خود کلامی ،مشمولہ ماہِ تمام (اسلام آباد،مراد پبلی کیشنز،۱۹۹۴) ۲۱

تمنا شاید ہی کسی کی پوری ہوتی ہو ایسے ساتھی ایسے لوگ ہماری زندگیوں میں قوسِ قزح کی طرح ہوتے ہیں ہمارے اندر اُداسی کا موسم چاہے کتنا ہی گہرا کیوں نہ ہو ایسی اُداس راتوں میں ایک اچھا دوست ہم مزاج ساتھی مل جائے تو اُداس لمحے خوشبوؤں سے بھر جاتے ہیں۔ مایوسی بے زاری اور اکتاہٹ کے بادل دل کے آسمان سے چھٹ جاتے ہیں۔ آرزوؤں، امیدوں کی دھنک نگاہوں کے سامنے مسکرانے لگتی ہے۔ تصویر کے خالی خاکوں میں خود بخود شوخ رنگ جھلملانے لگتے ہیں۔ چاروں طرف کائنات رنگ برنگے خوشنما پھولوں سے سج دھج جاتی ہے۔ ایک دم سے زندگی خوبصورت ہو جاتی ہے کہ اس سے پہلے ایسی کبھی نہیں تھی۔ یہ سچ ہے کہ سارے موسم انسان کے دل کے اندر سے پھوٹتے ہیں۔ دل کے موسموں کے سبب ہی باہر کے موسم خوبصورت یا بدصورت معلوم ہوتے ہیں ''ایک خوبصورت ڈرائیو'' سادہ سے انداز میں اسی خیال کو مجسم کیا گیا ہے جس میں سادگی کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ نظم ''ایک خوبصورت ڈرائیو''

اسی راستے پر
میں کب سے سفر کر رہی تھی
کبھی نیم تنہا
اور کبھی دوستوں کی معیت میں
اس طرح سنی
کہ چلتی رہی اور ذرا سمت تک جاننے کی ضرورت نہ سمجھی
مگر آج اِک اجنبی کے
دلآویز، کم بولتے ساتھ میں
ستمبر کی تپتی ہوئی دوپہر میں

میں نے پہلی دفعہ یہ بھی دیکھا
کہ اس راستے پر
دورویہ گلابوں کے تختے بچھے ہیں! [۱]

''خودکلامی'' کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ افرادِ معاشرہ کے منفی رویوں اور اخلاقی اقدار کے فقدان کے سبب اپنے منفرد افکار و خیالات کی بدولت شاعرہ خود کو دیگر لوگوں سے ہم آہنگ نہیں پاتیں تو پھر اپنی ذات کے اندر پناہ لینے پر مجبور ہو جاتی ہیں کئی نظمیں ایسی ہیں جن میں اس صورت حال کا تذکرہ ملتا ہے کہ شاعر خودکلامی سے اپنے اندر کے درد اور بوجھ کو کم کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ اِس مجموعے کی آخری نظم ''خودکلامی'' میں اِسی صورت حال کا تذکرہ ملتا ہے۔ اس میں شاعرہ الجھن میں مبتلا ہیں کہ اُن کے گردوپیش کے لوگ کوئی ایسی زبان بول رہے ہیں جو وہ سمجھ پا رہی ہیں اُن کا خیال ہے یا تو اقدار کے آشوب میں مبتلا معاشرے کی ڈکشنری کوئی اور ہے یا شاعرہ کی اپنی لغت متروک ٹھہری ہے اس لئے اُن کی بات چیت صرف تو دیواروں سے ہے یا پھر اپنے آپ سے ہے اِس لئے اب وہ اِس خدشے میں مبتلا ہیں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اُن کے افکار و خیالات اُن کو اس حد تک دور لے جائیں کہ وہ اس دنیا سے اپنا رابطہ یا راس دنیا سے اپنا رابطہ ہی کھو بیٹھیں۔

چند بند ملاحظ ہیں:

یوں لگتا ہے
جیسے میرے گردوپیش کے لوگ
اِک اور ہی بولتے ہیں

---

[۱]۔ پروین شاکر، خودکلامی مشمولہ ماہِ تمام (اسلام آباد، مراد پبلی کیشنز ۱۹۹۴) ۱۶۷

وہو یولینتھ
جس پر میرا اور اُن کا رابطہ قائم تھا
کسی اور کُرے میں چلی گئی
یا میری لغت متروُک ہوئی
یا ان کا محاورہ اور ہُوا
مرے لفظ مجھے جس راستے پر لے جاتے ہیں ؎

خودکلامی کی ایک نظم'' Mis Fit '' بھی اِسی طرز پر مشتمل ہے اِس میں شاعرہ اِس صورت حال سے پریشان ہیں کہ وہ اپنی دوٹوک باتوں اور اصول پسند طبیعت کی بناء پر لوگوں کو خوش نہیں رکھ سکتھیں لوگ اُن کے تیکھے لہجے کی بناء پر اُن سے ناراض رہتے ہیں ۔ وہ اُن کی من پسند بولی نہیں بول سکھتیں چند بند ملاحظ ہیں:

کبھی کبھی میں سوچتی ہوں
مجھ میں لوگوں کو خوش رکھنے کا ملکہ
اتنا کم کیوں ہے ۔
کچھ لفظوں سے کچھ میرے لہجے سے خفا ہیں
پہلے میری ماں
میری مصروفیت سے
نالاں رہتی تھی
اب یہی گِلہ مجھ سے میرے بیٹے کو ہے

رزق کی اندھی دوڑ میں رشتے کتنے پیچھے رہ جاتے ہیں) ا ؎

نظم کے دوسرے حصے میں ملازمت پیشہ عورت ہونے کے ناطے وقت کی کمی کے سب اپنے عزیز ترین رشتوں سے دوری کا شدید احساس پایا جاتا ہے۔ایک ملازمت پیشے کی عورت گھر اور دفتر دونوں جگہوں پر ذمہ داریوں کے لامتنا بوجھ کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے گھن چکر بنی رہتی ہیں یہ المیہ ہے کہ اِس بھاگ دوڑ کے سلسلے میں اُسے ''نا اہلی'' کا تمغۂ عنایت ہو جاتا ہے۔شاعرہ بنجر ذہنوں کو اپنے شعروں کی ہریالی سے سیراب کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔مگر اُس وقت وہ اس الجھن میں مبتلا ہو جاتی ہیں جب لوگوں کی نظریں لفظوں کی خالق پر ٹھہرتی ہیں وہ اپنی حق تلفی کا شدید احساس رکھتی ہیں اور یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتی ہیں کہ شاید یہ دنیا میرے رہنے کے لئے مناسب جگہ نہیں ہے یہ نظم عورت کی بےبسی و مجبوری اور مردوں کی موقع پرستی پر ہلکے پھلکے انداز میں اشارہ کرتی ہیں جس میں ان کا اپنا مشاہدہ اور تجربہ شامل ہے ۔

شاعرہ کے شعور اور لاشعور میں اور ٹکراؤ اور کشمکش کی کیفیت سامنے آتی ہے یہ اندر کی جنگ ہے۔جس میں نہ انسان جیتتا ہے اور نہ ہارتا ہے یہ جنگ بہت تھکا دینے والی ہوتی ہے۔انسان اندر سے ٹوٹ جاتا ہے، مگر جئے جاتا ہے۔نظم ''چہ کُنم'' میں شاعرہ زندگی کے کسی موڑ پر ایک دوراہے پر کھڑی معلوم ہوتی ہیں وہ فیصلہ نہیں کر پاتیں کہ بے لحاظ رسوائی اور دہشت پا یہ تنہائی کو گلے لگائیں یا دوسری جانب قلعہ بند چاہت میں اپنے دل کی آبروریزی کا تماشہ دیکھتی رہیں۔بند اس طرح ہیں:

بے بسی کے رستے پر

کیا عجب دوراہا ہے

ا ؎۔ پروین شاکر، خود کلامی مشمولہ ماہِ تمام (اسلام آباد، مراد پبلی کیشنز ۱۹۹۴) ۳۱

ایک سمت بے سمتی
بے چراغ تاریکی
بے لباس ویرانی
بے لحاظ رسوائی
بے سودا قربانی
ہشت پایہ تنہائی
اژدری پزیرائی
گرگ زاد غم خواری
بے کنار رو یالی
اور دوسری جانب
قلعہ بند چاہت میں
دل کی آبروریزی! [۱]

پروینؔ شاکر کا چوتھا مجموعہ ''انکار'' ہے جس کا مطلب بقول اُن کے حالات کی غلامی نہ کرنا اور ہار ماننے سے انکار کرنا ہے اِس مجموعے کے نام کی مناسبت سے بھی یہ بات بالکل سچ ہے کہ 'انکار' میں انھوں نے بوسیدہ معاشرتی وسیاسی نظام واقدار روایات کو ماننے سے انکار کیا ہے۔'انکار' میں فکر خیال اور اسلوب کے اعتبار سے اُن کا فن پختگی کی منزلوں تک پہنچ جاتا ہے۔ بیشتر حصہ آزاد اور نثری نظموں پر مشتمل ہے۔

---

[۱]۔ پروینؔ شاکر ،خودکلامی مشمولہ ماہِ تمام،(اسلام آباد،مراد پبلی کیشنز:۱۹۹۴)۱۲۶

موجودہ دور کے شعراء کے یہاں یہ ہیئتیں کافی مقبول ہیں۔اس لئے پروین شاکر نے بھی انکار میں اِس ہیئت کو زیادہ موثر جانا ہے۔اگر احمد ندیم قاسمی نے انکار کے مسودے کو دیکھ کر نثری نظموں پر اعتراض کیا تھا کہ عمدہ موزوں کلام پر قدرت رکھنے والی شاعرہ کو یہ نثری نظمیں شامل کرنے کی کیا ضرورت تھی لیکن پروین شاکر کا اصرار تھا کہ یہ چیزیں اُن پر زاہد بشیر پرنٹرز ریٹگین روڑ لاہور اُسی صورت میں نازل ہوئی ہیں اور وہ اس طرح اپنے انسپیریشن کا کہنا ماننے کے لئے مجبور ہیں۔

'انکار'' میں موضوعات کی فراوانی اور خیالات کی رنگارنگی باقی شعری مجموعوں کی نسبت کچھ زیادہ ہی ہے۔ اس میں اُن ہستیوں کے لئے بھی نظمیں شامل ہیں جو انھیں بہت عزیز ہیں۔جس طرح فیض احمد فیضؔ کے لئے دو نظمیں ہیں۔اس طرح یاسر عرفات اور اپنی دوست پروین قادر آغا کے لئے بھی ایک نظم ہے۔حب الوطنی کے جزبے سے معمور ۶ ستمبر ۱۹۶۷ کے لیے ایک دُعا اور کراچی ۸۹ کی آخری شام،سندھ کی بیٹی کا اپنے رسول سے ایک سوال،سفر خواب،نمائش،نیاگرہ فالز،ویسٹ مسٹرائے،انگریزی رکھنے والی چند نظمیں ہیں۔ Hot line , thy name is San Francisco , vanity اُنکی نظموں میں جو چیز زیادہ متاثر کرتی ہے وہ اِن نظموں میں موضوعات کے علاوہ بناوٹ،ترتیب، آہنگ، اور لفظیات کے اعتبار سے ایک خوبصورت سا احساس کارفرما نظر آتا ہے کیونکہ دلکش تشبیہہ واستعارات اور کائنات میں بکھرے بےشمار رنگوں کو لفظوں میں ابھارنے کے فن میں خاصی مہارت رکھتی ہیں اور اُن رنگوں کی جمالیات سے تراشتے ہوئے پیکر تازگی اور فرحت کا احساس دلاتے ہیں لیکن اُن کی شاعری فنی جمال سے زیادہ جزبے کی سچائی میں ابر کر سامنے آتی ہے اس سلسلے میں بانو قدسیہ کہتی ہیں:

پروینؔ کو الفاظ سے گہری محبت تھی وہ الفاظ کا رنگ چھک لیتی تھی،خوشبو سونگھ لیتی تھی۔رشتے استوار کر لیتی تھی اور بکھیر دیتی تھی اس لئے جب اُس کے الفاظ ہم تک پہنچتے ہیں تو ہم میں نئی کیفیتوں کو جنم

دیتے ہیں '' ۱؎

فیض صاحب کیلئے ایک نظم میں خوبصورت الفاظ وتراکیب ('جوفطرت کے مناظر سے ہم آہنگ ہیں)' کے استعمال سے فیض کے تئیں خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے۔نظم ملاحظ ہو:

تہہِ خاک

کیسا چراغ وقت نے رکھ دیا

کہ سیاہ پوش ہوئی ہوا،

کفِ دستِ بادِصبا سے پھول یہ کیا گرا

چمنِ نگاہ میں اب بہار کہیں نہیں

ہمہ شہر راہ میں اور نگار کہیں نہیں

پُل سبز پر کوئی نجم راہ فروز اب نہیں خیمہ کش

وہ غبار اُٹھا ہے کہ سوجھتا نہیں راستہ

مرے ماہتاب کہاں ہے تو

کوئی اور بھی ہے نظام مہر ونجوم جس کو رواں ہے تو۔ ۲؎

پروین شاکر کی شاعری انسانیت سے محبت کا درس دیتی ہے وہ ایک دانش وراور فلاسفر کی طرح اپنے آس پاس کے مسائل کا مشاہدہ اور تجزیہ کرتی ہیں زبردستوں کے ہاتھوں زیردستوں کے استحصال کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتی ہیں'انکار' میں بھی انسانیت کو درپیش تلخ حقائق غزل اور نظم کے پیرائے میں اظہار پا گئے

۱؎ خوشبو کی ہمسفر مرتبہ ڈاکٹر سلطانہ بخش (اسلام آباد: لفظ لوگ پبلیکیشنز ۲۰۰۲) ۴۶۰

۲؎۔ پروین شاکر،انکار مشمولہ ماہِ تمام (اسلام آباد،مراد پبلی کیشنز ۱۹۹۴) ۲۳

ہیں۔''انکار'' کی ایک نظم ''اسٹیل ملز کا ایک خصوصی مزدور'' قابل ذکر ہیں۔اس میں شاعرہ مزدور کی قابل رحم زندگی کو دیکھتی ہیں۔ جسے جہنمی حرارت میں رہتے ہوئے دہکتی بھٹی میں کوئلے جھونکنے پڑتے ہیں جس کے عوض میں اُسے کم وقت میں زیادہ معاوضہ ملتا ہے لیکن شاعرہ اُسے خودکشی کا معاہدہ سمجھتی ہیں کہ اُس نے مجبوری حالات کی وجہ سے خودکشی کے اس معاہدے پر بقائمی حوش وحواس دستخط کئے ہیں اور اُسے اس بات کا احساس ہی نہیں کہ وہ بھٹی کا ایندھن بن چکا ہے۔'انکار' میں شامل اکثر نظمیں تمثیلی طرز پر مشتمل ہیں اوران کا اختتام ڈرامائی طرز پر ہوتا ہے۔

پروین شاکر نے اپنے آس پاس کی ہر چھوٹی بڑی حقیقت کو بھی اپنی نظموں کا موضوع بنایا ہے۔جس طرح کہ ایک نظم ''ایک سوشل ورکر خاتون کا مسئلہ'' اس میں ایک معصوم بچے کا کردار دکھایا گیا ہے جسے پینے کے پانی کی تلاش ہے سوشل ورکر خاتون اس بچے کو پانی کی تلاش میں سرگرداں دیکھ کر اپنے اندر احساسِ ندامت محسوس کرتی ہے۔کیونکہ وہ اپنے امپوٹڈ پھولوں کو کم پانی ملنے کے سبب مرجھائے جانے کے خیال سے فکر مند ہے اور ادھر زندگی دو گھونٹ پانی کے لئے ترس رہی ہے اور جب نظم میں شاعرہ کا تخلیق کردہ خاتون کردار بچے کو پانی نہ دینے کا غذر تراشتا ہے تو وہ بچے کے احساسات کی منظر کشی اس طرح کرتی ہیں۔ایک U.D.C کی ڈائری میں ایک کلرک کی بیچارگی کا نقشہ کھینچا گیا ہے جس کی ساری زندگی شروع سے آخر تک ایک نئی نہج پر گزرتی ہے جس کی واحد عیاشی ٹوٹی ہوئی پیالی میں چائے پینا اور ادھار سگریٹ مانگنا ہے۔وہ افسروں کی مرضی کے مطابق فائلوں پر نوٹ لکھتا ہے شام کے دم گھونٹنے والی بسوں میں اپنے کو ٹھونس کر جب گھر پہنچتا ہے تو وہاں ایک اور جہنم زار اُس کا مقدر ہوتا ہے اُس کی ساری عمر تنخواہ میں معمولی اضافے اور پراویڈینٹ فنڈ کا حساب کرتے کرتے بیت جاتی ہے اور وہ اپنے سہانے خوابوں کو لوریاں دے دے کر ہمیشہ کی نیند سلا دیتا ہے۔

اِس نظم میں شاعرہ کا طنزیہ انداز اُن کے گہرے مشاہدے اور حساس طبع ہونے کا مظہر ہے۔مثلاً یہ جملہ

ملاحظ ہو۔

''اپنے وجود سے شرمندہ اُن فائلوں کی مانند ہیں جنھیں خود مارک کرنا بھول گیا ہے'' ۱؎

پروینؔ شاکر نے غریب طبقے کی زندگیوں کو درد بھری نظروں سے دیکھا اور محسوس کیا ہے۔ عہد حاضر کے حالات سے دم بخود ہونے اور زندگی کے بوجھ کو ڈھونڈتے رہنے کے کرب کا اظہار کیا گیا ہے۔

نظم ' ایک مشکل سوال ' میں شاعرہ ٹاٹ کے پردے کے پیچھے سے ایک غریب گھر کی بارہ تیرہ سالہ نوخیز کلی کو دیکھ کر رنجیدہ ہو جاتی ہیں اور اِس کا اظہار یوں کرتی ہیں کہ انسان کا دل دکھ درد سے بھر جاتا ہے کہ کتنی تشنہ آرزوئیں اور نا آسودہ ارمانوں کی چتائیں نگاہوں میں پھر جاتی ہیں بند ملاحظ ہیں:

ٹاٹ کے پردوں کے پیچھے سے
ایک بارہ تیرہ سالہ چہرہ جھانکا
وہ چہرہ
بہار کے پہلے پھول کی طرح تازہ تھا
اور آنکھیں
پہلی محبت کی طرح شفاف!
لیکن اُس کے ہاتھ میں
ترکاری کاٹتے رہنے کی لکیریں تھیں
اور اُن لکیروں میں
برتن مانجھے والی راکھ جمی تھی

۱؎۔ پروینؔ شاکر، انکار مشمولہ ماہِ تمام (اسلام آباد، مراد پبلی کیشنز، ۱۹۹۴) ۱۵۷

اس کے ہاتھ اُس کے چہرے سے بیس سال بڑے تھے !۱

عورت کے ساتھ صنفی امتیاز برتنے کے خلاف ایک اور نظم ''بشیرے کی گھر والی ہے'' جس میں ایک پسماندہ سے سماج کی ایک غریب لڑکی کی ساری بدحالی اور مفلوک الحال زندگی کا نقشہ نگاہوں میں گھوم جاتا ہے۔ پروین شاکر اس بات کا گہرا شعور رکھتی ہیں کہ کس طرح ہمارے معاشرے میں لڑکا اور لڑکی میں امتیازی سلوک روا رکھا جاتا ہے اور ہر معاملے میں لڑکے کو لڑکی پر ترجیح دی جاتی ہے چھوٹی سی عمر میں اپنی قد سے بڑی جھاڑو اِس بچی کو تھما دی جاتی ہے اور گائے کو گھاس دینا اس کا مقدر بنتا ہے جب کہ مکھن کی ٹکیہ اُس کے بھائی کے نصیب میں لکھی ہوئی ہے۔ تو اُس صرف جھوٹا موٹا پہننے کو دیا جاتا ہے،۔ گھر کے لوگوں کی خدمت اور تابعداری کا درس دیا جاتا ہے اُس کی ہر سانس پر پہرے بٹھا دئے جاتے ہیں اُسے پتہ بھی نہیں چلتا کہ کب ذمہ داریوں کی بھیڑ میں بچپن رخصت ہوا اور جوانی دستک دینے لگی ابھی وہ بےفکری سے دم بھی نہیں سنبھال پائی ہوتی تو اپنے والدین کی نگاہوں میں کھٹکنے لگتی ہے۔ سولہواں برس لگتے ہی اُس کا باپ اپنے من کا سارا بوجھ دوسرے کے تن پر اُتار دیا جاتا ہے۔ جہاں اُسے اِس سے بھی بدتر صورت حال کا سامنا کرنا پڑتا ہے اِس طرح وہ ظلم وستم کی چکی میں پستی چلی جاتی ہے۔ سنہرے موسم کیسے گزرے خبر ہی نہیں ہوئی جوانی کب آئی اور کب رخصت ہوئی۔ اُس کی لغت اِن باتوں کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی اُس کی حیثیت ایک کام کرنے والی ملازمہ سے بڑھ کر اور کچھ نہیں ہوتی جس کا مقصد صرف اور صرف دوسروں کو آرام پہنچانا اور دوسروں کی خوشنودی حاصل کرنا ہوتا ہے۔ شاعرہ عورت کی بیچارگی و بےبسی پر مضطرب ہو اُٹھتی ہیں تمثیلی انداز کی اِس نظم میں شاعرہ پاکستان کے دور افتادہ علاقوں میں عورت کی پسماندہ صورتحال کے پس منظر میں کفِ افسوس ملتی ہوتی ہیں۔ نظم پیش خدمت ہیں:

۱۔ پروین شاکر، انکار مشمولہ ماہِ تمام (اسلام آباد، مراد پبلی کیشنز، ۱۹۹۴) ۱۶۵

ہے رے تیری کیا اوقات!
دُودھ پلانے والے جانوروں میں
اے سب سے کم اوقات
ڈھوروں ڈنگروں کو بھی
جیٹھ اساڑھ کی دھوپ میں
پیڑ تلے ستانے کی آزادی ہوتی ہے
تیرے بھاگ میں ایسا کوئی سمے نہیں
تیری جیون پگڈنڈی پر کوئی پیڑ نہیں ہے [1]

نظم کے آخری حصے میں شاعرہ عورت کو جھنجوڑ کر بیدار کر رہی ہیں کہ وہ کب تک قربانی کا بکرا بنی رہے گی اپنی ذات کی اہمیت کا احساس کرنا کب سیکھے گی۔

سمے کے ہاتھوں ہوتا رہے گا
کب تک یہ ایمان
ایک نوالہ روٹی،
ایک کٹورے پانی کی خاطر
دیتی رہے گی کب تک تو بلیدان (بشیرے کی گھروالی) [2]

۱۔ پروین شاکر، انکار مشمولہ ماہِ تمام (اسلام آباد، مراد پبلی کیشنز، ۱۹۹۴) ۱۵۴

۲۔ پروین شاکر، انکار مشمولہ ماہِ تمام (اسلام آباد، مراد پبلی کیشنز، ۱۹۹۴) ۱۵۴

عورت کے استحصال کے خلاف ایک اور نظم 'ٹماٹو کیچ اپ، نثری طرزِ اظہار پر مشتمل ہے۔ یہ نظم 'صد برگ' میں شامل 'پوسٹ ڈٹر آئٹم'' 'کتوں کا سپاسنامہ' کی طرز پر مشتمل ہے۔ مرداجارہ داری والے معاشرے میں عورت کے تئیں اُن کی منافقہ ذہنیت کو سامنے لایا گیا ہے کہ کچھ اہلِ قلم حضرات خواتین ادیبہ اور شاعرہ کے ساتھ جھوٹی تعریفوں سے اپنا مطلب حاصل کرنے کی کوششوں میں ہوتے ہیں ہر مرد اپنے آپ کو اُس کا مخاطب سمجھتا ہے لیکن جب حقیقتاً ایسا نہیں ہوتا تو اُس سے دشمنی پر اتر آتا ہے۔ پروین نے اسے ٹماٹو کیچپ کا نام دیا ہے۔

جب تک وہ زندہ رہی
ادب کے رسیا اسے بھنبھوڑتے رہے
اُن کی محفلوں میں اُس کا نام
اب بھی لذیز سمجھا جاتا ہے
بس یہ کہ اب وہ اُس پر دانت نہیں گاڑ سکتے
مرنے کے بعد انھوں نے
اُسے ٹماٹو کیچپ کا درجہ دے دیا (ٹماٹو کیچ اپ) [۱]

اس میں کوئی شک نہیں کہ پروین شاکر کی شاعری نسوانی ہمدردی اور مشرقی روایات میں جکڑی ہوئی ایک بے بس اور مجبور عورت کی داستان سنائی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ اسی موضوع پر بے شمار نظمیں مشتمل ہیں۔ ''ایک دفنائی ہوئی آواز'' میں بھی کم وبیش یہی صورتحال ملتی ہے ذہن ودل جب ہم آہنگ نہ ہوں تو مادی آسائشیں بے معنی ہوکر رہ جاتی ہیں۔ ایک تعلیم یافتہ خاتون صرف دو وقت کے کھانے اور تن کے کپڑوں اور دیگر ضروریات

---

[۱] پروین شاکر، انکار مشمولہ ماہِ تمام (اسلام آباد،۱۹۹۴)۱۶۱

کے پورا ہونے پر ہی مطمئن نہیں ہوتی بلکہ اُسے اپنے جیون ساتھی سے ذہنی وجذباتی ہم آہنگی اور اُس کے بھر پور تعاون خواہش ہوتی ہے اگر وہ نہ ملے تو اندر کی آواز بار بار پکارتی ہے کہ کچھ کمی ہے خواہشوں اور ارمانوں پر چاہے کتنے ہی پہرے بٹھائے جائیں ہر چیز اپنی اصلیت کی طرف لوٹتی ہے انسان اپنے اندر کی آواز کو آخر کب تک دبا سکتا ہے اس نظم میں ایک عورت کی نفسیاتی الجھن اور داخلی کشمکش کو بہت خوبصورت پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ نظم ایک دفنائی ہوئی آواز'': پیش خدمت ہیں:

پھولوں اور کتابوں سے آراستہ گھر ہے
تن کی ہر آسائش دینے والا ساتھی
آنکھوں کو ٹھنڈک پہچانے والا بچہ
لیکن اس آسائش اور ٹھنڈک کے رنگ محل میں
جہاں کہیں جاتی ہوں
بنیادوں میں بے حد گہری چُنی ہوئی
اک آواز برابر گریہ کرتی ہے
مجھے نکالو!
مجھے نکالو! [۱]

اس باب میں پہلے بھی ذکر کیا جا چکا ہے کہ پروینؔ شاکر کی شناخت اگر چہ نسائی حسیت یا تانیثی شاعری کے حوالے سے ہی ہے لیکن وہ خواتین کے مسائل سے قطع نظر ایک باشعور رکھتی تھیں اپنے افکار ونظریات کے اعتبار

۱۔ پروینؔ شاکر، انکار مشمولہ ماہِ تمام (اسلام آباد،۱۹۹۴) ۳۵

سے جدت پسند اور روشن خیال تھیں جس کا ثبوت 'روز نامہ جنگ' میں چھپنے والے اُن کے کالم ہیں پہلے باب میں کالموں کا ذکر تفصیل کے ساتھ کیا گیا ہے۔انھوں نے بڑی باریک بینی سے اپنے دور کے سیاسی حالات کا تجزیہ کیا وہ دور چونکہ مارشل لا (فوجی قوانین) کا ء تھا۔مظلوم عوام آمریت کے سایہ میں سسک رہے تھے۔ جمہوری قدریں پامال ہورہی تھیں سماج کا دانشور طبقہ ذہنی کراب واضطراب میں مبتلا تھا۔

مشاہدے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ 'انکار' کے بعد پروین شاکر کی شاعری آخر تک ''انکار' ہی کی راہ پر گامزن رہی کیونکہ انکار کے بعد پروین شاکر نے اپنا اندازِ فکر اورموضوع سکن متعین کر لیا تھا۔ جو ''کفِ آئینہ'' تک بدستور قائم رہا۔''انکار'' میں شامل اُن کی نظمیں اُس دور کے سیاسی منظر نامے کو پوری طرح سے اُجاگر کرتی ہیں انھوں نے بہت بے باکی سے اُن نام نہاد رہنماؤں پر نکتہ چینی کی ہے جو اپنے ظالمانہ و اقتدار کو طول دینے کی خاطر قوم کی جان و مال کا سودا کر کے عوام پر ظلم و جبر کا ہاتھ دراز کرتے ہیں جو عوام کے محافظ ہونے کا دعویٰ تو کرتے ہیں لیکن پھر لٹیروں کی فہرست میں بھی یہی لوگ شامل ہو جاتے ہیں اس طرح کی نظمیں ''خود کلامی'' اور انکار'' میں کافی تعداد میں ہیں۔

شہزادی کا المیہ حبس بہت ہے دل چاہتا ہے چیلنج ایسی نظمیں ہیں جن میں سیاسی موضوعات زیرِ بحث لائے گئے ہیں۔

پروین شاکر کا شعری مجموعہ ''کفِ آئینہ'' تک پہنچ کر اختتام پزیر ہو جاتا ہے۔''کفِ آئینہ'' پانچویں اور آخری کتاب ثابت ہوئی اس مجموعے میں اکیس نظمیں ہیں کچھ بلا عنوان ہیں اور کہیں کہیں نظم کا پہلا مصرعہ عنوان کے طور پر دیا گیا ہے اس کتاب کی شاعری ملے جلے احساسات سے عبارت ہے اُن کا لہجہ بھی بجھا بجھا سا اور تھکا تھکا سا محسوس ہوتا ہے اُداسی اور خالی پن کا احساس قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ایک ایسا خالی پن جس میں نہ تو کوئی تمنا جاگتی ہے اور نہ کوئی آواز جاگتی ہے اور نہ کوئی آرزو جنم لیتی ہے نہ ہی آنکھوں میں حسین

خوابوں کا بسیرا ہوتا ہے بس وہ صرف اتنا کر سکتی ہیں کہ غموں کے اس انمول خزانے کو جو دل کے نہاں خانوں میں بہت قیمت کر رکھا ہوا ہے جھانکتی رہتی ہیں اس طرح درد سے توانائی اور زندگی پانے کا ہنر حاصل کر لیتی ہیں۔اس طرح کی نظمیں سوادِ زندگانی میں 'ایک خالی دوپہر' ''اسیر شام'' تنہائی سے گلہ کیسا' 'اس طرح کی ویرانی اور سنڈریلا تنہائی اور اُداسی جیسے جزبات واحساسات کی نمائندگی کرتی ہیں۔عورت کی تڑپتی آرزوئیں، ناآسودہ ارمان، عورت کا بے تہی ودست وجود زندگی کا سونا پن''کفِ آئینہ'' میں بہت واضح طور پر ابھر کر سامنے آتا ہے۔جس میں ہونے یا نہ ہونے کا احساس ختم ہوگیا ہے شاعرہ اپنی روح میں ایک خلا محسوس کرتی ہیں۔بند اس طرح ہے:

میں بابر کی تمازت سے
جھلس کر آئی تو دیکھا
مرے گھر میں بھی ویسی دھوپ میری منتظر تھی

پروینؔ شاکر کی نظمیہ شاعری میں حکایت نگاری کا اسلوب پایا جاتا ہے ۔ داستانوی وطلسماتی فضا دونوں شعری اصناف میں پائی جاتی ہے۔جس سے پُرانے قصے کہانیوں کی یادیں تازہ ہو جاتی ہیں۔جو ہمیں مجید امجدؔ، ن م راشدؔ ،ابن انشاءؔ، اور منیر نیازیؔ کے یہاں ملتی ہیں۔نظم'' سنڈریلا'' میں قاری کو لوک کہانیوں کی پرانی تلمیح کی طرف متوجہ کرتی ہیں جس کے ذریعے بیانیہ انداز میں خوابوں کے ٹوٹنے اور بکھرنے کا المیہ بیان کیا گیا ہے۔شروع میں ایک طلسماتی فضا تراشی گئی ہے ایک ان دیکھا سحر انگیز خواب ایک اچھوتی خواہش کو پروان چڑھتے ہوئے دیکھا گیا ہے آنگن سے آسمان تک روشن دیے، تازہ گلابوں کی مہک، چمن سے صحنِ چمن تک پھیلی ہوئی ہے، بلوریں جام ،ستاروں سے بنا ملبوس، سراپا شوق واضطراب اِک شہزادہ قاری ایک ان دیکھی تخیلی دنیا میں پہنچ جاتا ہے جہاں صرف رنگ و بو کا سیلاب ہے زندگی خوشبوئیں اور مسرتیں

لٹا رہی ہے لیکن اچانک ڈرامائی انداز میں یہ سحر انگیز خواب ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے کیونکہ اس سے پہلے کی گھڑی کی سوئیاں بارہ کا گھنٹا بجاتیں ''سنڈریلا'' کو رقص ادھورا چھوڑ کر اپنی بدنصیب اور غریب دنیا میں واپس آنا پڑتا ہے لیکن یہاں شاعرہ ایک ایک بدقسمت 'سنڈریلا'' ہے۔ جس کے تعاقب میں کوئی شہزادہ کوئی قاصد شاہی محل سے اُس کے دوسرے پاؤں کی جوتی لے کر صدائیں نہیں لگاتا۔ زندگی کی کڑی دھوپ اُس کے تن من کو جھلسا دینے کے لئے کافی ہوتی ہے نظم سنڈریلا کا آخری حصہ:

گجر بجتے ہی آدھی رات
یہ خواب یکدم ٹوٹ جاتا ہے
ستاروں سے بنا ملبوس میرا
پھر خس و خاشاک ہو جاتا ہے
میرا رتھ اچانک ٹوٹ جاتا ہے
مری شیشے کی جوتی رقص گاہ میں چھوٹ جاتی ہے!
مگر اگلی سحر
میری طرف
شاہی محل
کوئی قاصد
دوسرے پاؤں کی فرقت میں نہیں آتا! [۱]

---

[۱] پروین شاکر، کفِ آئینہ مشمولہ ماہِ تمام (مراد پبلی کیشنز: ۱۹۹۴ء) ۱۰۲

''کفِ آئینہ'' کی اکثر نظموں میں شاعرہ کبھی تقدیر سے اور کبھی خدا سے گلہ کرتی ہوئی نظر آتی ہیں کبھی تو یہ سوچ کر اپنے آپ کو تسلیوں سے بہلاتی ہیں۔ کہ نقاش ازل کچھ نقش ایسے بناتا ہے جو کبھی روشن نہیں ہو سکتے اپنے مقدر کی لکیروں کی شاکی ہیں کہ خدا نے جس وقت اُن کی تقدیر کا لکھا وہ شاید آدھی رات کا وقت ہوگا جب اُس کی پیالے میں سیاہی کے سوا کچھ نہیں تھا ۔

پروینؔ شاکر کی شاعری میں اُداسی ،بے چینی، درد و کرب ،جیسی محسوسات کا تعلق براہ راست اُن کی اپنی ذات سے بھی ہے اور معاشرے اور ملک کی سیاسی و سماجی حالات اور قتل و غارت گری کے نتیجے میں پیدا شدہ غیر یقینی صورتحال سے بھی جس کا ذکر وہ چاروں مجموعوں میں کر چکی ہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ پروینؔ شاکر کی شاعری فکر و شعور اور جذبے و احساس کی نئی جہتوں سے عبارت ہے جو جدید حسیت اور جدید دور کے ذہنی رویوں سے مالا مال ہے اُن کی شاعری شگفتگی اور لطافت کا مرقع ہے احتجاجی انداز کی نظموں میں طنز اور تنقید کی کاٹ پائی جاتی ہے۔

نظمیہ شاعری کے موضوعات بے حد وسیع ہیں۔ بلا شبہ اُردو شاعری کو پروینؔ شاکر نے نئے امکانات سے متعارف کرایا۔ اُن کی نظمیہ شاعری نے اُردو نظم کے فروغ میں رجحان ساز کردار ادا کیا۔نسوانی احساسات کو جس جزبے کی سچائی کے ساتھ پیش کیا وہ صرف انہی کے لئے مخصوص ہو کر رہ گیا۔

یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری کے بعد میں آنے والوں کے لئے ایک قابل تقلید نمونہ بنی ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

باب سوم

پروینؔ شاکر کی غزل گوئی

(الف) اردو غزل گوئی کا منظر نامہ

(ب) غزل گوئی میں پروینؔ شاکر کا اجتہاد

(الف) اردو غزل گوئی کا منظر نامہ

غزل کے بارے میں مختلف مفکرین و ناقدین اتنا کچھ لکھ چکے ہیں کہ اب اس موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے اِس بحث کی کوئی گنجائش نہیں کہ بقول کلیم الدین احمد، ''غزل نیم وحشی صنفِ سخن ہے'' یا رشید احمد صدیقی کے مطابق ''غزل اُردو شاعری کی آبرو ہے'' یا آل احمد سرور کے مطابق ''تلوار کی دھار اور چاول پر قل ھواللہ لکھنے کا فن ہے''۔

سچ تو یہ ہے کہ غزل کو شروع سے ہی اُردو شاعری کی مقبول ترین صنف ہے جو شروع سے آج تک اپنا مقام بنائے رکھی ہے۔ اُردو شاعری میں بدلتے حالات کے ساتھ ساتھ کئی اصناف کا اضافہ ہوا لیکن غزل کی افادیت اور اہمیت اپنی جگہ برقرار ہے۔ اردو شاعری میں غزل کے سوا بھی بہت کچھ ہے، قصیدہ ہے، مرثیہ ہے، مثنوی ہے مگر جو قبولِ عام غزل کو ہوا وہ کسی اور صنف کو نصیب نہ ہوسکا۔ طرفہ تماشہ کہ اردو میں جس وقت سے تنقید کا باقاعدہ آغاز ہوا اسی وقت غزل کی مخالفت شروع ہوئی اور ہر دور میں محبوب صنف سخن کی حیثیت سے لوگوں کے دلوں پر حکمرانی بھی کرتی رہی ہے۔ اس نے زمانے کے کہی نشیب وفراز بھی دیکھے ہیں اور ان سے بہ احسن و خوبی عہدہ برا بھی ہوتی رہی۔ بلکہ زمانے کے اعتراضات اور مخالفتوں کا سامنا کرتے ہوئے اپنے جود کو منواتی بھی رہی۔ یہی وجہ ہے کہ یہ صنف آج پوری توانائی، طاقت اور دلکشی کے ساتھ قائم ودائم اور ہر دل عزیز ہے۔ غزل کی مقبولیت کا سبب یہ بھی ہے کہ اس کا خاص موضوع عشق رہا ہے اور عشق وہ جزبہ ہے جس سے کوئی دل خالی نہیں، یوں کہ عشق کے ہزار روپ مرد کا عورت یا عورت کا مرد سے عشق، ماں باپ کا اولاد یا اولاد کا ماں باپ سے عشق۔ ملک وقوم پر جان نچھاور کرنے کا نام بھی عشق ہے۔ کسی عظیم مقصد کی والہانہ لگن بھی عشق ہے۔ مرشد سے مرید کی عقیدت بھی عشق ہے اور اس سے ارفع واعلیٰ عشق وہ ہے جو انسان کو محبوب حقیقی یعنی خدا سے ہوتا

ہے۔ظاہر ہے ایسا کوئی دل نہیں عشق کا تیر جس کے پار نہ ہوا ہو۔ چنانچہ جزبہ عشق کی تاثیر مسلم ہے اور غزل اپنی ابتدائی منزل میں اسی جزبے کے اظہار کے لئے وقف تھی۔غزل کی مقبولیت کی تمام وجوہات میں سے ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس کی خمیر عشق، محبت اور اسی طرح کہ انسان کی دلی جزبات کی حرارت موجود ہے جس کے بغیر انسانی زندگی نامکمل ہے۔اُردو غزل کی تاریخ کا جائزہ لیں تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ غزل نے ہمیشہ بدلتے ہوئے زمانے کا ساتھ دیا ہے اور ہر دور میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کو اپنے اندر سمولیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ زندگی کا ہر پہلو، ہر نقش، ہر روپ ہمیں غزل میں جیتا جاگتا نظر آتا ہے۔ جہاں تک غزل کے موضوعات کا تعلق ہے اس مقبول و معتبر صنف کو یہ صلاحیت حاصل ہے کہ زندگی کے ہر موضوع کا احاطہ کر سکے۔ایک عرصے تک غزل کا موضوع ہجر و وصال کی داستانوں اور عاشقانہ معاملہ بندیوں تک محدود تھا۔بعد میں اس میں تصوف، اخلاق، تمدن، مذہب، سیاست، مناظر قدرت اور حکیمانہ خیالات بھی بیان ہونے لگے۔

اس طرح غزل کا دامن وسیع ہو گیا۔انسانی زندگی جتنی وسیع ہے غزل کے موضوعات بھی اتنے ہی وسیع ہونے لگے۔حیات و کائنات کا کوئی ایسا موضوع نہیں جو کامیابی کے ساتھ غزل میں پیش نہ کیا گیا ہو۔

غزل کا ہر شعر ایک ایسے جذ کی مانند ہے جو غزل کا حصہ ہوتے ہوئے اُس سے الگ بھی ہے۔ یہ شعر ایک الگ اکائی کی حیثیت بھی رکھتا ہے اور غزل سے جڑا ہوا بھی ہے۔غزل مزاجاً گیت کی اساس پر استوار ہے۔اِس میں گیت کی خالص فضا ہمیشہ موجود رہتی ہے۔اِس سلسلے میں وزیر آغا اُردو شاعری کے مزاج میں اس طرح سے اظہار خیال کرتے ہیں۔

" گیت انسانی زندگی کے اُس دور کا مظہر ہے۔جس میں جُزو کل کے اندر ہے
لیکن غزل اُس دور کی علم بردار ہے جس میں جُزو نے کل کی فضا باہر نکل کر

اپنے وجود کا اعلان کر دیا ہے۔مگر کل سے اُس کی وابستگی بدستور قائم ہے [۱]

غزل میں جزبے اور تخیل کی آمیزش کو کافی اہمیت حاصل ہے جز بے کی لطیف اور نہایت ہی ارفع شکل تخیل کہلاتی ہے۔جب جذ بے کی بنیاد پر تخیل کی پرواز جنم لیتی ہے تو غزل وجود میں آتی ہے۔

غزل کا فن رمز وایما کا فن ہے یعنی غزل کا شاعر اشارے کنایے میں باتیں کرتا ہے اور وہ ایسا کرنے پر مجبور ہے عام طور پر غزل کا شعر ایک مکمل اکائی ہوتا ہے۔شاعر کو اپنا تجربہ یا اپنی واردات ایک شعر میں سمو دینی پڑتی ہے کیسا ہی پیچیدہ تجربہ کیوں نہ ہو اسے پیش کرنے کے لئے شاعر کو بس دومصرعوں کا ننھا سا پیمانہ میسر ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ ایسے کمالِ فن کا مظاہرہ کرتا ہے اور ایسی تدبیریں اختیار کرتا ہے کہ وہ جس تجربے سے دوچار ہوا۔وہ ان اشاروں کا مطلب خود نکال لیتا ہے۔مثلاً شاعر کہتا ہے:

نہ ہم سمجھے، نہ آپ آئے کہیں سے

پسینہ پونچھتے اپنی جبیں سے

شاعر نے یہ نہیں بتایا کہ ہم اور آپ سے کیا مراد ہے لیکن ہم سمجھ لیتے ہیں کہ ہم عاشق کے لئے استعمال ہوا ہے اور آپ محبوب کے لیے۔محبوب کہاں سے آرہا ہے یہ بھی نہیں بتایا جاتا لیکن یہ سمجھنے میں دشواری نہیں ہوتی کہ وہ رقیب کے گھر سے آرہا ہے۔دوسری تدبیر جس سے کام لیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ شاعر کچھ بیان کرتا ہے اور کچھ قاری کے تخیل پر چھوڑ دیتا ہے۔

غزل رمز وایمائت کا فن ہے۔انسان کی داخلی کیفیات اور زندگی کے تجربات ومشاہدات کا بیان رمز و کنایہ اور تمثیل کے اسلوب میں کیا جاتا ہے۔اس لیے رمز واشارے کے پردے میں معنی ومفہوم کی ایک دنیا آباد رہتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ غزل میں اختصار و جامعیت پائی جاتی ہے ایک شعر کے دومصرعوں میں کوئی بھی

---

[۱] وزیر آغا: اردو شاعری کا مزاج (دہلی، روشان پرنٹرس، ۲۰۱۷) ۱۸۷

خیال تکمیل تک پہنچ جاتا ہے۔

غزل چونکہ شاعر کی داخلی جذبات اور وارداتِ قلبی کی آئینہ داری کرتی ہے اس لیے اس میں خارجی تجربات و مشاہدات کا بیان بھی داخلی احساس کے آئینوں میں منعکس ہوتے ہوئے صفحہ قرطاس پر منتقل ہو جاتا ہے۔اس طرح غزل میں ذاتی تجربات ومحسوسات کو آفاقی جہت حاصل ہو جاتی ہے۔غزل کی تمام تر شاعری علامتی ہے اس میں براہِ راست بات کہنے کے بجائے علامتوں سے کام لیا جاتا ہے۔جس طرح ساقی ،میخانہ یا خمریات سے وابستہ دیگر لوازمات گُل ،،بلبل ،شمع و پروانہ ،دارورسن ،سبزہ گل ،قطرو دریا ،صیاو کفر وایمان ،شیخ زاہد وغیرہ اِن علامتوں کے ذریعے معانی کے دریا بہائے گئے ہیں۔

یہ علامتیں کثرت سے استعمال ہوئی ہیں ۔اِس لیے اِن علامتوں کی برت اور تنوع میں کمی آگئی ہے۔فنِ غزل میں جدید علامتیں بھی وضع کی گئی ہیں ۔جس طرح کہ اقبالؔ نے شاہین کو مردِ ملوت اور لالہ بیضا کی علامت کے طور پر استعمال کیا ہے۔شاہین خودداری اور تگ ودو کی علامت ہے جبکہ ابلیس عشق اور جہد وعمل کی علامت ہے ۔کبوتر کمزوری اور بزدلی کی علامت ہے اِس طرح اقبالؔ نے عشق ،جنسی جزبے کے بجائے انسانوں کے اخلاقی اور سماجی ارتقاء کی علامت کے طور پر استعمال کیا ہے۔

سیاسی و سماجی شعور بیدار ہونے کے ساتھ رہبر ، رہزن ،منزل وغیرہ علامات کے ساتھ نئے موضوعات غزل میں داخل ہوئے۔اس کے علاوہ ایسی علامتیں بھی وضع کی گئی ہیں جو ہمارے تہذیبی اور ثقافتی زندگی کی حدود کو متعین کرتی ہیں اور ہمارے شعور کو آگے بڑھاتی ہیں۔

سوز وگزار غزل کی بنیادی لوازمات میں سے ہے۔درد وغم کی کیفیات کے اظہار کے لیے غزل کی لے بہت مدھم ہونی چاہیے۔شاعر جس قدر دھیمے سروں میں اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے۔غزل اتنی ہی دل پذیر ہوتی ہے۔

اب نئی غزل میں پُرانے مضامین بھی ہیں اور نئے بھی ہیں لیکن پُرانے مضامین نئے ڈھنگ سے اس طرح پیش کئے جاتے ہیں جو اپنے طرزِ اظہار کی بدولت نئے پن کا احساس دلاتے ہیں۔

اُردو غزل دیسی پیداوار نہیں ہے وہ فارسی سے پیدا ہوئی اور فارسی کے نمونے اُس کے پیش نظر تھے۔فارسی و عروض نے جو عربوں کی ایجاد تھا اُردو شاعری پر بہت بڑا اثر کیا۔بحور اور قواعد عروض میں بھی فارسی کا اتباع کیا گیا۔رفتہ رفتہ یہ غیر ملکی پودا جڑ پکڑ گیا اور اس کو اس ملک کی آب و ہوا راس آئی۔بحروں کے علاوہ شعرائے اُردو نے فارسی ہی کی تشبیہیں اور وہی مضامین اخز کئے اور سب چیزیں بلالحاظ ملکی ضروریات کے اور بلا امتیاز اس کے کہ اردو زبان کی اصل کیا تھی اور استعداد کس قدر تھی، داخل زبانیں ہو گئیں اور ہمارے شعرائے اُردو کا مایہ بساط بن گئیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ اُردو شاعری اور ادب کی ابتداء دکن میں ہوئی اِس لئے تاریخی اعتبار سے دیکھا جائے تو شعر وادب کی باقاعدہ صورت اور ترقی دکن سے ہی شروع ہوتی ہوئی نظر آتی ہے۔وہاں کی قطب شاہی اور عادل شاہی سلطنتوں نے ادب کی ترقی میں نمایاں کردار ادا کیا۔بلکہ قطب شاہی سلطنت کا پانچواں حکمران محمد قلی قطب شاہ پہلا غزل گو شاعر مانا جاتا ہے۔اگر چہ اُس سے پہلے بھی کچھ شعراء کا کلام ملتا ہے۔مگر انہیں پہلا صاحب دیوان ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔اُن کا دیوان پچاس ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔جس میں ۲۱۳ مسلسل غزلیں ہیں جو سادگی، روانی اور برجستگی کے اعتبار سے بے مثال ہیں۔ان میں فارسی غزل کی تقلید کا رجحان ہے لیکن فضا اور خیالات کے اعتبار سے اِن میں ہندی تہذیب وتمدن کی عکاسی ہوتی ہے۔اُن کے یہاں ترجمے بھی ہیں ۔خاص طور پر حافظ کی غزلوں کا اُردو ترجمہ کیا گیا ہے۔لیکن ایک کمی اُن کے یہاں پائی جاتی ہے کہ وہ اُردو میں تغزل کی روایت کو منتقل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔اس لیے وہ فکری عنصر اور فنکرانہ شعور جو فارسی شعراء کا خاصہ تھا اُن کے یہاں مفقود ہے۔لیکن اِس کے باوجود اُن کی غزلیں غزل کی زمین ہموار کرنے میں ابتدائی

کاوش کے طور پر قابلِ توجہ ہیں۔ اُن کی غزل کے دو اشعار ملاحظ کریں جن سے فارسی شاعری کی پیروی کا رجحان واضح ہوتا ہے۔

ے　ے　کے　بنیاد　مست کا تمن دیکھ　زاہد　و　جاہل
کروں　کعبہ میں سجدہ　ہر کد کوئی کہیں گے مو
ے　ازل تھی ہم تمن میں باری ہے اے پیر مئے خانہ
عجب کیا ہے　چھپا کو　دیو مئے　مجھکو　پیالی دو　[۱]

محمد قلی قطبؔ شاہ کے بعد عبداللہ قطب شاہ، شاہی، وجہی، غواصی، شوقی، ہاشمی اور نڈرتی اور غزل کے ابتدائی کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ جنھوں نے دکنی غزل کی روایت کو آگے بڑھانے میں نمایاں　نمائندے کردار ادا کیا لیکن اُن کے یہاں کوئی نیا پن دکھائی نہیں دیتا۔ اُن کے پیش نظر چونکہ فارسی　شاعری کے نمونے تھے ِاس لیے اُن کے یہاں　نہ صرف خیال و مضمون آفرینی کے اعتبار سے بلکہ الفاظ و تراکیب اور تشبیہہ و استعارات کے استعمال میں بھی فارسی غزل کی تقلید کا رجحان عام ملتا ہے۔ فارسی شاعری کے تتبع کے ساتھ ساتھ اس دور کی غزل میں ہندی گیت　کا لب و لہجہ اور اثرات بھی شامل ہوتے رہے جس کی وجہ سے مجموعی طور پر دیکھا جائے تو دکنی دور کی غزل ہیئت کے اعتبار سے　ایرانی اور مزاج کے اعتبار سے ہندی رنگ میں رنگی ہوئی معلوم ہوتی ہے ایسا لگتا ہے کہ اُس دور کی غزل ایک دوراہے پر کھڑی ہوئی ہے جسے نہ تو گیت کہہ سکتے ہیں اور نہ ہی غزل کے اصل مزاج کی نمائندگی کرتی ہے　اُس　دور کی غزل کا نمونہ　پیش خدمت ہے جس میں ہندی لب و　لہجہ　کی آمیزش کچھ اس طرح　سے ہے

---

[۱] جمیل جالبی: تاریخ ادب اُردو (دہلی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس ۱۹۹۲) ۴۱۹

تو پیاری عشق بھی تیرا ہے پیارا
لگتا ہے بہوت تج سوں دل ہمارا
سکھی کچ بھی سمجھ توں دل میں اپنے
کتا منت کرے عاشق بچارا [1] عبداللہ قطب شاہ

شمالی ہند میں اُردو غزل گوئی کا آغاز اٹھارویں صدی عیسوی کی ابتداء کے ساتھ ولی دکنی کی آمد کے بعد شروع ہوتا ہے ولی کی حیثیت ایک پل کی سی ہے جو دکن اور شمالی ہند کو شعری سطح پر ملاتا ہے۔

وؔلی دکنی کے زمانے تک پہنچتے پہنچتے غزل کی صنف نے ترقی کی بلندیوں کو چُھو لیا۔ اندازِ بیان اور زبان میں نمایاں تبدیلی آ گئی ۔ فارسی الفاظ اور تراکیب کا استعمال ہونے لگا ۔ غزل میں خارجیت کے بجائے داخلی جزبات اور قلبی احساسات کا اظہار ہونے لگا ۔ وؔلی کے اشعار سادہ اور عام فہم ہیں ۔ انھوں نے مختلف صنائع کا استعمال کر کے صنف غزل کو دلکش اور جاذِب نظر بنایا۔

مفلسی سب بہار کھوتی ہے
مرد کا اعتبار کھوتی ہے

اردو شاعری کا رواج دہلی میں اس وقت عام ہوا جب وؔلی دکنی کا دیوان وہاں پہنچا اور ہر خاص و عام نے اس کی سراہنا کی ۔ شاعری کا ذوق رکھنے والوں میں ولی دکؔنی کے اندازِ بیان اور ان کے موضوعات کو بہت پسند کیا ہیں کہ انہوں نے بھی تقلید کا راستہ اختیار کیا۔ گویا وؔلی کے دیوان نے دلی کی مزاج میں کانپنے کی صورت پیدا کیں ۔ جب دیوان پہنچا تو اُس وقت وہاں زیادہ تر فارسی میں شاعری ہو رہی تھی ۔ اُردو کو شاعری کے لیے قابلِ

---

[1] وزیر آغا اُردو شاعری کا مزاج (نئی دہلی سمانت پرکاشن دریا گنج ۲۰۰۰)۲۳۶

اعتنا گردانا نہیں جاتا تھا۔ فارسی ہی علمی و ادبی زبان سمجھی جاتی تھی ۔ ولیؔ نے سعداللہ دیوان سے شمالی ہند اُردو شاعری کے لیے ماحول سازگار ہوگیا۔ شعراء کا میلان اُردو کی طرف بڑھ گیا یہی وجہ ہے کہ اُردو شاعری روز بروز مقبول ہوتی رہی ۔ ولیؔ نے غزل کو نئی جہتیں عطا کر کے غزل کا مزاج ہی بدل دیا۔ غزل کے صحیح خدوخال اور فنی خصائص ولیؔ کے یہاں ابھر کو سامنے آئے ۔ ولی نے غزل کو گیت کی محدود فضا سے باہر نکال کر نہ صرف تجربات محسوسات بلکہ موضوعات اور اظہارِ بیان کے لحاظ سے بھی نئی وسعتوں سے ہمکنار کیا۔ اس طرح ولیؔ کی غزل کی کڑیاں اٹھارویں صدی کی ترقی یافتہ غزل سے جاملتی ہیں۔ ذیل میں ولیؔ کی غزلوں کے تین اشعار نمونے کے طور پر دئے جاتے ہیں جو تین ادوار سے متعلق ہیں کہ تیسرے دور کی شاعری کا انداز دوسرے اور پہلے دور کی شاعری سے کس قدر مختلف تھا۔

تیرے بن مجھ کو اے ساجن تو گھر اور بار کیا کرنا
اگر تو نا اچھے مجھ کن تو یہ سنسار کیا کرنا

تجھ لب کی صفت لعلِ بدخشاں سوں کہوں گا
جادو ہیں تیرے نین غزالاں سوں کہوں گا

زندگی جامِ عیش ہے لیکن
فائدہ کیا اگر مدام نہیں [1]

دکنی غزل کا یہ دور سو سال کے طویل عرصے پر محیط ہے ولی دکنیؔ اور سراجؔ دکنی اس دور کے آخری نمائندے ہیں سراجؔ کے ہاں اخلاق، تصوف، حسن و عشق کے مضامین پائے جاتے ہیں۔ ولیؔ کے بعد دکن میں

---

[1] ۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری، اُردو شاعری کا فنی ارتقاء (دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس، ۱۹۹۸) ۱۱۶

اُردوغزل کے بڑے شاعر سراؔج دکنی ہیں۔بعض اوقات سراؔج کی غزل ولؔی سے بھی نکلتی ہوئی نظر آتی ہے۔ان کی غزل کے کچھ اشعار:

سراؔج

اے جانِ سراج ایک غزل درد کی سن جا
مجموعہ احوال ہے دیوان ہمارا
شکر اللہ اِن دنوں تیرا کرم ہونے لگا
شیوۂ جو روستم فی الجملہ کم ہونے لگا [۱]

ولؔی نے شمالی ہند کے جن شعراء کو متاثر کیا اُن میں محمد شاکر ناجؔی ،آبرؔو،،خان آرزؔو،مضمون، یلرنگ،احسن اور اُن کے بعد شاہ حاتم،فغاں،تابان،مظہر جان جان شامل ہیں۔اس دور کی ایک خاص بات یہ ہے کہ ان شعراء کے یہاں ایہام گوئی رعایت لفظی اورر قافیوں کا غلط استعمال عام پایا جاتا ہے ۔ اس طرح مبتذل خیالات بھی فروغ پانے لگے۔اس تحریک کے کچھ مثبت اور منفی پہلو سامنے آئے۔مثبت اس طرح سے ہیں کہ ایہام گو شعراء نے معنی کی کثرت پیدا کرنے والے الفاظ زبان میں شامل ہونے لگے۔منفی پہلو یہ تھے کہ ذو معنی الفاظ کی تلاش میں شاعری پر تصنع اور مرصع کاری کا رجحان غالب آ گیا جس سے غزل کی شعریت اور تغزل میں کمی آتی گئی۔ اسی دوران ایہام گوئی کو ترک کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی اور ایہام گوئی مخالف تحریک پروان چڑھی جس میں جزبات کی صداقت پسندی کے بجائے سادگی بیان حسنِ زبان فارسی الفاظ اور اسالیب کو استعمال میں لانے پر زور دیا گیا۔اس تحریک میں مرزا مظہر جاںؔ جان، تاباںؔ، یقیںؔ، باقرؔ، حزیںؔ،اور شاہ ظہورالدین بھی پیش پیش رہے۔ میرؔ اور سوؔدا کے دورِعروج تک ایہام گوئی کا خاتمہ ہوگیا۔ان میں شاہ حاتم کا

۱۔ جمیل جالبی، تاریخ ادب اُردو(دہلی،،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،۱۹۹۲)۵۶۹

نام اس لیے قابل ذکر ہے کہ وہ پہلے ایہام گوئی کے سرگرم رکن تھے۔لیکن بعد میں انھوں نے اردو شاعری کی اصطلاح وتہذیب کی طرف خاص توجہ دی گئی۔ یہی وہ دور ہے جس نے غزل گوئی کے اُس سنہری اور شاندار دور کے لیے زمین ہموار کی۔ جس کی شروعات سوداؔ ، میرؔ اور دردؔ سے ہوتی ہے۔ان تین عظیم شاعروں نے غزل کو بامِ عروج پر پہنچایا۔اِس دوران غزل کی دیگر اصناف بھی کافی پھلیں پھولیں۔لیکن غزل کی مقبولیت کا پلڑا نسبتاً بھاری رہا۔ اِس دور کے صاحب طرز شاعروں میں سوداؔ، میرؔ اور خواجہؔ میر دردؔ کے علاوہ میر سوزؔ، میر حسنؔ اور اثرؔ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

اس دور میں غزل کلاسکی شعری روایت سے آشنا ہوئی ساتھ ہی غزل میں ربط، روانی، بندش کی چستی محاوروں کا برمحل استعمال اور عربی لفظوں کو صحت تلفظ کے ساتھ برتنے کا رجحان عام ہوا۔

خدائے سخن میر تقی میرؔ نے اُردو غزل کو صحیح زبان پرسوز لہجہ نیز تہذیبی وثقافتی مزاج عطا کیا۔میرؔ کے عہد میں ملک میں سیاسی، معاشی اور معاشرتی سطح پر بدنظمی اور انتشار کا شکار تھا۔جس دور اور حالات سے میرؔ گزرے غم والم اُنکے مزاج میں پوری طرح سے رچ بس گیا تھا میرؔ نے اُس دور کے درد بھرے حالات کی ترجمانی کی اور اپنی ذاتی محرومیوں کو آفاقی رنگ دے دیا جس سے غزل کا رشتہ عوام کی زبان سے جڑ کر وسیع ہو گیا۔

اُردو زبان میں نہ صرف میرؔ کی شاعری اپنی بعض خصوصیات کی وجہ سے ممتاز حیثیت رکھتے ہے بلکہ اپنی نظیر نہیں رکھتی۔ دردمندی، تاثیر، مضامین کی جدت، سادگی وصفائی، خلوص وصداقت عام بول چال کا لہجہ میرؔ کی شاعری کے اہم خصوصیات ہیں۔میرؔ کا اسلوب صاف ستھرا، دلکش اور روزمرہ کی گفتگو سے قریب ہے۔ان کا لہجہ عام لوگوں کا ہے۔

سوداؔ نے بڑی ہمہ گیر طبیعت پائی تھی۔عجب شوق تھے۔شاعری کے ساتھ ساتھ موسیقی میں بھی دلچسپی

رکھتے تھے اور شاعری کے تمام اصناف پر قادر تھے مگر قصیدہ وہجو سے ان کی طبیعت کو خاص مناسبت تھی۔ سوداؔ کی غزلیں بھی کچھ کم بلند مرتبہ نہیں۔ سوداؔ کا مزاج میرؔ سے مختلف تھا اس لئے ان کی غزلیں بھی میرؔ کی غزلوں سے مختلف ہیں۔ میرؔ داخلی شاعر تھے جو کچھ ان کے دل پر گزرتی تھی اس کو شعروں میں بیان کردیتے تھے اس کے برعکس سوداؔ جو کچھ دیکھتے ہیں اپنی غزلوں میں پیش کردیتے ہیں۔ ان کی غزل میں نشاطیہ عنصر غالب ہے۔ لفظوں اور ترکیبوں کی رعنائی اور دلکشی پر ان کی توجہ ہے۔ ملاحظہ ان کے کچھ اشعار:

کیفیت چشم اس کی مجھے یاد ہے سوداؔ ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کی چلا میں

بہار بے سپرِ جام یار گزرے ہے نسیم تیری چھاتی کے پار گزرے ہے

سوداؔ نے اپنے تخلیقی توانائی کے بل بوتے پر اُردو غزل کو نیا رنگ وآہنگ عطا کیا۔ انہیں تمام اصنافِ سخن پر قدرت حاصل تھی قصائد اور ہجو گوئی میں بھی کوئی اُن کا مدِ مقابل نہ تھا لیکن اُن کی غزلیں خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ انھوں نے فارسی کی روایت کو ایک نئے قالب میں ڈھالا اس طرح فارسی کی بکثرت الفاظ و محاورات اُردو زبان میں اس طرح داخل کیے کہ وہ اس کا جزو ہوگئے اور یہ بعد میں آنے والوں کے لیے قابلِ تقلید نمونہ ثابت ہوئے۔

میرؔ اور سوداؔ کے بعد اس دور کے بڑے شاعر خواجہ میر دردؔ ہیں۔ وہ ایک ذی علم اور معزز خاندان کے چشم و چراغ تھے ان کے بزرگ اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں بخارا سے ہندوستان آئے۔ اس خاندان کے افراد کو ہر زمانے میں بڑا احترام حاصل رہا۔ یہ ایک صوفی گھرانہ تھا جس میں پیری مریدی کا سلسلہ برابر چلا آتا تھا۔ میر دردؔ کو تصنیف وتالیف کا بہت شوق تھا۔ کیسی ہی مصروفیت کیوں نہ ہو وہ اس کام کے لئے وقت ضرورت نکال لیتے تھے۔ ان کے متعدد تصانیف موجود ہیں لیکن جس تصنیف سے ہمیں سروکار ہے۔ یہ دیوان مختصر ہے لیکن سراپا انتخاب۔ ان کے کلام میں ہمواری پائی جاتی ہے۔ وہ بہت غور وفکر کے بعد الفاظ وتراکیب کا انتخاب

کرتے ہیں اور صحت زبان کا بہت خیال رکھتے ہیں ۔اس خصوصیت نے اس کے اشعار میں بہت دلکشی پیدا کر دی ہے۔

میر تقی میؔر اور میر دردؔ کے چند اشعار نمونے کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں

؎ دل کی ویرانی کا کیا مزکور ہے۔
یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا

میؔر

؎ شہاں کہ کحل جواہر تھی خاک پا جن کی
انہیں کی آنکھ میں پھرتی سلائیاں دیکھیں

میؔر

؎ جگ میں آ کر ادھر اُدھر دیکھا
تو ہی نظر آیا جدھر دیکھا

دردؔ

؎ درد کچھ معلوم ہے یہ لوگ سب
کس طرف سے آئے تھے طرف چلے

دردؔ

اُردو غزل نے اٹھارویں صدی عیسویں میں کافی ترقی کی ۔غزل کے ارتقاء کا مرکز دہلی تھا لیکن جب دہلی کے سیاسی و معاشی حالات زوال پزیر ہونے لگا۔تو شعراء و ادباء لکھنو، فیض آباد اور دیگر ریاستوں کا رُخ کرنے لگے ۔جس کی وجہ سے اُردو غزل پر بھی بہت اثر پڑا اور لکھنو کو اُردو شاعری کے لیے مرکزی حیثیت

حاصل ہوگئی۔شعروشاعری کی انجمنیں اب لکھنو میں سجنے لگیں ۔چنانچہ میؔر، دردؔ اور سوؔدا بھی لکھنو چلے گئے اور اُن کے دیگر معاصرین بھی جیسے مصحفؔی ۔انشاؔء، جراتؔ رنگین، اور قائم چاند پوری وغیرہ شامل ہیں انھوں نے بھی لکھنو کا رُخ کیا۔ان میں سے تو بعض نے اجڑی ہوئی دلی کے قصیدے قلمبند کئے جس طرح کہ سوؔدا نے شہر آشوبؔ، قصیدہ تضحیک روزگار، میر کا مخمس ورحال لشکری، ''مثنوی در بیان کزب'' اور ذکر میر وغیرہ میں کچھ اپنی داستان قلمبند ہے اور کچھ اجڑی ہوئی دہلی کی اس دور کی غزل میں بھی لازوال پزیر معاشرے کی پوری عکاسی ہوتی ہے جب کہ دوسری طرف اس دور کے کئی شاعروں کے یہاں جیسے کہ مصحفؔی، انشاؔء اور جراتؔ ہیں لکھنو کی نشاط انگیز تہذیب کی رونقیں اور رعنائیاں بھی پائی جاتی ہیں جس طرح جرات کے یہاں جسم وجنس کا موضوع اہمیت اختیار کرگیا۔ ۔اس طرح غزل میں خارجی عناصر شامل ہونے کا رجحان بڑھ گیا۔معاملہ بندی ، ابتذال، جنسی لذت پرستی وارداتِ وعشق وہوس عام ہونے لگی ۔ریختی اس دور کی پیداوار ہے جس سے عام عورتوں کی زبان اور محاورے شاعری میں داخل ہوئے۔ رنگیںؔ اور انشاؔء کا نام ریختی کے حوالے سے آتا ہے۔ لکھنئو شاعری کی خصوصیات دلی کی شعری خصوصیات سے کافی مختلف تھیں۔اس طرح دورِ دبستان وجود میں آئے جنھیں دبستانِ دہلی اور دبستانِ لکھنو، کہا جاتا ہے جومختلف رجحانوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔دبستانِ دہلی میں داخلیت کا عنصر غالب ہے اور اس میں سوز، درد اور تصوف کی گہری چھاپ ہے اور زندگی کی بے ثباتی کا احساس ہے ۔

جبکہ لکھنئویت میں خارجیت کا احساس ہے وہاں کی پُرامن زندگی خوشحالی اور وہاں کی شاعری سے پوری طرح سے منعکس ہوتی ہے۔کہ جس طرح بیبا کی، عریانی کا رجحان سوز وگداز اور جزبات نگاری سے عاری لہجہ، تکلف وتصنع سے بھرپورا اسلوب پایا جاتا ہے۔

دونوں دبستانوں عشق وعاشقی کا موضوع میں خوب برتا گیا ہے۔مگر دہلی کے دبستان میں عشق تصوف

کے زیرِ اثر ہے جس میں قلب وروح کی تڑپ اور کسک کا احساس ہے جبکہ دبستانِ لکھنؤ کے شعراء کے یہاں عشق میں بہت زیادہ حرص ہے ۔ شاعر معشوق کے ظاہری حسن زیور سراپا لباس اور معشوق کی چال ڈھال اداؤں اور گھاتوں تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔

انیسویں صدی کے ابتداء کے ساتھ ہی غزل میں ایک بار پھر تبدیلی واقع ہوتی ہے۔ آتش، ناسخ، اور شاہ نصیر کے زمانے میں نہ صرف غزل کی زبان کی اصلاح کی طرف توجہ دی گئی بلکہ زبان و شعر کے اصول بھی مقرر کیے گیے ۔

ناسخ جنھیں استادِ سخن کہا جاتا ہے جن کا مطالعہ ایک فرد اور ایک شاعر کے مطالعے سے کہیں زیادہ ایک اسلوب، ایک دور اور ایک تحریک کا مطالعہ ہے۔ جس نے مجموعی طور پر اُردو زبان کے ادبی رجحانات کو ایک طویل وقفہ تک کسی بھی دوسری تحریک سے زیادہ متاثر کیا۔ ناسخ کے عہد اور رہنمائی میں جو دُور رس تبدیلیاں نمودار ہوئی ہیں انہیں صحیح معنوں میں اُردو گیر تبدیلیاں کہا جا سکتا ہے اور ان کے اثرات کی نشاں وہی صاف طور پر عہدِ جدید کے فنکاروں کے یہاں بھی کی جا سکتی ہے ۔۔ اُردو غزل کی تیئں اُن کا سب سے بڑا احسان اصلاحِ زبان ہے۔ انھوں نے زبان کو املاء اور تلفظ صحت کے اعتبار سے برتنے پر زور دیا۔ بہت سے نامانوس الفاظ ترک کر کے زبان کو دلکش بنایا تذکیر و تانیث کے اصول تراشے۔ عروض و قوافی اور اوزان کی صحت پر زیادہ زور دِیا اِس طرح اُردو زبان کو نکھارنے اور سنوارنے کی سعی کی ۔ اُن کے کلام میں نازک خیالی اور قلبی واردات کی ترجمانے بہت ہے لیکن تاثیر کی کمی پائی جاتی ہے ۔

اُن کی شاعری میں اگر چہ تصنع اور آورد کا رجحان پایا جاتا ہے۔ مگر پھر بھی اُردو غزل میں زبان کی اصلاح کے سلسلے میں ناسخ نے مجتہدانہ اقدامات کیے۔ آتش ناسخ کے ہم عصر تھے سوز و گذار کے لحاظ سے اُن کا رنگ تغزل ناسخ سے کہیں بہتر ہے۔ اُن کے یہاں تغزل کا صاف ستھرا معیار پایا جاتا ہے۔ لکھنوئیت و دہلویت کی عمدہ اقدار

وروایات اُن کے فن کی بنیاد بنیں مزاج بھی درویشانہ تھا لہٰذا اُن کے ہاں تصوف کی چاشنی بھی ہے اور لکھنو کی نشاط انگیزی وطربنا کی کا فر بھی ساتھ ہی دلی کے ماحول کی غم ویاس کی چھاپ بھی۔ یہاں کہنا صحیح نہیں کہ ان کے کلام میں تخیل کی پابندی نہیں۔ان کے دیوان میں بلند مضامین کی کمی نہیں۔اس کے ساتھ تصوف کی چاشنی ہے۔ تشبیہات میں بھی ندرت ہے اس کے باوجود لکھنو کے اس وقت شاعرانہ ماحول سے متاثر ہوئے بغیر رہ سکتے تھے ۔چنانچہ کلام میں تصنع بھی ہے اور رعایت لفظی بھی ہے۔لیکن ایسے اشعار میں لطافت اور تاثیر مفقود ہے۔

آتش کی شاعری میں تصوف دو سطحوں پر نمایاں ہے۔ایک وہ سطح جہاں وہ تصوف کے مضامین مثلاً فنا، بقا، رضا ،ترک ،معرفت ،توکل وغیرہ پر جستہ جستہ خیال آرائی کرتے ہیں اور اس میں عام لکھنوی روش کے برعکس گہرائی اور خلوص نمایاں ہے۔ دوسری سطح جو اس سے زیادہ اہم ہے وہ یہ ہے جہاں تصوف ان کی شاعری کے باقی ماندہ مختلف پہلوؤں پر اثر انداز ہوکر کلام میں رعنائی اور توانائی پیدا کرتا ہے اور ابتذال یا سطحیت سے بچاتا ہے۔

جب تک پہلی سطح یعنی متصوفانہ مضامین کا تعلق ہے۔اس کا مشاہدہ ذیل کے اشعار میں ہوسکتا ہے۔

نقش صورت کو مٹا کر آشنا معنی کا ہو
قطرہ بھی دریا ہے جو دریا سے واصل ہوگیا

طبل وعلم ہی پاس ہے اپنے نہ ملک و مال
ہم سے خلاف ہوکے کرے گا زمانہ کیا

دہلی کے حالات سنبھلنے کے ساتھ ہی اُردو غزل اپنے پرُانے مرکز کی طرف واپس لوٹ آتی ہے جہاں اُسے غالب، مومن، ذوق، اور ظفر جیسے شعراء کی ہمراہی اور پزیرائی حاصل ہوتی ہے جس سے اُردو غزل نئی بلندیوں سے آشنا ہوتی ہے۔

اِن میں غالب ایک عظیم شاعر یا بلند پایہ شاعر ہیں اور سب نے اس بات کو تسلیم کیا وہ

نہایت وسیع النظر اور کثیر المعلومات تھے۔ وہ اپنی قابلیت کا اندازہ اپنے فارسی کلام میں لگاتے تھے غالبؔ کی شاعری کے تین دور مانے جاتے تھے ان کی شاعری کا پہلا دور اس وقت سے شروع ہوتا ہے جب سے انہوں نے شعر کہنا شروع کیا اس سے پہلے دور میں اُن کے کلام پر فارسی کا رنگ غالب آتا ہے۔ اس میں عجیب وغریب تشبیہات، استعارات اور نا قابل فہم بلند پروازیاں کثرت سے پائی جاتی ہیں۔

دوسرے دور میں فارسی کا رنگ واثر کم ہوگیا۔ زبان میں صفائی، سادگی اور شگفتگی آ گئی۔ فارسی تراکیب اور محاورات کا استعمال بھی کم ہوگیا۔ لیکن فکر ونظر کی بلندی قائم رہی۔

مرزا غالبؔ کی تیسری شاعری کا دور اُن کے کمال فن کا لب ولباب اور ارتقاء کے کمال کی آخری منزل ہے۔ اس دور کے اشعار جامعیت اور اختصار میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ اس عہد کی غزلوں میں ندرت خیال کے ساتھ لطافت زبان اور شکستگی کلام بڑا لطف دیتی ہے۔

غالبؔ نے روایتی انداز سے ہٹ کر بالکل ایک نئے ڈھنگ سے غزل کی مشاطگری اور اُردو غزل کو ذہن و دماغ عطا کیا۔ وہ زندگی کی حقیقتوں کو فلسفیانہ نقطہ نگاہ سے پرکھنے کے عادی تھے۔ کہیں وحدت الوجود اور تصوف کے عقیدے کھولتے ہیں اور کہیں انسانی نفسیات کی گھتیاں سلجھاتے ہیں۔ فکر و فلسفہ کے رموز و نکات کے ساتھ ان کی غزلیں زندہ دلی اور شگفتگی سے عبارت ہیں ظرافت، طنز اور شوخی اُن کی غزلوں کی پہچان ہے اُن کے یہاں تخلیل کی بلند پروازی کے ساتھ تہہ داری بھی ہے۔ مضمون آفرینی کا کمال بھی ہے اور ترکیب سازی بھی ہے۔

غالبؔ و مومنؔ کا عہد جن میں ذوقؔ اور ظفرؔ بھی شامل ہیں انیسویں صدی عیسویں کی ساتویں دہائی تک کے عرصے پر محیط ہے یہ تمام شعراء دہلی کے دبستان سے تعلق رکھتے ہیں۔ غالبؔ کا کلاسیکی اُردو غزل کے آخری نمائندے ہیں اُن کے بعد مغربیت کے زیر اثر انحراف کا عمل شروع ہوجاتا ہے۔ اِس عہد کی غزل پر اس دور کے سیاسی وسماجی اثرات دکھائی دیتے ہیں۔ تاہم اِس عہد کی غزل کا کوئی عمومی رجحان موجود نہیں بلکہ ہر غزل گو

شاعر دوسروں سے مختلف خصوصیات کا حامل ہے ۔جس طرح غالبؔ کا ایک مزاج ہے اور مومنؔ کا اپنا انداز ہے۔مومنؔ نے یوں تو بہت سے اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے لیکن ان کی شہرت ان کی غزلوں کی وجہ سے ہے جہاں حسن وعشق کا ایک نگار خانہ آباد نظر آتا ہے ۔مومنؔ نے بڑی کامیابی کے ساتھ غزل کی روایات کو ہر جگہ برقرار رکھا۔اس کے خدوخال بڑے دلکش انداز میں ابھارے ہیں ۔ان کی غزلوں میں ہر جگہ ایک صحت مند زاویہ نظر دکھائی دیتا ہے۔فکر وفن کا اتنا حسین امتزاج ہمیں کم ہی کسی شاعر کے یہاں نظر آتا ہے۔

مومنؔ کا کلام نازک خیالی اور بلند پروازی کے لیے مشہور ہے معاملات حسن وعشق کی صحیح ترجمانی ، جزبات نگاری ،نفسیات شناسی ، باریک بینی اور لطیف طنزیہ انداز کی بدولت اپنے ہم عصر شعراء میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔مومنؔ کی غزل سے دو اشعار اس طرح ہیں:

؎ عمر ساری تو کٹی عشق بتاں میں مومن
آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

؎ قیس کی دیوانگی میں عقل کیا حیران ہے
مجھ کو وحشت ہوگئی تصویر لیلیٰ دیکھ کر

ذوقؔ بڑے قادرالکلام شاعر تھے۔اس میں ایسا کمال اور شہرت حاصل کی کہ بہادر شاہ ظفر کے کلام پر اصلاح دینے لگے۔دربار میں بڑا رسوخ رکھتے تھے۔اکبر شاہ نے خاقانی ہند خطاب دیا۔ان کی غزلوں میں تغزل کے ساتھ اختیار اور برجستگی پائی جاتی ہے زبان پر مکمل قدرت حاصل تھی ۔محاورات کا استعمال برمحل ہوتا تھا مگر لطافت میں کمی ہوجاتی تھی۔ان کے کلام میں اخلاقیات کا بیان کثرت سے پایا جاتا ہے۔تصوف کی چاشنی بھی ملتی ہے اور ان کا بیان مسائل تصوف پر خاصا واضح ہے۔کلام میں شوخی بھی پائی جاتی ہے۔ان سے زیادہ شاید ہی کسی شاعر کے شعروں کو ضرب المثل کا درجہ حاصل ہوا ہو۔ان کے اشعار عام طور پر سادہ اور صاف ہوتے ہیں

بات ہے کہ جزبات کی شدت اور مضمون آفرینی کم ملتی ہے۔تخیل کی بلندی اور کیف کلام میں بہت کم ملتا ہے۔ان کی غزل گوئی کا اندازہ مندرجہ ذیل منتخب اشعار ہوسکتا ہے۔

اِس دور کے ایک اور اہم شاعر سلطنت مغلیہ کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر تھے۔انھوں نے پہلے ذوقؔ اور پھر غالبؔ کی شاگردی اختیار کی۔وہ موسیقی کے فن میں مہارت رکھتے تھے یہی وجہ ہے کہ اُن کی غزلوں میں ایک ترنم پایا جاتا ہے۔اُردو غزل کی تاریخ میں ظفر کے کلام کو فراموش نہیں کیا جاسکتا یوں تو ان کی غزلوں میں معاملہ بندی، خارجی مضامین پائے جاتے ہیں۔لیکن اپنی غزلوں میں انھوں نے اپنی آپ بیتی کچھ ایسے درد بھرے انداز میں رقم کی ہے جس کی نظیر نہیں ملتی۔معصومیت، صفائی، سادگی، بے تکلفی، درد، تڑپ اور رنگِ تغزل کے لحاظ سے اُن کے کلام منفرد ہے۔

یار نہیں غم خوار نہیں ہمدرد ظفرؔ اب کوئی نہیں
کنجِ غم میں آپ ہی کہیے دل کو مرے بہلائے کون
کتنا ہے بد نصیب ظفرؔ دفن کے لیے
دوگز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں [۱]

غالبؔ کے بعد اُردو غزل جدید عہد میں داخل ہوجاتی ہے۔۱۸۵۷ء میں مغلیہ سلطنت کے زوال اور ملک پر انگریزوں کے تسلط کے بعد سیاسی، سماجی اور معاشرتی سطح پر کئی طرح تبدیلیاں رونما ہوئیں جس کے نتیجے میں سماجی بیداری و اصلاح کی ضرورت محسوس کی گئی اور اس مقصد کے تحت مختلف قسم کی سیاسی و سماجی و اصلاحی

۱۔کامل قریشی، اردو غزل (نئی دہلی، اردو اکادمی، ۲۰۰۰) ۱۷۵

تحریکوں کا دور شروع ہوا ۔

اُردو ادب پر اس سماجی بیداری کا اثر پڑنا لازمی تھا۔ چنانچہ سرسید۔ حالؔی، آزادؔ اور شبلؔی نے نیچرل ازم کی تحریک کے زیرِ اثر نیچرل شاعری کی بنیاد ڈالی جس کا مقصد شاعری کو حقیقی بامعنی و بامقصد بنانا اور ادب کو ملک وقوم کی خدمت اور اصلاح کے لیے استعمال کرنا تھا اس ضمن میں حالؔی نے غزل کی اصلاح پر کافی زور دیا اور غزل میں سیاسی، معاشی و تہذیبی موضوعات شامل کیے۔ حالؔی نے اُردو غزل کو نئے موضوعات اور نئے تقاضوں سے ہم آہنگ کیا۔ انھوں نے مقدمہ شعر و شاعری کے ذریعے سادگی ، اصلیت اور جوش کا تصور پیش کیا ۔

حالؔی کی اصلاحی کوششیں رنگ لائیں اور اردو غزل مختلف مراحل طے کرتی ہوئی بیسویں صدی کی جدید غزل کہلانے کے قابل ہو گئی ۔

۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد وہ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ رئیس دہلی و تعلقہ دار جہانگیر آباد ضلع بلند شہر سے بحیثیت مصاحب وابستہ ہو گئے اور سلسلہ آٹھ سال تک جاری رہا۔ حالؔی کا سب سے اہم کارنامہ مقدمہ شعر و شاعری ہے ۔ اصلاً یہ ان کی شعری مجموعے کا مقصد تھا لیکن آخر کار اسے ایک مستقبل کتاب کی حیثیت حاصل ہو گئی۔

اکبؔر، چکبستؔ ،اور اقبالؔ کی غزلوں میں حالؔی کے اِس اصلاحی نظریے کی کارفرمائی نمایاں طور نظر آتی ہے۔ اُس دور میں محمد حسین آزادؔ، اسماعیل میرٹھی اور سرور جہاں آبادی نے بھی غزلیں کہیں مگر وہ اس میدان میں اپنی کوئی خاص شناخت نہ بنا سکے اکبر الٰہ آبادی نے سماجی اصلاح کا کام اپنے ظریفانہ کلام سے سرانجام دیا۔ اُن کی شناخت طنزیہ و مزاحیہ غزلوں کی بدولت ہوئی جو سماج کو سدھارنے کے لیے لکھی گئیں۔

مغرب ایسا ہی رہا اور ہے اگر مشرق یہی
ایک دن دیکھیں گے ہفتِ اقلیم اُنکے ہاتھ میں

اکبر الٰہ آبادی

غالبؔ کا فلسفیانہ انداز اگر چہ چکبستؔ کی غزلوں میں کم ہے لیکن بہت خوب ہے۔آتشؔ کا اثر زبان اور بیان پر ہے۔ان دونوں کے امتزاج سے ان کی ذہانت اور فکر رسا نے اپنا ایک انفرادی رنگ پیدا کر لیا تھا۔ ان کا مجموعہ کلام ''صبح وطن'' چھپ چکا ہے۔

چکبستؔ نے ملی جزبے سے سرشار نظمیں لکھیں جوان کی مقبولیت کا باعث بنیں مگر اُن کی غزلیں بھی اہمیت کے لحاظ سے کچھ کم نہیں۔جن میں صوفیانہ رنگ،متانت سنجیدگی کے ساتھ ساتھ روایتی اور فرسودہ مضامین کے بدلے موضوع اور مواد کے اعتبار سے وسعت اور جدت پائی جاتی ہے۔

مٹنے والوں کی وفا کا سبق یادر ہے
بیڑیاں پاؤں میں ہوں اور دل آزاد رہے

چکبستؔ

بیسویں صدی میں اُردو غزل ملکی و غیر ملکی جذبات و خیالات سیاسی نظریات،قید و بند اور دوروسن جیسے موضوعات سے متراف ہوئی۔اس طرح غزل میں نہ صرف موضوع بلکہ انداز کے اعتبار سے بھی وسعت پیدا ہوئی۔

اقبالؔ کا ظہور اردو غزل میں ایک ایسے مقام پر ہوا جب سوداؔ کی جامد لفاظی غالبؔ کی زندہ اور متحرک معنویت کے آگے دم توڑ چکی تھی اور حالیؔ مقدمہ شعر وشاعری لکھ کر نئی غزل کا استورالعمل پیش کر چکے تھے۔لیکن اس بات سے بھی انکار نہیں کہ جب اقبالؔ نے غزل کی ابتداء کی تو اکناف ہند میں اس وقت بھی داغؔ اور میرؔ کے اثرات موجود تھے اور غالبؔ کے تنگنائے نے غزل کے تقاضے نے اسلوب اور زبان کے جو نئے پیکر تراشتے تھے۔اُن کو بھی قبول عام حاصل نہیں ہوا تھا۔اقبالؔ کو اگر چہ نظم کہنے سے ہی دلچسپی تھی لیکن یہ بھی ایک مسلمہ

بات ہے کہ ان کی ابتدائی دور کی نظم ''ہمالہ'' سے پہلے اُن کی غزل مرزا ارشد گورگانوی سے خراج تحسین حاصل کر چکی تھی ۔

موتی سمجھ کے شان کریمی نے چن لئے
قطرے جو تھے مرے عرق انفعال کے

اقبالؔ کی حیثیت سنگِ میل کی سی ہے وہ ایک پیامی شاعر تھے۔انھوں نے فکر وفلسفہ کے رنگوں سے غزل کی آبیاری کی اور اسے نئے امکانات سے روشناس کیا اِس طرح اُن کی غزل حیات و کائنات کی صداقتوں میں بن گئی اور غزل میں ہر لحاظ سے جدت پیدا ہوئی۔

ے کیوں ساز کے پردے ہیں مستعور ہولے تیری
تو نغمۂ رنگین ہے ہر گوش پہ عریاں ہو۔

اقبالؔ

ے تونے یہ کیا غضب کیا مجھ کو بھی فاش کر دیا
میں ہی تو ایک راز تھا سینہ کائنات میں اقبالؔ

اُردو غزل کو جدید خطوط پر استوار کرنے میں شادؔ عظیم آبادی کی غزلیں بھی ایک اہم قدم کے طور پر مانی جاتی ہیں ۔اُن کے یہاں جدید رنگ غزل کا احساس نمایاں ہے ۔اس کے ساتھ ہی رندانہ مضامین ،عشق کی کیفیتیں، سوز وگزار، سادگی و بے ساختگی بھی پائی جاتی ہے۔

شادؔ عظیم کی شاعری حسن وعشق کے عامیانہ اور سوقیانہ انداز بیان سے تمام تر پاک ہے۔پاکبازانہ حسن وعشق ،رزم وبزم کی دلکش روداد کے علاوہ ان کی شاعری میں اخلاق ،فلسفہ،تصوف اور توحید کا عنصر بہت زیادہ ہے غزل گوئی کے لحاظ سے شادؔ میں میرؔ کے بہت سے انداز پائے جاتے ہے۔حسن وعشق کی داستان سرائے میں

میرؔ سی سادگی اور متانت پائی جاتی ہے۔

اُردو غزل کی روایت میں فانیؔ نے اپنا انفرادی رنگ قائم کیا انھوں نے ذاتی غم والم کے ساتھ اجتماعی کرب وفلسفہ کے ساتھ پیش کیا۔فانیؔ نے اپنے کلام کے لئے جدید ترکیبیں بھی پیدا کی ہیں اور اکثر نئے الفاظ بھی استعمال کئے ہیں ۔ فانیؔ کا تخیل مشکل الفاظ اور پیچیدہ تراکیب کا محتاج نہیں ہے ۔سادہ الفاظ اور معمولی بندش میں بھی وہ بلید، باریک اور نازک معنی رکھ دیتے ہیں۔فانیؔ کے کلام کے مطالعے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے جزبات، واردات، مشاہدات تاثرات سب میں جدت اور لطف واثر موجود ہے۔ان کے کلام کے کئی مجموعے دیوان فانیؔ، باقیات فانیؔ،عرفانیات اور وجدانیات کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔وہ غالبؔ کے علاوہ میرؔ اور داغؔ سے بھی متاثر تھے زبان ومحاورات کے سجاوٹ اور رکھ رکھاؤ جو لکھنوی دبستان کا خاصہ تھا۔فانیؔ کے یہاں نمایاں ہے۔

فانیؔ ہم تو جیتے جی وہ میت ہیں بے گور وکفن
غربت جس کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا فانیؔ

جدید اُردو غزل کی زلفیں سنوارنے میں اصغر گونڈویؔ ایک امتیازی شان رکھتے ہیں۔اُن کے کلام میں تخیل کی گہرائی۔ جوش ونشاط اور سرمستی پائی جاتی ہے۔تصوف سے ان کو دلی تعلق تھا۔اس کا اثر ان کے کلام پر نظر آتا ہے۔فلسفہ اور تصوف کے مضامین کو انھوں نے بڑی خوبی اور خوش اسلوبی سے بیان کیا ہے۔ان کی فارسی تراکیب،تشبیہات اور استعارات میں بڑی ندرت اور نزاکت ہے۔

اُن کی غزلیں پاکیزہ رندانہ سرمستی اور کیف ونشاط کی کیفیتیں سے بھر پور ہیں جن میں تصوف بھی ہے۔ عشقِ حقیقی ومجازی کے جلوے بھی ہیں اور حرکت وعمل کا درس بھی ۔اُن کی غزلیں روح کو نشاطیہ کیفیات عطا کرتی ہیں۔

اُردوغزل میں اصغر کے بعد جگؔر کا نام بھی نمایاں نظر آتا ہے وہ رومانی شاعر ہیں اُن کے یہاں حسن وعشق کے ساتھ زندگی کی رنگینی حسن پرستی جذبوں کی سچائی مشرقی اقدار و روایات کے سانچے میں ڈھل کر غزل کی صورت میں سامنے آئی ہیں۔ان کے کلام میں خمریات کا بہت گراں قدر سرمایہ ہےاوراس میں بھی ان کا اپنا انداز والہانہ پایا جاتا ہے۔ان کے کلام کے تین مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔داغ جگر،شعلہ طوراور آتش گل۔

۱۹۳۶ء میں ترقی پسند تحریک کا آغاز ہوا جس کا مقصد ادب کے ذریعے سیاسی وسماجی شعور کو بیدار کرنا ادب میں حقیقت پسندی کو فروغ دینا ، ادب کو عوامی خواہشات اور امنگوں کا ترجمان بنانا تھا ۔ اگر دیکھا جائے تو اردوغزل میں سیاسی وسماجی بیداری جیسے موضوعات ترقی پسندی سے پہلے ہی داخل ہو چکے تھے۔جس کا ثبوت حاؔلی،آزاؔد،اوراقباؔل کے یہاں سے ملتا ہے اُن کے یہاں ترقی پسندی کی چاپ بہت پہلے محسوس کی جا سکتی ہے۔ نیز ۱۸۷۵ء کے بعد سیاسی وسماجی سطح پر کئی طرح کی انقلابی تبدیلیوں کی وجہ سے کئی ایسے موضوعات سامنے آئے جو شعراء و ادباء کے لئے قابلِ توجہ تھے ۔ اِس طرح یہ تمام حالات و واقعات ترقی پسندانہ موضوعات کی طرف بڑھنے کے لیے پیش منظر کا کام کرتے رہے۔انجمن ترقی پسند مصنفین نے ملک بھر میں اس تحریک کے ذریعے اردو شاعری اور جدید خیالات کوفروغ بخشا اوراس کے لیے نئی راہیں استوار کیں ۔ترقی پسندوں نے ادب کو جمہوریت،انسانیت،اخوت ومساوات جیسی اعلیٰ قدروں کی ترویج واشاعت کا ذریعہ بنایا۔ جس کی وجہ سے یہ تحریک کافی مقبول ہوگئی۔اگرچہ کئی ترقی پسندوں نے غزل کی تنگ دامنی کی شکایت کی بنا پر اس کی بھرپور مخالفت بھی کی۔مگر اُن کی مخالفت کا یہ نعرہ کھوکھلا ثابت ہوا۔بہت سے شعراء نے اپنے فنکارو محسوسات کو اس صنف میں پیش کیا اوراسے نت نئے تجربوں اور ہیئتوں سے مالا مال کیا ۔اس طرح غزل کا دامن وسیع ہوگیا اورغزل حسن وعشق کے قصوں،گل وبلبل کی حکائتوں سے قطع نظر سماجی حقیقتوں کی عکاسی بن گئی۔

ترقی پسند تحریک وقت کی ضرورت کے طور پر ابھری اور بہت سے شعراء اس سے وابستہ ہوئے جن

میں فیض، مجاز، مخدوم، پرویز،، جزبی، علی سردار جعفری، غلام ربانی تاباں، اختر انصاری، ساحر، وامق جونپوری، جان نثار اختر۔ کیفی اعظمی، سکندر علی واحد، ندیم، مجروح، قتیل شفائی، ظہیر کاشمیری ، احمد فراز، وغیرہ شامل ہیں۔ ان میں سے کچھ نے اپنا منفرد رنگ اختیار کیا اور غزلیں کہیں اِس طرح ترقی پسند غزل کو ایک خاص مقام عطا کیا۔ ترقی پسند تحریک سے پہلے ہماری غزل پر جو رومانی رنگ چھایا ہوا تھا۔ اُس کا اثر مجاز، اور جزبی کے یہاں انقلابی مزاج کا رومان پایا جاتا ہے جس طرح جرائت، حوصلہ اور مقصدیت پائی جاتی ہے۔

فیض احمد فیض نے یہ ثابت کر دیا کہ غزل کا دامن اتنا وسیع ہے کہ اس میں ہر موضوع پر خیال آرائی ممکن ہے اور غزل زمانے کے ہر تقاضے کا ساتھ دینے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ ان کے کلام کی بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ پیچیدہ ترکیبیں اور مشکل فارسی الفاظ استعمال کیے بغیر اپنے کلام میں معنویت پیدا کرتے ہیں اور معنویت بھی ایسی جس میں تاثیر ہوتی ہے۔ کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ معنی پیدا کرتے ہیں۔ وہ ملکی مسائل اور خصوصاً مزدوروں اور محنت کشوں سے ہمدردی رکھتے ہیں اور اسی وجہ سے سامراجی نظام کے خلاف بڑی شدت سے آواز بلند کرتے ہیں۔

فیض احمد فیض ایک ایسے ترقی پسند شاعر ہیں جن کے سامنے واضح طور پر اقبال کے نقشِ قدم تھے۔ وہ اپنے فکر وفن اور شہرت کی بدولت اُس مرتبے پر جا پہنچے جہاں غالب اور اقبال فائز ہو چکے تھے۔ اُن کا تصورِ حسن وعشق، انسانی مسائل، کشمکش حیات زندگی کے گونا گوں مسائل سے عبارت ہے اُن کے یہاں سیاسی تشدد، زبان بندی اور قید و بند کے مخالف احتجاج پایا جاتا ہے۔ اِس طرح فیض نے پُرانی علامتوں کو نئے معنی و مفاہیم میں ڈھال کر اُردو غزل کے دامن کو وسعت عطا کیا۔

مقامِ فیضؔ کوئی راہ میں جچا ہی نہیں
جو کوئی یار سے ملے تو سوئے دار چلے فیضؔ
جاں کے زیاں کی ہم کو بھی تشویش ہے لیکن کیا کیجئے
ہر راہ جو ادھر کو جاتی ہے مقتل سے گزر کر جاتی ہے

فیضؔ

احمد ندیم قاسمیؔ بھی بنیادی طور پر ترقی پسند خیالات کے ترجمان ہیں ان کے کلام میں واعظانہ انداز نہیں ہے۔ کلام میں درد و کسک کی چاشنی ہے اور معنویت کی عظمت ہے۔ اُن کی غزلوں کے موضوعات حسن و عشق، حیات و کائنات کے مسائل تک پھیلے ہوئے ہیں اور ان کی غزلوں میں تغزل بھی ہے اور بے ساختگی بھی ہے۔ ان کے کلام میں کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں ۔علی سردار جعفریؔ نے بھی سیاسی موضوعات پر غزلیں کہی ہیں جن میں جوشِ خطابت اور بیانیہ انداز نظر آتا ہے۔ اُن کے یہاں وہی لفظیات دکھائی دیتی ہیں جو ترقی پسندوں کے یہاں عام طور پر استعمال ہوئی ہیں۔ مثلاً دار و رسن، قفس، صبحِ شہادت جیسے الفاظ بہت استعمال ہوئے ہیں۔

ترقی پسندوں کی فہرست میں قتیل شفائیؔ بھی اہم نام رکھتے ہیں۔ اُن کی شاعری میں حسن و عشق کے علاوہ سیاسی و سماجی موضوعات بڑے نرم اور موثر لہجے میں بیان ہوئے ہیں۔ ترقی پسند تحریک کے ایک سرگرم رکن ساحر لدھانویؔ بھی تھے اُن کی غزلیں ترقی پسندانہ خیالات کی ترجمان ہیں۔

ترقی پسندوں کی فہرست میں پرویز شاہدیؔ بھی اہم نام رکھتے ہیں جو ایک باشعور پیامی شاعر تھے۔ ان کی شاعری کا آغاز تو رومانی کلام سے ہوا ۔لیکن مطالعے اور زندگی کی مشاہدے نے ان کی زندگی میں ایک ایسا انقلاب برپا کر کہ اپنی زندگی اور شاعری دونوں کی سیاست کی نزر کر دیا۔ رقص حیات اور تثلیث حیات دو مجموعہ ہائے کلام ان سے یادگار ہیں۔

وامقؔ جونپوری بھی انھیں شعراء میں ہیں جو اپنے زمانے یعنی دوسری جنگ عظیم سے پہلے اور بعد کے سماج کی

بربادی اور تباہی سے متاثر تھے اور پہلو میں ایک دردمند دل رکھنے کی جگہ سے اس کو دیکھ کر تڑپ اٹھتے تھے۔

جزبیؔ کے کلام سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انکا انداز فنکارانہ ہے وہ اپنے تجربے کو ایسے نئے تلے انداز میں ادا کرتے ہیں کہ اس سے زیادہ طویل کہی جاتی تو بے لطف رہتی اور مختصر کہی جاتی تو مبہم ہو جاتی۔ یہ ان کے فکر ونظر کی گہرائی اور زبان و بیان پر قدرت کا اثر ہے۔ان کے کلام کے دو مجموعے فروزاں اور سخت مختصر چھپ چکے ہیں۔

ان کے علاوہ ظہیر کاشمیریؔ، کیفی اعظمیؔ، کیف بھوپالیؔ، بدایونی اور احمد فرازؔ کے یہیں ترقی پسندانہ خیالات کا اظہار ملتا ہے۔انھوں نے اپنے فکر وفن سے اُردو غزل کو ایک خاص مقام عطا کیا۔اُردو غزل ترقی پسند شعراء کی بدولت نئے اسالیب ، نئی معاشرتی فضا ، نئے سیاسی افق کی ترجمان بن گئی۔ نیز انکی بدولت غزل میں جدید موضوعات کے ساتھ ساتھ نادر تشبیہات واستعارات اور لفظیات بھی شامل ہوئے جن سے اُردو غزل کے دامن کو کافی وسعت ملی۔

۱۹۴۷ء کے بعد تقسیم سے وابستہ موضوعات غزلوں میں بہت کامیابی سے برتے گئے جن میں ہجرت اور فرقہ وارانہ فسادات سرِ فہرست رہے۔ اِس کے ساتھ ساتھ اُس دور کے دیگر مسائل بھی موضوع سخن بنے۔ تقسیم کے بعد ترقی پسندی کا زور کم ہونے لگا جس کی وجہ یہ تھی کہ جدیدیت کے انتہا پسندانہ رویئے دانشوروں کو اس تحریک سے بیزار کر دیا اور یہ تحریک اپنے انجام تک پہنچی۔ایک نئی شاعری کی شروعات نصف بیسویں صدی کے آس پاس ہوئی جس نے فن کار کو فکری و نظریاتی سطح پر کھلی فضا کے احساس سے آشنا کیا۔ جسے جدیدیت کے رجحان کے نام سے یاد کیے جاتا ہے۔۱۹۶۰ء کے آس پاس ترقی پسندی کے ردِعمل کے طور پر یہ رجحان وجود میں آیا اِس کا مقصد قدیم روایات سے انحراف کرنا اور جدید تقاضوں سے ہم آہنگ ہونا تھا۔ اِس میں جدید فکر و اسلوب کو رائج کرنا اجتماعیت کے بدلے شاعر کی انفرادیت اُس کے مزاج اُس کے ذاتی محسوسات کو نمایاں کرنے کی ضرورت پر زور دیا گیا جماعت سے زیادہ ذات کی اہمیت پر زور دیا گیا۔ جدید

اُردو غزل پر کسی ایک نظریے یا مسلک کا لیبل چسپاں نہیں کیا جاسکتا نہ کسی محدود دائرے میں اس کو قید کیا جاسکتا ہے۔ یہ عصری زندگی کے مسائل اور جدید تقاضوں سے ہم آہنگ ہے۔ اس میں لطیف اور مزاحیہ انداز میں احساسات کا اظہار کیا گیا ہے۔

جدید غزل کی نمایاں خصوصیت ،تنہائی کا کرب ، بے وطنی و بے چینی کے احساس ،عدم تحفظ اور غیر یقینیت کے اظہار سے عبارت ہے۔ اس کے علاوہ اس میں احساس کی شدت اور جزبے کی صداقت پائی جاتی ہے۔ پُرانی علامتوں کے تکرار کے بجائے نئ اور تازہ علامتوں ،تلازموں ،تشبیہہ ،استعاروں سے مزین ہے۔ مثلاً ریت ، خاک، دھواں ، پتہ ،فصل ، رات دن ،سورج شام ، سناٹا پر چھائیاں وغیرہ اس طرح جدیدیت کے رجحان کی بدولت اردو غزل کو کھلی فضا میں سانس لینے کا موقع میسر آیا اور غزل کی فضا لامحدود ہوگئی۔

جن عہد ساز شعراء نے اُردو غزل کو عصر حاضر کی خوشبو سے متعارف کیا اُن میں ناصر کاظمیؔ ،خلیل الرحمٰن اعظمیؔ ، باقر مہدیؔ ، شہزاد احمدؔ ،حزن نعیمؔ ،شہاب جعفریؔ ،شاذ تمکنت ،مخمور سیعدیؔ بشیر بدرؔ ،مظفر حنفیؔ ،شہر یارؔ ، ندا فاضلیؔ ،محمود علویؔ ،ساقی فاروقیؔ ،افتخار عارفؔ اور پروینؔ شاکر شامل ہیں۔

جدید غزل گو شعراء میں پروینؔ شاکر ایک امتیازی مقام رکھتی ہیں۔ جدید اُردو غزل کا منظر نامہ اُن کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتا اُن کا شمار چند اُن شاعرات میں ہوتا ہے۔ جنھوں نے بہت کم مدت میں اردو شاعری کے میدان میں اپنا آپ منوایا۔ بلکہ وہ ادا جعفری کے بعد دوسری شاعرہ ہیں جس نے شہرت ومقبولیت کے وہ رستے بھی طے کر لیے جو بہت کم شاعرات کو نصیب ہوئے۔ انھوں نے منفرد ولب ولہجے ، نئے طرزِ فکر ، مخصوص اسلوب اور لفظوں کے انتخاب کی وجہ سے اِس صنف کو نکھار اور اسے ایک نئی جہت عطا کی۔ اس کے ساتھ ساتھ غزل کے باب میں کچھ ایسے اضافے بھی کیے جو ہمیں اس سے پہلے نظر نہیں آتے ہیں ویسے تو ان سے پہلے بھی خواتین اپنے محسوسات کا اظہار غزل کے پیرائے میں کرتی رہی ہیں۔ لیکن پروینؔ شاکر نے نسوانی

جزبات واحساسات کا بہت گہرائی سے مشاہدہ کیا اورانہیں سچے اور کھرےنسوانی انداز میں لفظوں کے موتیوں میں پرور کچھ ایسے پیش کیا ہے کہ جس کی مثال کسی اور اردو شاعرہ کے یہاں نہیں ملتی ۔ یہ بات واضح ہے کہ ان کے یہاں غزلوں کی نسبت نظمیں زیادہ پائی جاتی ہیں۔لیکن غزلیں ہی ان کی شہرت کا باعث بنیں اور اُن کی بہت سی غزلوں کے اشعار زبان زدعام ہوئے ۔ بہت سی غزلیں مشہور گلوکاروں کی آواز میں صدا بند ہوکر ہر طرف پروینؔ شاکر کی مقبولیت کا سکہ بٹھا گئیں۔

غزل کے لب و لہجے کے اعتبار سے دیکھا جائے تو وہ کافی بے باک نظر آتی ہیں۔پہلی دفعہ اُردو شاعری میں کسی عورت نے اس قدر بے باکی سے کسی مرد کو اپنا محبوب ظاہر کیا ہے ویسے تو ہندی شاعری میں محبوب مرد ہوتا تھا اور عورت کی طرف سے اظہارِعشق کیا جاتا تھا لیکن مرد شاعر اظہار جزبات میں حقیقت نگاری سے قاصر رہتے تھے۔اس میں لطافت نام کی کوئی چیز ہی نہیں تھی ریختی بھی لکھی گئی۔لیکن اس میں غیر اخلاقی مضامین کی بھرمار تھی اِس کی حیثیت شائستگی اورتہذیب کے نام پر ایک بدنما داغ کی سی تھی۔پہلی دفعہ کسی عورت نے اس قدر بے باکی سے کسی مرد کو اپنا محبوب جان کر اپنے لطیف جزبات کا جس حسن و دلآویزی سے اظہار کیا ہے وہ ان کا امتیازی رنگ ہے۔

اردو کی روائتی شاعری میں مرد شعراء نے عورت کو بے وفائی ،سنگدلی وغیرہ جیسی صفات کا حامل ظاہر کیا لیکن پروینؔ شاکر پہلی ایسی شاعرہ ہیں جنہوں نے مرد کا ہرجائی پن، بے اتفاقی اور سنگ دلی کو نسوانی لب و لہجے میں ظاہر کیا ۔اساتذہ غزل کے یہاں یہ روایت چلی آرہی ہے کہ رقیب روسیاہ ہمیشہ مرد ہوتا تھا لیکن پروینؔ شاکر کے یہاں ایک عورت ہے غزل کی روائتی انداز کے برخلاف یہ ایک بہت بڑی تبدیلی ہے ۔

پروینؔ کی غزلوں کی دوسری اہم خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے نسوانی دنیا کا ایک نیا نگارخانہ تشکیل دیا اور اسکے ساتھ ایک نئی امیجری بھی تخلیق کی جس میں بلبل، پروانہ، شمع برق، خرمن، صیدِ صیاد، دانہ ودام جیسے مضامین جو غزل

کا سرمایہ سمجھے جاتے تھے۔تبدیل ہو کر خوشبو، تتلی، دھنک، جگنو، مہندی، چیزی چوڑیاں، ثریا کے گیت اور گلاب، رات کی رانی کا روپ دھار کر غزل کو آراستہ کر رہے ہیں۔ دُھوپ، سورج، شفق، چاند، بادل، روشنی، قوس قزح، ہوائیں، پانی جیسے لفظوں سے انھوں نے اپنی غزل کی امیجری تیار کی ہے۔فہمیدہ ریاض ان کی شاعری کو ان الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کرتی ہیں۔

''پروینؔ شاکر کی شاعری سرتاسر جمال ہی جمال ہے نغمگی ہی نغمگی ہے
اور اس قسم کی شاعری ہمارے معاشرے کے لیے ضروری ہے زندگی
جیسی کہ ہماری دسترس میں ہے نہ اتنی جمیل ہے اور نہ ہی اتنی نازک سو
ایسے میں پروینؔ کی دھنک رنگ شاعری کا آنچل اگر لہرا رہا ہے تو اس
دھنک کے لیے ہم اس خوش گو شاعرہ کے دل سے کیوں ممنوں نہ ہوں اور
حسن و محبت کے اس صحیفے کو جو پروینؔ نے ہمیں سوغات میں دیا ہے۔کیوں
نہ پلکوں پہ رکھیں اور اب ہم اس سے کہنا چاہتے ہیں۔عزیزہ شاعرہ تم غزل
کی البیلی راجکماری ہو محبت اور فطری ذہانت سے زبان کو تم نے خوب خوب
سنوارہ ہے اور اپنے موتی جیسے آبدار تخیل سے مصرعوں کے ہیرے تراشے ہیں۔
یہ کتاب ہاتھ لے ہم سوچتے ہیں کہ جو معاشرہ تم جیسی حسن دل والی لڑکیوں کی
راہ میں کاٹنے بچھاتا رہتا ہے کیا اس پھول جیسی سوغات کا مستحق بھی تھا۔تمہاری
شب بیداریوں نے تمہاری کتاب کے ہر صفحے پر جو نگینے جڑے ہیں ان کے عوض
ہم تمھیں کیا دے سکتے ہیں۔یہ نظمیں اور غزلیں جو دل میں اُترتی ہیں جیسے تھکی
ہوئی پیشانی پر ٹھنڈی ہوا جاں بخش بوسے دے اور ہمیشہ جھکی رہنے

> والی نیند آنکھوں میں اتر آئے۔ ہماری داد اس کے بے پناہ حسن کے سامنے کیا حیثیت رکھتی ہے۔ اور داد سے اس کا واسطہ بھی کیا یہ شاعری تو تمہارے وجود سے اس طرح ابھری ہے جیسے کونپل آپ ہی آپ نمو کی قوت سے مجبور ہوکر پھوٹ نکلے [۱]۔

یونانی شاعرہ سیفو جس طرح زندگی اور حسن سے محبت کرتی ہیں بالکل اُسی طرح پروین شاکر کے ہاں بھی زندگی کی رنگینیوں، رعنائیوں، فطرت کی موسموں اور رنگوں سے والہانہ عشق کا اظہار ملتا ہے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حسن سے دوستی اور پسندیدگی کا جزبہ ان کے خمیر میں گندھا ہوا ہے جو مختلف روپ دھار کر جلوہ گر ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کی خوبصورت چیزیں اپنے حسنِ نظر کی بدولت انہیں بہت حسین معلوم ہوتی ہیں۔ یہی احساسِ جمال ان کی شاعری کو دلکش اور رنگ تغزل کے حسن میں اضافے کا باعث بنتا ہے۔ ''خوشبو'' کے دیباچے میں زندگی سے محبت کا خود اعتراف کرتی ہیں۔

> ''کچھ کم گوش یہ کہتے ہیں کہ اس لڑکی کی شاعری میں سوائے بارش کی ہنسی، پھولوں کی مسکراہٹ، چڑیوں کے گیتوں اور اپنی سوائے گوشیوں کے اور کچھ نہیں۔ اگر زندگی سے محبت کرنا جرم ہے تو یہ لڑکی بڑے غرور کے ساتھ اِس جرم کا اعتراف کرتی ہے''۔ [۲]

ا

۱۔ فہمیدہ ریاض 'خوشبو ایک تاثر'' مشمولہ 'خوشبو کی ہمسفر' مرتبہ ڈاکٹر سلطانہ بخش (اسلام آباد لفظ لوگ پبلی کیشنز، اپریل ۲۰۰۲ء) ۵۷

۲۔ پروین شاکر، خوشبو مشمولہ ماہِ تمام (اسلام آباد، مراد پبلی کیشنز ۱۹۹۴) ۱۹

محبت ایک ایسا زوال موضوع ہے جسے اُردو شاعری میں ہمیشہ سے ہی پزیرائی حاصل ہوتی رہی ہے اسی موضوع کے طفیل فنکاروں کی تخلیقی صلاحیتیں پروان چڑھتی اور نکھرتی بھی رہی ہیں۔ اسے مختلف روپ میں سجا سنوار کر پیش کیا جاتا رہا ہے۔ یہی موضوع پروین شاکر کی شاعری میں نرالی سج دھج کے ساتھ سامنے آیا ہے۔ پروین نے محبت کے جزبے کی بھرپور منظر کشی کی ہے اور اسے تمام جذئیات کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔ آنکھوں کے رستے دل میں بسیرا کرنے، پیار کی کونپل کے تناور درخت بننے سے لے کر محبوب کی بے وفائیوں، کج ادائیوں کے ادراک تک سب کچھ شامل ہے۔

پروین شاکر کے نزدیک 'محبت' ایک الوہی جزبے کا نام ہے جو اپنے اندر اتنی طاقت رکھتا ہے۔ کہ ذرے کو آفتاب بنادے، گونگے کو گویائی کا ہنر عطا کر دے اور اندھے کو چشم بینا سے سرفراز کر دے۔

بلاشبہ پروین کی پہلی کتاب 'خوشبو' میں محبت کے پہلے پہل کے احساس کی دستک محسوس ہوتی ہے۔ 'خوشبو' میں شامل غزلیں ایک نوخیز لڑکی کے کومل جزبوں سے آراستہ ہیں جو اُس جزباتی دور کی نمائندگی کرتی ہیں جب دل کے سونے کواڑ پر پہلی دستک سنائی دیتی ہے۔ من مندر کی پہلی گھنٹی کا احساس جاگتا ہے۔۔ کچی نیند میں سہانے سپنے جلنے لگتے ہیں انجانے واہمے گھیرے رہتے ہیں۔ ہونٹوں پہ شرمیلی ہنسی و بے ساختہ مسکان بسیرا کرتی ہے۔ بے قراری و بے تابی کا احساس کروٹیں لیتا ہے غرض خوشبو ہجر و وصال کے قصے کہانیوں، گیت موسموں، رنگوں حکائتوں، شکایتوں اور اس قسم کے البیلے سے مزین ہیں یہی جزبے اور احساسات پروین کی پہچان کا باعث بھی بنے ہیں۔

خوشبو کے حوالے سے پروین شاکر کی شاعری میں معاملات عشق کی مختلف کیفیات لفظی پیکروں میں ڈھل کر سامنے آتی ہیں۔ وہ تمام معاملات و کیفیات جن کا تعلق عشق سے ہے۔ جیسے ابتدائے عشق، اظہار محبت، شکوہ و شکایت، ایک دوسرے سے خفگی و ناراضگی جس کے نتیجے میں کبھی ایک طرفہ اور کبھی باہمت اجتناب، رقابت کا

جزبہ، وصل وفراق اور کبھی کبھی تیسری ذات کا تصور، یہ اور ایسے کہی مرحلے ہیں جو عشق کے سفر میں پیش آتے ہیں۔ پروین نے عشقیہ شاعری میں ان تمام مرحلوں کو پیش کیا ہے۔

پروین شاکر کی غزلیہ شاعری میں فکر و جزبے کی کشمکش بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔ وہ ایک ایسے شخص کی ہمسفر ہے جسے اس کا دل ٹوٹ کر چاہتا ہے لیکن اس کے ساتھ اس کے دوست کا برتاؤ رفاقت آمیز نہیں جس کے باعث اس کے دل و دماغ میں ایک عجیب کشمکش پیدا ہو جاتی ہے۔

دل اسے چاہے جسے عقل نہیں چاہتی ہے
خانہ جنگی ہے عجب ذہن و بدن میں اب کے

یہ حقیقت ہے کہ پروین کہ 'خوشبو' میں شامل شاعری اِس انوکھے سفر اور اچھوتے تجربے کی داستان معلوم ہوتی ہے۔ جب آنکھیں تو نیند سے بوجھل رہتی ہیں لیکن پلکوں کو خواب چھپانے نہیں آتے۔ ہر جزبہ سچا، بدلتی رتیں، گنگناتے پرندے، اوس میں بھیگی کلیاں، قوسِ قزح کی ست رنگی کمان، شفق کی لیلی، چمکتی چاندانی احساسات پر چھائی رہتی ہے۔ یہی جزبے یہی رنگین احساس خوبصورت لفظوں میں پروین نے اپنی شاعری میں متعارف کرائے ہیں۔ اس سلسے میں فہمیدہ ریاض پروین کی شاعری کے جمالیاتی پہلو پر یوں اظہار خیال کرتی ہیں۔

''زندگی کے بے حس بنا رہنے والے روزمرہ سے چند لمحے بچا کر آپ کسی کنج عافیت میں سکون سے بیٹھے ہیں اور پھولوں پر منڈلاتی ٹھہرتی، پنکھ جوڑتی اور کھولتی تتلی کو غور سے دیکھا ہے۔ اس کے نرم و نازک سبک پروں پر پھیلتی ایک دوسرے میں گھلتی رنگوں کی لکیروں کا نپتے دیکھا ہے۔ پروین شاکر کی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ ''خوشبو'' اس

ہولے سے تھرائے ہوئے تتلی کے پنکھ کا ہی دوسرا نام ہے۔[۱]

بنیادی طور پر پروین شاکر گہرے جمالیاتی شعور کی مالک تھیں۔ اُن کے جمالیاتی شعور میں رچاؤ اور بالیدگی ہے احساسِ جمال کے رنگوں میں ڈوبا ہوا، پروین کے کہنے کا ایک نرالا انداز اُن کی شاعری میں دلکشی اور رنگِ تغزل میں ایک انوکھے حسن کا اضافہ کر دیتا ہے۔ نمونہ ملاحظہ :

اتر رہی ہیں عجب خوشبوئیں رگ وپے میں
یہ کس کو چھو کے میرے شہر میں صبا آئی

خوشبو بتا رہی ہے کہ وہ رستے میں ہے
موجِ ہوا کے ہاتھ میں اُس کا سراغ ہے

ہوا میرے جوڑے میں پھول سجاتی جا
دیکھ رہی ہوں اپنے من موہن کی راہ

میں پھول چنتی رہی اور مجھے خبر نہ ہوئی
وہ شخص آ کے مرے شہر سے چلا بھی گیا

پروین کی شاعری میں انتظار کی شدت اپنے کئی رنگوں اور کیفیتوں کے ساتھ جلوہ گر ہے جس کے باعث اس کی شاعری میں محبت کی ایک ایسی فضا تشکیل پاتی ہے جس میں خود سپردگی کا عالم نمایاں طور سامنے آتا ہے۔ ایک ایسا انتظار جو پلکوں پہ ستارے روشن کر دے۔ گھر کا یہ عالم کہ در و دیوار سے بھی دوست کے دیدار کی حسرت ٹپک رہی ہے، دریچے نیم وا اور در کھلے ہوئے ہیں لیکن جس کا انتظار ہے وہ اپنے وعدے کے مطابق نہیں پہنچ

---

[۱] سردار جعفری، نئی خوشی مشمولہ خوشبو کی ہمسفر مرتبہ، ڈاکٹر سلطانہ بخش (اسلام آباد، مراد پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء) ۲۵

پاتا۔شاید ہی کبھی ایسا موقع آتا ہو جب دروازہ کھولنے پر اچانک محبوب سامنے کھڑا ہوا نظر آئے۔جو شخص دن بھر کسی کا راستہ دیکھے یہاں تک کہ شام ہو جائے آنکھیں دھندلا جائیں اور صبح کا بھولا کو بھی نہ لوٹے تو ظاہر ہے۔اس کا ردِ عمل ہونا یقینی ہے۔

پروینؔ جب اپنی ذات سے متعلق اظہار خیال کرتی ہے تو اس کے لہجے میں اس بات کا اعتراف بھی نمایاں ہو کر سامنے آتا ہے کہ وہ اپنے دوست کو برتر مقام دے کر اپنے آپ کو کمتر درجہ دیتی ہے۔

پروینؔ کی شاعری کے مطالعے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اب تک اُردو غزل سادگی، معصومیت سے بھرے پاکیزہ کنوارے، روپہلے جذبوں اور خوابوں کو گویائی کا ہنر عطا کرنے کے لیے کسی کی راہ تک رہتی تھی جنھیں پروینؔ شاکر کی زبان مل گئی۔پروینؔ نے ایک نوعمر لڑکی کی سوچوں، کیفیتوں اور تجربوں کو اپنے رگ و پے میں اتار کر اِس طرح سے شعری قالب میں ڈھال دیا کہ جذبے نکھر اور سنور گئے ایسے احساسات اور کیفیات جو نوعمر لڑکیوں کے دل کے نہاں خانوں میں جنم لیتے ہیں اور اقرار و اظہار سے پہلے ہی دم توڑ دیتے ہیں جنھیں وہ کسی سے کہہ نہیں پاتیں ہیں بس اندر ہی اندر چھپائے رکھتی ہیں۔اکھیوں کے جھروکوں سے ممنوعہ خوابوں کے ذائقے چکھتی رہتی۔خوشبو کی شاعری میں درد کی ٹیس، سلگنے والی کیفیت کا اظہار ملتا ہے چند اشعار پیش خدمت ہیں:

وہ بدن کا پہلے پہل آگ چھکنا
رگ و پے میں کوئی لذت عجیب تھی

کانپ اٹھتی ہوں یہ سوچ کے تنہائی میں
میرے چہرے پہ ترا نام نہ پڑھ لے کوئی

بار ہا تیرا انتظار کیا
اپنے خوابوں میں اک دلہن کی طرح

ماں سے کیا کہیں گی دکھ ہجر کا خود پر تھی
اتنی چھوٹی عمر کی بچیاں نہیں کھلتیں

کاش صندل سے مری مانگ اجالے آکر
اتنے غیروں میں وہی ہاتھ جو اپنا دیکھوں

تو میرا کچھ نہیں ہے مگر جانِ حیات
جانے کیوں ترے لیے دل کو دھڑکتا دیکھوں

وہ سوتے جاگتے رہنے کے موسموں کا فسوں
کہ نیند میں ہوں مگر نیند میں نہ آئی ہوں

'خوشبو'

فطری بے ساختگی میں شاعری کا حسن پوشیدہ ہے۔ پروین کے یہاں بھی فطری بے ساختگی کا اظہار پایا جاتا ہے۔ اپنے مشاہدات وتجربات کو غزل کے پیکر میں ڈھالتے وقت اُن کا لب ولہجہ بے ساختگی کی طرف مائل رہتا ہے جس میں قاری محسوس کرتا ہے کہ یہ ایک سچے انسان سے محوِ گفتگو ہے جو ایک ایسی لامتناہی دنیا کی سیر کر وا رہا ہے جو اس کے اپنے تجربے ومشاہدات پر مبنی ہے پروین عشق ومحبت کے مختلف مراحل اور کیفیات کی عکاسی اس طرح سے کرتی ہیں کہ جیسے وہ خود اِس تجربے میں شریک رہی ہوں۔ ان کی غزلوں میں بھرپور رعنائیوں کے ساتھ عشق ومحبت اور اِس سے وابستہ تمام معاملات موجود ہیں۔ غمِ فراق کی آگ میں جھلنے کی کیفیت ہے اور نشاطِ وصل کی سرشاری کا بیان بھی درد آئیں، آنسو، نیندیں، رت جگے، سراب عذاب کے ساتھ ساتھ لذتِ لمس وخود سپردگی کا نشہ بھی، تہذیب وشائستگی کے دائرے میں موضوعِ سخن بنے ہیں اِس سلسلے میں یوسف رجا چشتی اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں:

''پروین نے اپنی شاعری میں توازن بر قرار رکھاجنس اورلمس
رومان کے سطحی مضمون میں آتے ہیں۔لیکن پروین شاکرنے
رومان کی فضا میں لمس کو بیان کیا تو وہ خوشبو کی صورت سے آئی یہ
خوشبو پھولوں کی نہ تھی بلکہ انسانی محسوسات کی خوشبو تھی پروین شاکر کی
شاعری نے خوبصورت سچائیوں کے ساتھ بہ وقت نوجوانوں اور بزرگوں
کو یکساں متاثر کیا وہ لمس، محبت اور عقیدے کی بات کرتے ہوئے متوازن
نظر آتی ہے اور جسم کی ترجمانی کے ساتھ روح کی پاکیزگی کو بھی خوبصورتی سے
بر قرار رکھا'' [۱]

پروین کی غزلوں میں عشقِ مجازی کی برعکس عشقِ حقیقی کا بیان ہے۔اُن کے ہاں جس محبوب کا پیکر ابھرتا ہے وہ وہم وگمان سے ماور انہیں بلکہ ایک جیتا جاگتا گوشت پوست کا انسان ہے اور وہ خود ایک مکمل عورت کی نمائندگی کرتی ہوئی نظر آتی ہیں جس کے دل میں اپنے محبوب کے لیے والہانہ محبت وعقیدت ہے وہ ایثاروفا کی دیوی ہے ایک طرف خودسپردگی و نیاز مندی کی احساس سے لبریز ہے تو دوسری طرف وہ رقابت کا جزبہ بھی رکھتا ہے جس سے محبت کرتی ہے اُسے صرف اپنا دیکھنا چاہتی ہے۔ اُس کا 'ہرجائی پن' دیکھ کر بے قرار ہو جاتی ہے۔ اپنے سچ کے آگے اُس کا جھوٹ دیکھ کر لاجواب ہو جاتی ہے۔عشق کے راستے کے سارے عذاب اپنے نام اور ثواب اُس کا نام رقم کرنا چاہتی ہے اپنا تن من اُسی پر نچھاور کرنے کو تیار رہتی ہے۔اُس کی بے وفائی کو مصلحت کے پردے میں چھپائی ہے تاکہ مرد کے نام کا سائبان

یوسف راجا چستی پروین شاکر سمپوزم مقالہ مشمولہ خوشبو پھول تحریر کرتی ہے ترتیب وتدوین ڈاکٹر سلطانہ بخش (اسلام آباد لفظ لوگ پبلکیشنز، ۲۰۰۶) ۳۰۵

اپنے زبان کی کڑی دھوپ سے بچا تا رہے۔مرد کی بے رُخی سے اُس کے ذہن ودل میں کشمکش جاری رہتی ہے۔ وہ نم آنکھوں سی اپنی ہتھیلیوں کی لکیروں کو کھوجتی ہے اور اپنی تقدیر سے شکوہ کناں ہوتی ہے۔خود سپردگی،قربت و آرزو مندی حکائتیں ہجر ووصال کے رنگوں سی مزیں خیالات کی رنگارنگی ملاحظ فرمائیں۔

یہ کیا کہ میں تیری خوشبو کا صرف ذکر سنوں
تو عکس موجہ گل ہے تو جسم وجاں میں اتر
پیراہن میرا اگر اُس کے بدن کی خوشبو
اُس کی ترتیب ہے ایک ایک شکن کی خوشبو
نیم تاریک تنہائی میں سرخ پھلوں کا بن کھلا اٹھا
ہجر کی زرد دیوار پر تیری تصویر کے لگ گئی
پھول کی طرح مرے جسم کا ہر لب کھل جائے
پنکھڑی پنکھڑی اُن ہونٹوں کا سایہ دیکھوں
رگ ورپے میں تیرالمس اترتا دکھائی دے
جو کیفیت بھی جسم کو دے انتہائی دے

’خوشبوٗ‘

پروین شاکر کی غزلیہ شاعری میں ’خوشبوٗ‘ سے ’کفِ آئینہ‘ تک محبوب سے جدائی کے غم کا اظہار بہت شدت سے پایا جاتا ہے۔جسے انھوں نے کئی رنگ عطا کئے ہیں۔ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ کسی قیمتی چیز کی تلاش میں سرگرداں ہیں جو کارزارِحیات کے گھمسان میں کہیں کھو چکی ہے جس کا ملنا محال ہے۔اس کا سبب اُن کی ذاتی زندگی کا المیہ بھی ہے۔شوہر سے علیٰحدگی کے بعد وہ اُسے محبوب کی شکل میں ہمیشہ یاد کرتی ہوئی نظر آتی ہیں جسے باوجود کوشش کہ وہ بھلا نہ سکیں۔اُس کے لیے وہ نیک تمناؤں اور دعاؤں کے نذرانے بھیجتی ہیں۔اُس کے خیالوں کے حصار میں رہنا پسند کرتی ہیں اُن کا دل اُس کی شادابی وخوشحالی کے جزبات سے لبریز رہتا ہے

مثلاً اپنے ہاتھوں سے اُس کی دلہن سجانا، اُسے چاندنی کے سپرد کر کے خود گھر کے اندھیروں میں لاٹ آنا۔ رشتہ بے نام کا ہمیشہ کے لیے ختم ہو جانا مگر پھر بھی اُس کے اشاروں پہ سر جھکانا، واقعی پروینؔ کے کمال ضبط کا بہت بڑا ثبوت ہیں۔ اُن کا یہ کردار ہندی شاعری کی عورت سے بہت حد تک ملتا جلتا نظر آتا ہے جو اپنے گیتوں میں مرد کو مخاطب کر کے تن اور من کے روگ اس کے گوش گزار کرتی ہے اور محبوب کے در پر سر جھکانے کو ہی زندگی کی معراج سمجھ لیتی ہے کسی کے سامنے اپنا آپ منفی کر دینا اُس کی رضا میں شامل ہو جانا ایک مشکل کام ہے اُن کے یہاں محبت ایک دوسرے کی خواہشات کے ادراک اور احترام کا نام ہے۔

تجھ پہ گزرے نہ قیامت شب تنہائی کی
کمال ضبط کو خود بھی تو آزماؤں گی
میں اپنے ہاتھ سے اُس کی دلہن سجاؤں گی
سکونِ دل کے لیے میں کہاں کہاں نہ گئی
مگر یہ دل کہ سدا اس کی انجمن میں رہا
کہیں رہے وہ مگر خیریت کے ساتھ رہے
اُٹھائے ہاتھ تو یاد ایک ہی دعا آئی خوشبوؔ

اُردو غزل کی روایت چلی آ رہی ہے کہ ہجر یا جدائی کا سبب محبوب کو گردانا جاتا ہے۔ پروینؔ شاکر کا یہ منفرد انداز ہے۔ کہ انھوں نے ''ترک رِفاقت'' کا لزام اپنے سر لے لیا ہے۔

؎ کچھ تو تھی میری خطا ورنہ وہ کیوں
اِس طرح ترک رفاقت کرنا
؎ ہم خود بھی جدائی کا سبب تھے

اُس کا قصور سارا کب تھا

غزل گوشعراء کے یہاں ہجر کی طویل رات کا کرب، عاشق کی بے بسی و بے قراری اضطراب، تارے گننے کی کیفیات پائی جاتی ہیں۔ پروینؔ کے یہاں اب یہی احساسات ایک عورت کے حصے میں آئے ہیں۔

؎ نیند تو خواب ہے اور ہجر کی شب خواب کہاں
اس اماوس کی گھنی رات میں مہتاب کہاں

؎ پورا دُکھ اور آدھا چاند
ہجر کی شب اور ایسا چاند

اسی مضمون سے متعلق مؤمن کا ایک زبردست شعر ہے۔

؎ تو کہاں جائے گی کچھ اپنا ٹھکانہ کرلے
کل تو ہم خوابِ عدم میں، شب ہجراں ہوں گے
ٹھہر کے دیکھے تو رُک جائے نبض ساعت کی
شب فراق کی قامت ہے کس قیامت کی

اور غالب 'ہجر کی رات' کا سنگھار کچھ اس منفرد انداز سے کرتے ہیں۔

؎ جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شامِ فراق
میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہوگئیں

پروینؔ کی غزلیہ شاعری میں نازک احساسات کی مالک لڑکی کا کردار جیتا جاگتا نظر آتا ہے جو دل کی تمام تر چاہتوں اور شدتوں سے اپنے محبوب کی پرستش کرتی رہی لیکن ذرا سی ٹھیس سے نازک آبگینوں کی مانند ٹوٹ جاتی

ہے ۔

؎ کیا دیکھ تھا کون جان سکے گا نگارِ شب
جو میرے اور تیرے دوپٹے بھگو گئے

؎ بس یہ ہوا کہ اُس نے تکلف سے بات کی
اور ہم نے روتے روتے دوپٹے بھگو لئے

غرض یہ کہ ’خوشبو‘ ایک ایسی لڑکی کی کہانی ہے ۔ جو ساحل پر ریت سے ننھے ننھے گھروندے بناتے ہوئے سمندر سپنے سجانے کی شروعات کرتی ہے انجام سے بے خبر رنگوں، خوشبوؤں، ساون رتوں میں زمردی خواب بنتی رہتی ہے اور اک دن سمندر کی سرکش لہریں اُس کے خوابوں کا نازک سا گھروندا بہالے جاتی ہیں جس کی یاد میں اس کی پلکیں ہمیشہ نمناک رہتی ہیں ۔

’صد برگ‘ میں سفر کچھ آگے بڑھتا ہے ۔ اس میں خوشبو والی لڑکی حصارِ رنگ و بو سے حقیقت کی سنگلاخ دنیا میں پہنچ جاتی ہے ۔ زندگی کی تلخیاں اُسے سمجھا دیتی ہیں ۔ کہ زندگی صرف خوشیوں کے ہنڈولوں میں جھولنے کا نام نہیں ۔ زندگی بارش کی رم جھم، گلِ انار کی گلابی چھاوؤں اور عنابی شاموں کے فسانوں سے بڑھ کر بھی کچھ ہے یعنی زندگی پیچیدہ اور کڑی حقیقتوں کو سہنے کا نام ہے ۔

’صد برگ‘ کی شاعرہ کے سامنے زندگی کے اچھے اور بُرے پہلو سامنے آجاتے ہیں اُس میں اتنی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے کہ زندگی کی حقیقتوں سے آنکھیں چار سکے ۔ وہ حالات کے سامنے سرنگوں نہیں ہوتی بلکہ اعتماد، حوصلے اور جرات سے حالات کی صلاحیت رکھتی ہے ۔

’’صد برگ کے دیباچے میں رزق ہوا میں لکھتے ۔

’’ ہرا نکار پر میرے جسم میں ایک میخ کا اور اضافہ ہوگیا مگر میخیں ٹھونکنے والوں

نے میری آنکھوں سے کوئی تعرض نہ کیا۔شاید وہ جانتے تھے کہ انھیں بجھانے سے
میرے اندر کی روشنی میں کوئی فرق نہیں پڑے گا یا پھر اپنی سفا کیوں سے لطف
اندوز ہونے کے لیے وہ ایک گونگے گواہ کے طالب تھے اور میں حیران ہوں کہ
اس گواہی سے میری آنکھیں اب تک پتھرائی کیوں نہیں ''[۱]

''صد برگ'' میں ایک لڑکی سے زیادہ ایک عورت کا پختہ رچا ہوا لہجہ سنائی دیتا ہے جو' خوشبو' سے مختلف ہے اگر چہ کسی حد تک ایک زیریں لہر کی طرح خوشبو والا تاثر ''کفِ آئینہ'' تک جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔ ''صدر برگ'' زندگی کی دشتِ بے پناہ کے رستے کی کھٹنائیوں سے نبرد آزما ہونے والی عورت کی آواز ہے۔ وقت وحالات کی ستم ظریفیاں اُس کے زاویہ نگاہ میں بھی تبدیلی پیدا کرتی ہیں۔جس کی وجہ سے وہ زندگی کو خوابوں کی چلمن سے دیکھنے کے بجائے ایک چیلنج کے طور پر قبول کرتی ہے۔

شب وہی لیکن ستارہ اور ہے
اب سفر کا استعارہ اور ہے
سکھ کے موسم انگلیوں پہ گن لئے
فصلِ غم کا گوشوارہ اور ہے
کیسی گھڑی میں ترکِ سفر کا خیال ہے
جب ہم میں لوٹ آنے کا یارا نہیں رہا

خوشبو کے مقابلے میں ''صد برگ'' میں جزبات واحساسات کا وفور اور وارفتگی کچھ کم ہے۔اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ شاعرہ کی اپنی زندگی کا ایک نیا رُخ اختیار کر چکی ہوتی ہے۔دوسری طرف وطن کی سرزمین بھی

---

[۱] پروین شاکر دیباچہ''صد برگ'' مشمولہ ماہِ تمام (اسلام آباد ، مراد پبلیکیشنز ، ۱۹۹۴) ۱۳

مارشل لاء (فوجی قوانین) کے تسلط میں آ چکی ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہ گھٹن اور جبر محسوس کرتی ہے۔ اپنے دل کا درد علامتوں کے ذریعے اپنی شاعری میں انڈیل دیتی ہیں ''صد برگ'' کے لب و لہجے اور موضوعات کا پس منظر بتاتے ہوئے کہتی ہیں کہ:

''صد برگ'' تک آتے آتے منظر نامہ بدل چکا تھا میری زندگی کا بھی اور اُس سرزمین کا بھی جس کے ہونے سے میرا ہونا ہے۔ رزم گاہِ جاں میں ہم نے کئی معرکے ایک ساتھ ہارے اور بہت سے خوابوں پر اکھٹے مٹی برابر کی۔ شامِ غریباں کی پینٹنگ کیسی بنے گی۔ کوفہ شہر کے منارے سبز تو نہیں ہوسکتے ناسچائی جب مُخبروں میں گھر جائے تو گفتگو علامتوں کے سپرد کر دی جاتی ہے۔ ایک بار پھر صد برگ اور آپ اکھٹے ہو رہے ہیں!'' [1]

پروین شاکر کے یہاں صد برگ کے تناظر میں جو شعری کردار ایک عاشق کے روپ میں ابھرتا ہے۔ تضادات کا مجموعہ ہے وہ کسی محبوب کا ہم مزاج ہو کر اپنے رشتہ، محبت کو استوار رکھتا ہے ۔تو مختلف مزاج کے باعث عاشق اور محبوب کے درمیان ایک خلیج سی پیدا ہو جاتی ہے جس کی وجوہات مختلف ہوتی ہے جن میں شاعرہ کے محبوب کا ہرجائی پن اس کے ترکِ رفاقت کیے پریشان کن اقدام کا عمل اور ترکِ تعلق کے لئے راستوں کا کھلا رکھنا، کچھ شاعرہ کی تلخ نوائی، تلون مزاجی، جس کے نتیجے میں باہمی اجتناب اور رشتوں کے فاصلے اس مقام پر لے آتے ہیں کہ جہاں پہچان کی بازیافت تک ممکن نہیں رہتی اور ان سب باتوں کی وجہ رشتوں کا یک رخا پن بھی ہے کہ جس کی وجہ سے رشتہ محض ایک عادت بن کر رہ جاتا ہے۔ ان سب باتوں کے علاوہ بھی پھر سے کسی کے انتظار میں دریچے وا رکھنے کا عمل اور تجدیدِ وفا کی خواہش ایک دوسرے

---

۱ ''پروین شاکر دیباچہ 'صد برگ مشمولہ ماہِ تمام (اسلام آباد مراد پبلکیشنز، جون ۱۹۹۰) ۶۸

کے لئے کشش کا باعث اور متضاد وکیفیتوں کی کشمکش ایک عجیب سی ہیجائی کیفیت پیدا کر دیتی ہے۔ بیک وقت مختلف کیفیات کی عکاسی اور عمل وردعمل کے بے معنی نتائج زندگی کو بھی بے معنویت کے مقام پر لا کھڑا کرتے ہیں

؎ موجہ خواب ہے وہ اس کے ٹھکانے معلوم
اب گیا ہے تو یہ سمجھو کہ پلٹنا مشکل

؎ اس ترک رفاقت پہ پریشان تو ہوں لیکن
اب تک کے ترے ساتھ پہ حیرت بھی بہت تھی ؎[۱]

زندگی کی کڑواہٹوں، تلخ تجربوں اور سفاکیوں کے بیان میں زبان کی دلکشی متاثر نہیں ہوئی بلکہ لفظوں کی نرماہٹ تھوڑی سی سختی میں تبدیل ہوئی ہے۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ اُن کے لب و لہجے اور فن میں ایک طرح کا نکھار پیدا ہوا ہے اُن کی شاعری میں ایک ارتقائی صورتحال کا احساس جاگزیں ہے وہ ''خوشبو'' کے سفر سے لے کر اپنے آخری مجموعے ''کفِ آئینہ'' میں اپنے فکروفن کے مختلف مدارج زینہ بہ زینہ طے کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ اکثر شعراء شروع سے آخر تک اپنے ابتدائی دور میں پیش آنے والے موضوعات و تجربات کی گھتیاں سلجھاتے رہتے ہیں۔ اُن کی سوچ ایک ہی دائرے میں گردش کرتی رہتی ہے۔ اس طرح اُن کے ہاں ایک ایک رنگی اور اکتاہٹ پائی جاتی ہے لیکن پروینؔ کے یہاں ''خوشبو'' کے بعد تجربات و مشاہدات اور موضوعات کے اعتبار سے ندرت اور وسعت پائی جاتی ہے۔ اگرچہ '' خوشبو'' کی شاعری سے ہی اس کے آثار نظر آتے ہیں۔ سوچ اور فکر کی تبدیلی کے ساتھ لفظیات میں بھی نمایاں فرق دکھائی دیتا ہے جو ان کی فکرانہ عظمت کی دلیل ہے 'خوشبو' میں تبدیلی ، دھنک ، پھول ، ہوا جیسے استعارے استعمال ہوئے ہیں۔ جبکہ 'صد برگ' 'خود کلامی' اور 'انکار' میں کڑے حالات کی بھٹی میں جھلسنے کے بعد ان

۱۔ ڈاکٹر روبینہ شبنم، اردو غزل کی ماہِ تمام پروینؔ شاکر (نئی دہلی، گولا مارکیٹ، ۲۰۰۴) ۱۷

یہاں لفظیات بھی تبدیل ہوئی ہیں۔جن سے اظہار کی شدت اور تلخ نوائی کا اندازہ ہوتا ہے۔

جرم،سزا،منصف،فردِ جرم، تیر،تعزیر،لہو، قاضی،، مقتل،صلیب، سانپ، زہر رنگ، بھیڑیا بھنور، پھن وغیرہ جیسے استعارے معنویت کی گہرائی کے ساتھ استعمال ہوئے ہیں جو زندگی کی سنگین حقیقتوں ملک کی سیاسی منظرنامے اور ناگفتہ حالات کے اظہار کے لیے مناسبت رکھتے ہیں۔

سیاسی ومعاشرتی ظلم وچیرہ دستیاں تیکھے اور کاٹ دار انداز میں اظہار پا گئی ہیں۔چند مثالیں۔

ے بس اے بہار کے سورج بڑھا یہ قہر کا رنگ
جلا گئی ہے تری دھوپ مرے شہر کا رنگ

ے کنارے جوئے رواں جب سے قتل گاہ بنی
ہجوم اڈنے لگا دیکھنے کو نہر کا رنگ

ے پابہ گل سب ہیں رہائی کی کرے تدبیر کون
دست بدستہ شہر میں کھولے مری زنجیر کون

وہ اپنے وطن کے اُس سیاسی ومعاشی ومعاشرتی نظام کی شاکی ہیں جہاں بہار شہر کے رنگ کو جھلسا دے جہاں سچ کا علم بلند کرنے والوں کو پابند سلاسل کیا جائے اور انصاف کا خون ہو،لوگ اتنے بے حس ہو جائیں کہ وہ اپنوں کے بہتے ہوئے لہو کا نظارہ مزے لے کر دیکھتے ہوئے دل بہلاتے رہیں۔

کسی بھی معاشرے میں عدالتیں حق و باطل کے میزان کی علامت سمجھی جاتی ہیں جو مظلوموں کی دادسی، غریبوں کو انصاف کی فراہمی اور ان کے حقوق کی بازیابی میں نمایاں کردار ادا کرتی ہیں۔لیکن آج کے دور میں انصاف کا حصول کار دراز والا معاملہ ہے آئے دن یہاں انصاف کا خون ہوتا رہتا ہے۔اور ہم چپ سادھے تماشا دیکھتے رہتے ہیں۔شاعرہ کو یہ احساس ہے کہ اس اقدار کے آشوب میں مبتلا معاشرے کے یہ قانونی

ادارے حق وانصاف کے نام پر ایک مزاق ہیں۔ خاص طور پر صنفِ نازک کے لئے ان عدالتوں کے ذریعے انصاف کا ماحول کوئی اتنا آسان کام نہیں ہے۔ جس معاشرے کی بنیادوں میں جھوٹ اور منافقت رچ بس گیا ہو وہاں خلقِ خدا کا سچ کے ''آئینہ ساز'' کو قابلِ گردن زنی ٹھہرنا یقینی ہے۔ پروین اپنے تجربے کی وسعت و صداقت کے بل بوتے پر جھوٹ، منافقت، ریاکاری کے مقالے میں حق وصداقت کا علم بلند کئے رہتی ہیں۔ 'صدر برگ' اور 'خود کلامی' سے چند مثالیں ملاحظہ کریں۔

ے سچ جہاں پابستہ، ملزم کے کٹہرے میں ملے
اُس عدالت میں سنے گا عدل کی تفسیر کون

ے کس بستی میں ہوگی سچ کی حرمت
ہمارے شہر میں باطل بڑا ہے

ے میری چھٹی ہوئی رداد بے بھی گئی بیان مگر
فیصلہ رُک گیا ہے ایک اور گواہ کے لئے

ے جھوٹ کے شہر میں آئینہ کیا سنک آٹھائے ہوئے
آئینہ ساز کی کھوج میں جیسے خلقِ خدا لگ گئی

وہ اپنی غزل میں کافی باریک بین نظر آتی ہیں۔ حقیقتوں کی آ گہی نے بے شک ان کے قلم میں تلخی بھر دی ہو لیکن یہ تلخی اُن کے مزاج میں دل موہ لینے والی مٹھاس اور والہانہ پن کو متاثر نہیں کرسکی۔ اگر چہ بے رحم حالات کے تازیانے رسائی کے عذاب اُن کے مقدر میں لکھ دیتے ہیں۔ جو کہیں نہ کہیں اُن کے ہاں اُن کے شعروں میں بولتے نظر آتے ہیں دکھ اور شکستگی کا احساس دلاتے ہیں۔

ے لوگ نہ جانے کن راتوں کی مرادیں مانگا کرتے ہیں

اپنی رات تو وہ جو تیرے سات گزار گئے جاناں
؎ بجھ گئی آنکھ تو پیراہن تر کیا لائے
چاہ سے اب مرے یوسف کی خبر کیا لائے
؎ شب گزار و وہ ستارہ تومرا ڈوب گیا
اب دم صبح دعاؤں میں اکثر کیا لائے

وہ زمانے کے غم کو اپنا غم بنا کر پیش کرنے کا ہنر جانتی ہیں۔اُن کی شاعری کی خاص بات وہ سچائی اور حقیقت ہے جسے انھوں نے بغیر کسی تصنع اور بناوٹ کے اپنے شعروں میں بیان کر دیا ہے۔اِس میں درد و کسک بھی ہےاور ایثارِ وفا کے کئی رنگ ہیں ایسا لہجہ جو محبتوں اور چاہتوں کی شدت سے بھر پور ہے۔

؎ عجیب خواب تھا آنکھیں ہی لے گیا مری
کرن کا عکس اب بھی مری دسترس میں نہیں
؎ قدموں میں تکان تھی گھر بھی قریب تھا
پر کیا کریں کہ اب کہ سفر بھی عجیب تھا
؎ اِک مشتِ خاک اور وہ بھی ہوا کی زد میں ہے
زندگی کی بے بسی کا استعارہ دیکھنا

پروین کی غزل میں تجدید محبت کا رجحان بھی بار بار سامنے آتا ہے۔ترکِ تعلق کے باوجود رشتوں کے از سرِ نو بازیافت اپنے دامن میں درد و کسک کی کیفیت لئے ہوئے ماضی کی طرف واپس لوٹتی ہے اور فطرت کے جمالیاتی عناصر میں دوست کی شباہت جلوہ گر ہوتی ہوئی نظر آتی ہے جس شاعرہ تشبیہات و استعارات کے پردے میں شعری پیکر عطا کر کے تخلیقی سطح پر انسانی جزبات و احساسات کی مصور بن جاتی ہے ۔

؎ قرار داد محبت تو کب فسخ ہوئی
فریق آج یہ کیسی قسم اُٹھاتے ہیں
؎ ریت ابھی پچھلے مکانوں کی نہ واپس آئی تھی
پھر لبِ ساحل گھر وندہ کرگیا تعمیر کون [1]

پروین شاکر کی شاعری میں بیسویں صدی میں سانس لینے والی عورت کا پیکر ابھرتا ہے وہ یہ جانتی ہے کہ عورت مرد کے مقابلے میں کسی بھی لحاظ سے کم نہیں ہے بلکہ اُسے خدا نے تخلیقی جوہر سے آراستہ کر کے مرد سے بھی برتر مقام پر فائز کیا ہے لیکن اُس کی تمام تر ذہانتوں اور لیاقتوں کے باوجود اُس کی سوچیں، خیالات اُس مرد کے تابع ہوتے ہیں۔ جسے اُس کی تقدیر کا مالک بنا دیا جاتا ہے ۔ جب تک وہ اُس کے ہر جھوٹ سچ کے آگے اُس کی ہاں میں ہاں ملاتی رہے تب تک تو سب ٹھیک ہوتا ہے۔ تضاد اُس وقت پیدا ہوتا ہے جب عورت اپنے وجود کا ثبوت چاہتی ہے۔ مرد اپنی جھوٹی انا کی تسکین کی خاطر اُسے نیچا دکھانا چاہتا ہے وہ ہر طرح سے اُسے زیر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ مرد اساس معاشرے میں عورت کے استحصال اور مرد کی منافقت کی کہانیاں پروین کی غزل کا موضوع ہیں۔

؎ اندھیرے میں تھے جب تلک زمانہ ساز گار تھا
چراغ کیا جلادیا ہوا ہی اور ہوگی
؎ اب تو اس کے چہرے میں بے پناہ چہرے ہیں
کیا عجیب نعمت تھی ورنہ بے خبر ہونا

---

[1] ڈاکٹر روبینہ شبنم، اردو غزل کی ماہِ تمام پروین شاکر (نئی دہلی، ماڈرن پبلشنگ ہاوس، ۲۰۰۴) ۱۷

؎ اس ترکِ رفاقت پہ پریشان تو ہوں لیکن
اب تک کہ تیرے ساتھ پہ حیرت بھی بہت ہے۔

؎ ؎ اپنے قاتل کی ذہانت سے پریشان ہوں میں
روز اک موت نئے طرز کی ایجاد کرے

پروین کی غزل اُس جدید عورت کی ترجمان ہے جو ذہن وفکر شعور واحساس کی دولت سے بہرہ ور ہے جو اپنی زندگی کی الجھی راہوں کو اپنے فکر کی تابنا کی سے سلجھانے کی کوشش کرتی ہے عورت کو درپیش بے رحم حقیقتوں اور سفاکیوں کے پردے چاک کرتی ہے۔

؎ جلا دیا شجرِ جاں کہ سبز بخت نہ تھا
کسی بھی رُت میں ہرا ہو، یہ وہ درخت نہ تھا

؎ ذرا سے جبر سے میں بھی تو ٹوٹ سکتی تھی
مری طرح سے طبیعت کا وہ بھی سخت نہ تھا

؎ بدن میں پھیل گیا سرخ بیل کی مانند
وہ زخم سوکھتا کیا جس کا چارہ گر ہی نہ تھا

؎ میں اتنے سانپوں کو رستے میں دیکھ آئی تھی
کہ تیرے شہر میں پہنچی تو کوئی ڈر ہی نہ تھا

؎ رفاقتوں کا مری، اُس کو دھیان کتنا تھا
زمین لے لی مگر آسمان چھوڑ گیا

پروین واقعات کو اُنکے صحیح تناظر میں دیکھنے کی اہلیت رکھتی ہیں اُن کی غزل نت نئے تجربوں کی

حامل ہے جدید دور کی زندگی اُس سے وابستہ مسائل اور ایسے اپنی تمام جزئیات کے ساتھ بیان ہوئے ہیں ایسے مسائل اور ایسے جو انسان کی پر سکون دنیا کو تہہ و بالا کر کے رکھ سکتے ہیں جن سے انسان لامتناہی دکھوں میں جاتا ہے یہ تجربے اور مشاہدے آفاقی حیثیت رکھتے ہیں آفاقیت کے عنصر کے بغیر کوئی بھی شاعر اونچی اڑان نہیں اڑ سکتا۔ پروین کے یہاں جو تجربے ہوئے ہیں اُن کی معنویت ہر دور کے لیے مسلم ہے۔ پروین کی شاعری کی انقلابی اور آفاقی روح اُن کے جزبہ انسانیت کی گواہی دیتی ہے وہ ایسے افراد کو تنقید کا نشانہ بناتی ہیں جو اپنے افعال و اعمال سے معاشرے کے لیے ناسور ثابت ہوتے ہیں جو لوگوں کے لبوں کی مسکراہٹ چھین کر آنسوؤں، آہوں اور سسکیوں کے تحفے دیتے رہتے ہیں۔ یہ بے شناخت و بے چہرہ لوگ اپنی ذاتی مفاد کے لیے معاشرتی کو درہم برہم کر کے رکھ دیتے ہیں۔

پھر رہے ہیں مرے اطراف میں بے چہرہ وجود
اِن کا کیا نام ہے یہ لوگ ہیں کِن ذاتوں کے

پورے انسانوں میں گھس آئے ہیں
سر کٹے جسم کٹے ذات کٹے

دنیا کا منظر آج نامہ بدل گیا ہے آج کا انسان معاشی و معاشرتی نظام کے درہم برہم ہو جانے سے نئے نئے مصائب، الجھنوں اور محرومیوں کا شکار ہے وہ تلخیوں بھری زندگی گزارنے پر مجبور رہے ہر طرف سے ذہنی دباؤ، گھٹن، نا آسودگی جیسے احساسات میں گھرا ہوا ہے۔ اُس کے لبوں پر مسکراہٹ ہے لیکن اندر سے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے وقت و حالات کی سنگینی و سرد مہری نے اُس کے احساسات کو کچل کر رکھ دیا ہے وہ ایک روبوٹ کی طرح مشینی زندگی گزار رہا ہے جسے پروین ''حنوط شدہ لاشوں سے تشبیہ دیتی ہیں۔

اہرام ہے کہ شہر مرا

انسان ہیں یا حنوط لاشیں

؎ سڑکوں پہ رواں، یہ آدمی ہیں
یا نیند میں چل رہی ہیں لاشیں

پروین شاکر کی شاعری کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ نہ صرف ایک عورت بن کر بلکہ انسان بن کر سوچتی ہیں۔نسائی احساسات و مسائل کے ساتھ انسانیت کو درپیش مسئلوں اور المیوں کی طرف توجہ دلاتی ہیں اُن کے ہاں ایک فرد کی تصویریں اُس کے خوابوں اور عذابوں سمیت نظر آتی ہیں۔ وہ اپنے غم سے نکل کر کائنات کے دکھوں میں تحلیل ہو جاتی ہے۔دورِ جدید میں سائنسی و صنعتی ترقی اور نِت نئے ایجادات کی بدولت دنیا سمٹ کر رہ گئی ہے انسانی زندگی میں تیز رفتار تبدیلیوں، نئے خیالات کی پرورش، مغربی تہذیب کی اندھا دھند تقلید نے پرانے تہذیبی تصورات کو رد کر دیا ہے جس کی وجہ سے اعلیٰ قدریں مانند پڑتی جا رہی ہیں۔اِنئ تہذیب نے انسان کو داخلی کرب وانتشار اور بے چینی سے ہمکنار کیا ہے۔ لاقانونیت، لوٹ کھسوٹ، خودغرضی، اقربا پروری، سیاسی عدم استحکام، تشدد، دہشت گردی اور بہت سے خوب ہمارا مقصد بنتے جا رہے ہیں۔دنیا جتنی اب بدصورت ہے پہلے کبھی نہیں تھی آج کے انسان کے باطن ہمہ وقت ناموافق حالات کے زلزلوں کی زد میں ہے جو اُس کے قلب ذہن کو جھنجھوڑ کر صدموں سے دوچار کرتے رہتے ہیں لیکن ظاہری طور پر دوسرا افراد اس درد کو محسوس نہیں کر پاتا اتنا بے حس ہو چکا ہے کہ محسوس کرنا ہی نہیں چاہتا۔ پروین آج کے فرد کی باطنی کیفیتوں کو گہرا ادراک رکھتی ہیں۔سانپ ،جنگل ،بھنور، سمندر کے استعاروں میں سمو کر آج کے انسان کو درپیش آشوب کا ذکر کرتی ہیں تو اُن کی غزلیں ’’آشوبِ آ گہی‘‘ کی موثر پیکر تراشی کا نمونہ بن جاتی ہیں۔

؎ موجوں کے ساتھ سانپ بھی پھنکارنے لگے
جنگل کی دہشتیں بھی سمندر سے مل گئیں

؎　قدم تو ریت پہ ساحل نے بھی نہ رکھنے دیا
بدن کو جکڑے ہوئے صرف اِک بھنور ہی نہ تھا

؎　بس رقص پانیوں کا تھا وحشت کے راگ پر
دریا کو سب دھنیں تو ہواؤں نے لکھ کے دیں

؎　فشارِ جاں کے بہت ہیں اگر نظر آئیں
ہر ایک زلزلہ زیرِ زمین نہیں آتا

؎　بستی میں اتر رہا ہے پانی
ہم اور کہاں اتر کے جائیں

؎　پانی ہے ہوا ہے یا خلا ہے
ہم اپنے قدم کہاں جمائیں

پروینؔ شاکر کا شعری کینوس بہت وسیع ہے۔اس میں ہر طرح کے پھول کھلے ہیں جو اپنی خوشبو کے لحاظ سے الگ اور منفرد ہیں۔ جہاں ایک طرف لطیف جزبوں کی بات کرتی ہیں تو دوسری طرف بڑے بڑے مسائل سے بھی آنکھیں چار کرنے کا حوصلہ رکھتی ہیں ایسے مسائل جن سے انسانی زندگی براہِ راست متاثر ہوتی ہے۔جس طرح کہ ادب کا اہم موضوع 'ہجرت' رہا ہے۔جدید اُردو غزل میں کثرت سے اِس پر اظہار خیال کیا گیا ہے ابتدائے آفرینش سے ہی انسان انفرادی یا اجتماعی طور پر ہجرت کرتے رہے ہیں۔بہشت سے نکالنے کے لئے جانے کے بعد تک انسان انفرادی یا اجتماعی طور پر ہجرت میں ہے۔وجہ اِس کی خواہ کچھ بھی ہو ہجرت بہت ہی کرب ناک عمل ہوتا ہے۔اپنوں سے بچھڑنے کا غم ،اپنی زمین کے پرایا ہونے کا غم ،انسان کو اندر ہی اندر کر رہتا ہے اپنی مٹی اور اس مٹی سے وابستہ یادوں کو چھوڑ کر پرائی جگہ نیا تعلق استوار کرنا، ماضی کی یادوں کو

پلکوں کے دریچوں میں سنبھال رکھنا، اپنے دیس کی صبحوں اور شاموں کو یاد کرتے رہنا، تصور ہی میں اپنی مٹی کی بو باس محسوس کرتے رہنا اس طرح ایک کسک کا احساس جاگتا رہتا ہے۔ اپنی مٹی سے محبت انسان کی جڑوں میں رچی بسی ہوئی ہوتی ہے وہ کہیں بھی جائے اپنی مٹی کی یاد اُسے بے چین رکھتی ہے اُردو شعراء نے اس موضوع کو متنوع زادیوں سے دیکھا اور بیان کیا ہے جس طرح کی وزیر آغاز کہا ہے کہ:

ایک عجب تجربہ ہے اپنے پرانے گھر میں
مدتوں بعد کسی شخص کا جا کر رہنا

جبکہ پروینؔ شاکر اس کرب کو ان الفاظ میں بیان کرتی ہیں ۔

ہجرت کا اعتبار کہاں ہو سکے کہ جب
چھوڑی ہوگی جگہ کی نشانی بھی ساتھ ہے

سارے رشتے ہجرتوں میں ساتھ دیتے ہیں تو پھر
شہر سے جاتے ہوئے ہوتا ہے دامن گیر کون　　　پروینؔ شاکر

جبکہ مظہر امام اس موضوع پر یوں حسرت بھرے انداز میں اظہارِ خیال کرتے ہیں

اپنا ہی فیصلہ تھا کہ گھر چھوڑ کر چلے
مڑ مڑ کر پھر کیوں در و دیوار کو دیکھنا

مظہر امام

پروینؔ شاکر کی غزل کے کئی اشعار انسان کے اُس ازلی سفر کی داستان سناتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں جو آج بھی جاری ہے جنگل سے شہروں کی طرف رُخ کرنا پھر شہروں کو چھوڑ کر نئے نئے جہانوں کی دریافت اور دشت نوردی ابنِ آدم کا مقدر ٹھہری ہے یہ الگ بات ہے کہ پہلے سے اب اس نوعیت سے بہت مختلف ہے

پروینؔ شاکر جدید عہد کے منظرنامے میں اس سفر کا مشاہدہ کرتی ہیں۔سفر کا استعارہ بار بار استعمال ہوا ہے جوان کی زندگی کی داخلی کائنات سے ہم آہنگ ہے۔

؎ آسیب کون سا ہے تعاقب میں شہر کے
گھر بن رہے ہیں نقلِ مکانی بھی ساتھ ہے

ایک انسان کے لیے گھر جو گوشیہ عافیت ہوتا ہے انسانی رشتوں کی پاکیزگی ذہنی و جذباتی سکون کی علامت سمجھا جاتا ہے۔شاعرہ کے نزدیک گھر تو بن رہے ہیں لیکن شہر کے تعاقب میں کوئی ایسا آسیب ہے جس کی وجہ سے شہر کے لوگ نقلِ مکانی پر مجبور رہے ہیں تعاقب میں کہہ کر شاعرہ پوری انسانیت سے ہم رشتہ ہو جاتی ہیں۔ شہر کے سب لوگ انہیں نقل مکانی کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں اور یہ بات انسانیت دوست شاعرہ کو داخلی کرب سے ہمکنار کرتی ہے۔جدید دور کا انسان ان دیکھے آسیب سے خوف زدہ ہو کر ایک جگہ سے دوسری جگہ ایک شہر سے دوسرے شہر بھاگ رہا ہے۔اُسے اس دور میں کئی طرح کی آسیبوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے وہ کسی محفوظ پناہ گاہ کی تلاش میں ہے جو اُسے گھر کے حقیقی مفہوم سے آشنا کر دے۔مگر امن وسکون کی تلاش میں اُس کی یہ دشت نوردی آج کے دور میں محض خود فریبی اور سراب ثابت ہوتی ہے۔

پروینؔ شاکر چونکہ نسائی حیثیت اور رومانیت پسند شاعرہ کی حیثیت سے ہمیشہ پہنچائی گئیں اور اُن کی شاعری کے مزاحمتی پہلو کی طرف قارئین اور ناقدین کی توجہ نہیں گئی لیکن یہ حقیقت ہے کہ انھوں نے آمریت کے دور میں ظلم کے خلاف سچائی اور حریت فکر کے چراغوں کو روشن رکھنے کی تگ و دو قلم کے ذریعے اپنا موثر کردار نبھایا نہ صرف ان کی نظموں بلکہ پروینؔ کی ساری شاعری میں استحصالی قوتوں کے خلاف بھی شدید ردِعمل کا اظہار پایا جاتا ہے۔وہ جاگیردارانہ نظام کی زیادتیوں۔ انصافیوں کا اظہار بھی کرتی ہیں اور استحصال کے مارے کسانوں

کے لیے بے پناہ ہمدردی رکھتی ہیں۔اُن وزیروں اور زمینداروں کے کردار کو بے نقاب کرتی ہیں جو مزدوروں اور کسانوں کی خون پسینے کی کمائی پر شب چھاپہ مارتے ہیں اور انھیں دانے دانے کا محتاج بنا دیتے ہیں۔

یہی رہا ہے مقدر مرے کسانوں کا
کہ چاند بوئیں اور گہن زمین سے ملے
جب بھی غریب شہر سے کچھ گفتگو ہوئی
لہجے ہوائے شام کے نم ناک ہو گئے

پروین شاکر اپنے عہد کے سخن فروشوں سے بہت دھیمے انداز میں ناراضگی کا اظہار کرتی ہیں جو حاکمِ وقت کے آگے منہ مانگے داموں اپنے ضمیر کا سودا کر کے بک جاتے ہیں حالانکہ چاہیے تو یہ تھا کہ اہلِ علم و ہنر شعور آ گہی کی قندیلوں سے عوام کے خوابوں اور تمناؤں کی ترجمانی کو اپنا شعار بناتے لیکن اُن کی بے ضمیری انھیں اپنی خودداری اور انا کے بدلے اپنی شناخت کھونے پر مجبور کرتی ہے جبکہ ایسے حالات میں حق پرست لوگ اپنے آپ کو بے ہنر ہی ٹھہراتے ہیں۔

اے آنکھ! اب تو خواب کی دنیا سے لوٹ آ
مژگاں تو کھول! شہر کو سیلاب لے گیا

جو قوم بے ضمیر ہو جائے تو وہ احساس زیاں سے بھی عاری ہو جاتی ہے اس کا صفحۂ ہستی سے مٹ جانا یقینی ہے ۔پروین قوم کے شعور کو پیدا کرنا چاہتی ہیں تا کہ وہ اپنے سود و زیاں کا حساب کر سکے۔

غزلوں اور اخباری کالموں میں بھی ایسے نمونے ملتے ہیں کہ انھوں نے ظلم و جبر کے سامنے سرنگوں ہونے سے انکار کر دیا اور مصلحت آمیز خاموشی کو وطن کے تئیں غداری سے تعبیر کیا۔

چراغ بجھتے رہے اور خواب جلتے رہے
عجب طرز کا موسم مرے وطن میں رہا
کیسی بے چہرہ رتیں آئیں وطن میں اب کے
پھول آنگن میں کھلے ہیں، نہ چمن میں اب کے
اس اسیری میں بھی ہر سانس کے ساتھ آتی ہے
صحنِ زندان میں انہیں دشتِ وطن کی خوشبو
لوگ تھرا گئے جس وقت منادی آئی
آج پیغام نیا ظل ِالٰہی دیں گے
طاہر جاں کے گزرنے سے بڑا سانحہ ہے
شوق پرواز کا ٹوٹے ہوئے پر میں رہنا

پروین شاکر مارش لاء کے نتیجے میں وطن کی بے چہرہ رُتوں بجھتے چراغوں اور اہل وطن کے جلتے ہوئے خوابوں کا تذکرہ کرتی ہیں۔ وطن کی رونقوں کے مانند پڑ جانے سے فضا کی سوگواری انھیں دکھ میں مبتلا کر دیتی ہے۔ فیض احمد فیض کی لفظیات کو معنی کوئی جہتوں سے ہمکنار کرتی ہیں۔ اس طرح ''دشت وطن'' اور ''صحن زندان'' جیسی تراکیب استعمال کر کے وطن سے محبت کے احساس کو بخوبی اجاگر کرتی ہیں۔ وطن سے دور ہونے کے بعد شب وروز انسان کو برقرار کر دیتے ہیں۔ وطن سے والہانہ محبت رکھنے والے افراد ''صحن زندان'' میں وطن کی یادوں کے سہارے اپنے جینے کا جواز پیدا کر لیتے ہیں۔ وطن کی یاد ان کے اندر جینے کی امنگ اور حوصلہ پیدا کرتی ہے جس سے انھیں زندان کی صعوبتیں بارِ گراں نہیں ہوتیں۔

پروین کی غزلوں کے کئی اشعار ایک بے پایاں اضطراب و بے چینی کی نشاندہی کرتے ہیں۔ جس کی وجہ

ظلم و جبراور ناہمواریاں ہیں ۔جس کا نشانہ معاشرے کے افراد بنے ہوئے ہیں قاتل کے خونی ہاتھ ایک ایک فرد کو موت کی نیند سلا رہے ہیں لیکن اُس کی پیاس بجھنے کا نام ہی نہیں لے رہی۔

میں بچ بھی جاؤں تو تنہائی مار ڈالے گی
مرے قبیلے کا ہر فرد قتل گاہ میں ہے

بچھڑے والے اتنے ہو گئے ہیں شہر در شہر
کہ باقی اب کسی گھر میں عزاداری نہیں ہے

یہ شعر معنویت کے اعتبار سے پاکستان کے موجودہ منظر نامے کی عکاسی کرتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہاں کی امن و امان کی صورت حال ، دہشت گردی، بموں کی دھماکوں ، ٹارگٹ کلنگ کے تناظر میں کہا گیا ہے۔مجبور و بے کس انسانیت سسک رہی ہے سب چپ سادھے موت کا خونی رقص دیکھ رہے ہیں۔

جدھر دیکھوں کھڑی ہے فصلِ گریہ
مرے شہروں میں آنسو بو گیا کون

ابھی تک بھائیوں میں دشمنی تھی
یہ ماں کے خون کا پیاسا ہو گیا کون

غیروں کی دشمنی نے نہ مارا ہمیں مگر
اپنوں کے التفات کا یہ زہر آب لے گیا

ایک سچے حُب وطن کی حیثیت سے اپنے سرزمین کو لہو سے رنگین ہوتا دیکھ کر پروینؔ کے ضبط کے بندھن ٹوٹ جاتے ہیں۔گروہی،لسانی اور مسلکی بنیادوں پر اپنے اہل وطن کو دست و گریباں دیکھ کر وہ مجسم سوال بن

جاتی ہیں اور اُن کے عناصر کے خلاف اپنے غم و غصے کا اظہار کرتی ہیں جو ملک کو تباہی کے دہانے پر پہنچا رہے ہیں۔ جس کا ثبوت پہلے کراچی شہر تھا جو آگ وہاں لگی ہوئی تھی اب دیگر صوبوں اور شہروں میں پھیل چکی ہے۔ پروینؔ اس کا ادراک بہت پہلی کر چکی تھیں۔ کراچی شہر کی اپنوں کے ہاتھوں تباہی پروینؔ کو خون کے آنسو رلا گئی۔ جائے پیدائش ہونے کے ناطے اس شہر سے اُن کی جذباتی وابستگی تھی اس لیے کئی غزلیں اور نظمیں اس موضوع کئی گئی ہیں۔ نظم کے باب میں اس موضوع پر تفصیل سے اظہار خیال کیا گیا ہے۔ کراچی کے سانحات پر اس دکھ کا اظہار کرتی ہیں۔ جس طرح کہ اقبال نے ''غرناطہ'' پر کیا تھا، کراچی کے ایسے دکھ بھرے منظر کے بارے میں پروینؔ نے کہا تھا:

پیشِ آثارِ قدیمہ رک گئے مرے قدم
شہر کے دیوار و در کچھ جانے پہچانے لگے
اِس شہرِ خوش جمال کو کس کی لگی ہے آہ
کس دل زدہ کا گریہ خوفناک لے گیا
آنکھوں سے آج کون مرے خواب لے گیا
چشمِ صدف سے گوہرِ نایاب لے گیا

پروینؔ شاکر جس عہد میں سانس لے ہی تھیں وہ سماجی، سیاسی اور اقتصادی لحاظ سے عدم استحکام کا دور تھا قدریں اور رشتے شکست و ریخت کا شکار تھے۔ ایسے دور میں پروینؔ جیسی حساس شاعرہ نے وہی لکھا وقت جس کا تقاضا کر رہا تھا۔ پروینؔ کے جذبوں اور محسوسات کی شدت اور حدت حقیقت کی نقاب کشائی میں بھی شامل ہوگئی ہے۔ خود کلامی کے حوالے سے پروینؔ شاکر کی شعری تخلیقات بالخصوص غزلیات کی روشنی میں جو تاثر قاری کے دل و دماغ پر اُبھر کر سامنے آتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ پروینؔ نے اپنی شاعری میں جن مسائل کو پیش کیا ہے وہ اپنے

اندر جو زندگی جی رہی تھی اسی کی آئینہ داری کی ہے۔ خارج کی بنسبت باطن میں تصادم اور کشمکش زیادہ شدید رہا۔ جب احساسات سارے رگ و پے میں دوڑنے لگتے ہیں۔ تمام حواس پر کوئی ایک حساس اس طرح چھا جاتا ہے کہ باہر سے فنکار کے ذہن کا تعلق منقطع ہو جاتا ہے۔ پروینؔ اپنی روح کی تنہائی اور اپنے دکھوں کی فصل سمیٹنے کی کوشش میںؔ اس طرح بکھر گئی کہ بعض اوقات اس کا رشتہ زندگی سے ٹوٹتا ہوا نظر آتا ہے۔ کہ زندگی، فطرت، چاندنی، چاند اور حسین خوابوں کے علاوہ بھی اور کچھ ہے۔ انسان اس طلسمی فضا سے بہت آگے نکل گیا ہے۔

پروینؔ نے رومانیت سے رشتہ مضبوطی کے ساتھ استوار رکھنے کے باوجود زندگی سے اس کا رشتہ ٹوٹنے نہیں دیا۔ وہ خلاؤں میں جینے والی فنکارہ نہیں ہے۔ خود کلامی کا مطالعہ اس بات کو تو ظاہر کرتا ہے کہ زندگی کے اور مسائل سے پروینؔ کی وابستگی ڈیڈیکیشن کی حد تک نہیں تھی۔ اشتراکیت نے اسے کسی حد تک متاثر ضرور کیا تھا لیکن اس کا وہ کچھ زیادہ اثر نہیں لے پائی۔ اس کی سب سے بڑی درسگاہ یا تجربہ گاہ اس کا اپنا گھر اور اردگرد کا ماحول تھا جس نے بری استقامت سے اسے بھگتا۔

پروینؔ کی غزلیہ شاعری میں اس کے دوست کا جو تصور اُبھر کے سامنے آتا ہے۔ وہ ایک ایسا شخص ہے جو انتہائی خوبصورت ہے۔ جس کی جبین روشن اور جس کا انداز ہ سخن سب سے جداگانہ ہے۔ اس کے باوجود شاعرہ اس سے محبت کرتی ہے نہ صرف محبت کرتی ہے بلکہ اس پر اپنی زندگی کی تمام خوشیاں نچھاور کرنے کے لئے تیار ہے۔ لیکن عاشق کے تجربات یہ ثابت کرتے ہیں کہ جتنی شدت سے وہ اپنے محبت کو چاہتی ہے۔

خود کلامی کے پس منظر میں پروینؔ کی غزلیہ شاعری کے اشعار اس بات کا بھی ثبوت فراہم کرتے ہیں کہ مختلف غزلوں میں اس کے یہاں موضوعات کی تکرار بہت ملتی ہے جب وہ اپنے محبوب کو ایک پرائے شخص کے روپ میں دیکھتی ہے تو گویا اجنبیت کا احساس کے عشق و محبت میں ایک نئ کشش پیدا کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے دوست کے لئے وہ لفظ ایک شخص کا استعمال بار بار کرتی ہے۔ اپنے اس دوست سے ملاقات اور پھر

ملاقات کے بعد مختلف تجربات و کیفیات کا سایہ اس کے آئینہ نظر میں نمایاں طور پر اُبھر کر سامنے آتا ہے۔ جیسا کہ ذکر کیا جا چکا ہے کہ اس کی شاعری میں ہوا کی علامت اپنے اس دوست کے لئے استعمال ہوئی ہے جس کے مزاج میں ہوا کی کیفیت یعنی ملتے ہی جدا ہو جانے کا عمل پایا جاتا ہے۔ خود کلامی میں اس علامت کا استعمال اتنا زیادہ تو نہیں ہوا جتنا اس کے شعری مجموعے ’صد برگ‘ میں ہوا ہے ۔لیکن خود کلامی میں بھی کبھی کبھی ایسے اشعار مل جاتے ہیں ۔ جہاں ہوا کی علامت اپنے مستقل معنویت کے ساتھ تخلیقِ شعراء اور اظہارِ فکر کے لئے ترسیل و ابلاغ کا کام کرتی ہے ۔ ذیل میں ہم وہ اشعار درج کرتے ہیں ۔ جن کی روشنی میں محبوب کا کردار تشکیل پاتا ہے۔

بھرم ہے مہر و ماہ نجم کا بھی بس جب تک
مقابل ان کے وہ روشن جبیں نہیں آتا
بات وہ آدھی رات کی رات وہ پورے چاند کی
چاند بھی عین چیت کا، اس پہ ترا جمال بھی [۱]

’’خود کلامی‘‘ کی غزلوں کا کینوس اُداسی اور حزن و ملال کے رنگوں سے عبارت ہے زندگی کے اس موڑ پر وہ فیصلہ لے چکی تھیں کہ انھیں زندگی کا باقی مانند تنہائی کاٹنا ہے ’’خود کلامی‘‘ کی غزلیں تنہائی ، محبت میں ناکامی کے احساسات کی ترجمانی کرتی ہیں ۔ اندر کی دنیا میں گم ہو کر خارجی دنیا اور حقیقتوں کی تلاش بھی نمایاں ہے بالغ النظر حساس عورت کے ذہن کی فکری پختگی اور دانشورانہ سوچ کا اندازہ بھی ہوتا ہے انسانیت کے لیے درد مندانہ جذبات کا اظہار بھی۔

---

[۱] ڈاکٹر روبینہ شبنم، اردو غزل کی ماہِ تمام پروین شاکر (نئی دہلی، ماڈرن پبلشنگ ہاوس، ۲۰۰۴) ۸۵

نظموں کی نسبت غزلوں میں زیادہ تر ذاتی واردات کے تجربے محسوس ہوتے ہیں غزلوں میں دیگر موضوعات کم ہی ہیں کسی محبوب ہستی کا بچھڑنا، رفاقت کی تمنا اس کے بعد ایک ادھورے پن کا احساس، پچھتاوے، شکست آرزو کے نغمے بن کر ابھرتے ہیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کوئی تنہائی میں اپنے بیتے لمحوں کے کرب کا شمار کر رہا ہے ملاحظ کیجئے چند مثالیں۔

میری طلب تھا ایک شخص وہ جو نہیں ملا تو پھر
ہاتھ دُعا سے یوں گرا، بھول گیا سوال بھی
اُس کو نہ پا سکے تھے جب دل کا عجیب حال تھا
اب جو پلٹ کے دیکھئے، بات تھی کچھ محال بھی
جب ستارے ہی نہیں مل پائے
لے کے ہم شمس و قمر کیا کرتے
اتنا سمجھ چکی تھی اُس کے مزاج کو
وہ جارہا تھا اور میں حیران بھی نہ تھی
اُس کی خوشبو کا ہی فیضان ہیں اشعار اپنے
نام جس زخم کا ہم نے گل تر پر رکھا

غزل کے زیادہ تر اشعار سے ظاہر ہوتا ہے کہ صرف اور صرف وہی موضوع ہے جو ان سے بچھڑ چکا ہے۔مگر انداز''خوشبو' والی شاعری سے کافی مختلف ہے خود کلامی کا لہجہ پختہ اور رچا ہوا ہے۔

عشق نے سیکھ ہی لی ہے وقت کی تقسیم کہ اب
وہ مجھے یاد تو آتا ہے مگر کام کے بعد

اُس سے ملنا ہی نہیں دل میں تہہ کرلیں
وہ خود آئے تو بہت سرد رویہ کر لیں

وہ اس گھر کی بنیادوں کے بیٹھ جانے کا دکھ بہت کرتی ہیں مگر ساتھ ہی اپنے آپ کو تسلی بھی دیتی رہتی ہیں کہ اُس گھر کی بنیادیں ایک شکستہ کھنڈر پر قائم تھیں جس کا ٹوٹنا یقینی تھا۔

وقت بہت بڑا مرہم ہے آہستہ آہستہ سب زخم مندمل ہوجاتے ہیں جاں بلب یادیں وقت کی گرد سے دھیرے ڈھک جاتی ہیں، صرف کسک باقی رہ جاتی ہے۔ان کے دل کے زخم بھی جل بجھ چکے ہیں انھیں بس شکوہ ہے تو یہ دل کا ایک پرانا زخم لو دیتا رہتا ہے۔مگر وہ زخموں کا چہرہ دھوکر جشنِ بہار میں شرکت کرنے کا ہنر سیکھ لیتی ہیں لیکن صبر وضبط کے باوجود کبھی کبھی یہ شکوہ ان کی زبان پر آہی جاتا ہے کہ آج تک جو اُن کی شاعری کا عنواں بنا ہوا ہے وہ خود تو اس کی بزم میں اک حرفِ زیرلب بھی نہیں ۔زندگی وحالات سے سمجھوتے کے باوصف کوئی زخم دینے والا مسلسل یاد آتا رہتا ہے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اُس کے خیالوں کی زنجیر اسبابِ سفر کے ساتھ ہی بندھی ہوئی آ گئی ہے انھیں جو بار بار خوابوں کے مدفن پر دوبارہ کھینچ لاتی ہے پیکر تراشی، منظر کشی اور کیفیت سازی کے تخلیقی رموز سے بھرپور اشعار خوابوں کی تعبیریں پانے کی حسرت اور پھر خوابوں کے بکھرنے کے المیے سے جانبر ہونے کی کوشش سے عبارت ہیں۔

ایک ایسا لگتا ہے پیروں سے لپٹ آئی ہے
ایک زنجیر بھی اسباب سفر کے ہمراہ
کوئی زنجیر پھر واپس وہیں پر لے کے آتی ہے
کٹھن ہو راہ تو چھٹتا ہے گھر آہستہ آہستہ

آراستہ تو خیر نہ تھی زندگی کبھی

پر تجھ سے قبل اتنی پریشان بھی نہ تھی

جس جاکمین بننے کے دیکھے تھے میں نے خواب

اُس گھر میں ایک شام کی مہمان بھی نہ تھی

تری زیبائی سلامت رہے اے قامت دوست

زیب پوشاک رہیں گے مرے زخموں کے گلاب

ہماری زندگیوں کا لازمی جُزخواب ہیں اور یہ انسان کی فطرت ہے کہ وہ خواب بہت دیکھتا ہے اپنی آرزوؤں، تمناؤں اور اُمیدوں کے رنگ سے خوابوں کی آبیاری کرتا رہتا ہے۔خواب تعبیروں سے ہمکنار نہ بھی ہوں تو وہ بھی خوب دیکھنے سے باز نہیں آتا۔ بلکہ نئے سرے سے خوابوں کے تانے بانے بنتا چلا جاتا ہے۔اس طرح انسان کے خوابوں کا تسلسل جاری رہتا ہے یہ خواب ہی تو ہیں جو اُس ذات کی تخل کو سرسبز شاداب رکھتے ہیں لیکن جب آنکھیں ہی خوابوں سے محروم ہوجائیں تو زندگی بے کیف و بے رنگ ہونے کے ساتھ تہی دست تہی دامن بھی رہ جاتی ہے۔جدید شاعر نہ صرف خواب دیکھتا ہے بلکہ اِن کا تذکرہ بھی کرتا ہے اوران خوابوں کی ترسیل بھی کرتا ہے، جدید شاعری خوابوں کا سرچشمہ ہے۔

موجیں بہم ہوئیں تو کنارہ نہیں رہا

آنکھوں میں کوئی خواب دوبارہ نہیں رہا

پروین شاکر بھی خوشبو سے لے کر ''کفِ آئینہ'' تک حسین خوابوں کی اسیر رہی ہیں۔زیست کے ٹیڑے میڑھے رستوں پر چلتے ہوئے وہ ایک آدھ لمحہ خواب دیکھنے کے لیے چرا ہی لیتی ہیں لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ رستوں کی تھکن اُتار کر خواب بننا چاہتی ہیں لیکن اُن کی آنکھوں میں کیکٹس اُگ آتے ہیں۔

شام ہونے کو ہے اور آنکھ میں اِک خواب نہیں
کوئی اس گھر میں نہیں روشنی کرنے والا
ہم سفر چھوٹ گئے راہ گزر کے ہمراہ
کوئی منظر نہ چلا دیدۂ تر کے ہمراہ
خواب کیا دیکھے کوئی نیند کے انجام کے بعد
کس کو جینے کی ہوس، حشر کے ہنگام کے بعد
آنکھیں ابھی کھل نہیں سکی تھیں
اور خواب میرے بکھر گئے تھے
جس طرح خواب مرے ہو گئے زیرہ زیرہ
اس طرح سے نہ کبھی ٹوٹ کے بکھرے کوئی

''خود کلامی' کی شاعرہ کو دھیمے لہجے میں گہری بات کہنے کا سلیقہ حاصل ہے ایسا سلیقہ جو آج کی جدید اُردو غزل کا تقاضا ہے وہ واقعات کو واردات میں ڈھالنے اور واردات کو ہمہ گیریت عطا کرنے کے فن سے بخوبی آگاہ ہیں ۔غرض دنیا کے اس ہجومِ بے حس میں ''خود کلامی'' ذہنی تنہائی کے کرب کی علامت بن کر ابھری ہے جس میں محرومی حیات بھی ہے درد و کسک بھی، زمانے والوں کی بے سمتی و بے حسی کے شکوے بھی لیکن خود اعتمادی اُن کی ذات کا ایک ایسا جوہر ہے جو اُن کی شعری کائنات میں جھلکتا دکھائی دیتا ہے وہ اپنے شعور و وجدان اور خود اعتمادی کے بھروسے پر زندگی کی الجھی پر پیچ راہوں کو سلیقے سے سلجھانا جانتی ہیں اور آگے بڑھتے رہنا بھی۔

جو اپنے پیڑ جلتے چھوڑ جائیں ہر بار
انھیں کیا حق ہے کہ روٹھیں باغباں سے

نشتر بدست شہر سے چارہ گری کی لو
اے زخمِ بے کسی تجھے بھر جانا چاہیے
ہر بار ایڑیوں پر گرا ہے مرا لہو
مقتل میں اب طرزِ دِگر جانا چاہیے
طوفان کے جلوہ میں مری بے بضاعتی
بستی کو دیکھتی کبھی دریا کو دیکھتی

ان غزلوں میں نشتر بدست شہر زخمِ بے کس، چشم شناسا، بے بضاعتی، لہو، مقتل، معاشرے کی بے حسی اور احتجاجی لب و لہجے کو نمایاں کرتے ہیں۔''انکار'' اور ''کفِ آئینہ'' کا کینوس اُداسی، تھکن، دکھ، آزردگی کے رنگوں سے آراستہ ہے۔ دیگر مجموعوں کی نسبت جواب مزید گہرے اور منفرد شکل اختیار کر چکے ہیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ شہرت ومقبولیت کی اعلیٰ منزلوں پر پہنچنے کے باوجود کئی حوالوں سے دکھی اور تنہا تھیں جس کا اندازہ ''انکار'' اور کفِ آئینہ'' سے ہوتا ہے کیونکہ انھیں قدرت نے دکھ اور سکھ دونوں فراوانی سے عطا کئے ہوئے تھے۔ ددوسری وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ زندگی کے بارے میں اُن کی idealistic approach تھی ایسے لوگ دنیا میں باوجود کوشش کرے نہ تو خود خوش رہ سکتے ہیں اور نہ ہی دوسروں کو خوش رکھ سکتے ہیں۔ بحر حال دونوں مجموعوں میں اُن کا فن اپنی انتہاؤں پر ہے جس میں پختگی بھی ہے اور خود شناسی بھی ہے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے موت کی آہٹیں اپنے قریب محسوس کر لی تھیں اس لئے وہ شعوری طور پر اپنے آپ کو اس بات کے لیے تیار کر رہی تھیں کہ یہ دنیا ان کے رہنے کے لائق نہیں ہے کہیں اپنے ماحول میں رہنے والے بھڑیوں کا ذکر کرتی ہیں اور کہیں ''درون شہر گلابوں کی باڑ' کے ختم ہونے کا اعلان۔ اسی طرح کتاب کا نام ''ماہِ تمام'' یا آخری کالم ''گوشۂ چشم''، جس کا پہلی ہی جملہ موت سے متعلق ہے۔ یہ سب باتیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ وہ اب یہاں مزید رُکنے

کا ارادہ نہیں رکھتی تھیں۔

خود کلامی اور کفِ آئینہ میں اُداسی بھی تھکی سی محسوس ہوتی ہے۔

دورنِ شہر گلابوں کی باڑ ختم ہوئی
کنار ِشہر پرانی ببول باقی ہے
باب حیرت سے مجھے اذنِ سفر ہونے کو ہے
تہنیت اے دل کہ اب دیوار در ہونے کو ہے
موت کی آہٹ سنائی دے رہی ہے دل میں کیوں
کیا محبت سے بہت خالی یہ گھر ہونے کو ہے		پروین شاکر

ان دنوں مجموعوں میں ترک دنیا اور تنہائی کے جزبات پائے جاتے ہیں موت ایک ایسی حقیقت ہے جس سے دور بھاگنا ممکن نہیں۔ شاعر کے تخیل کی آخری منزل موت ہے۔ ہر زبان میں شعراء و ادباء نے موت کی دست ستم کاریوں کا ذکر کیا ہے۔ جس طرح چکبست نے زندگی کو عناصر کا ظہور ترتیب اور موت کو ان اجزاء کا پریشان ہونا ٹھہرایا ہے کسی نے موت کو واماندگی کا وقفہ بتایا ہے تا کہ تھوڑی دیر دم لے کر آگے بڑھا جائے غالب اور اقبال نے زندگی اور موت کو فلسفیانہ نکتہ نگاہ سے دیکھنے کی کوشش کی ہے اقبال موت کی نیند سوئے ہوؤں سے موت کا راز جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔

آدمی واں بھی حصارِ غم میں ہے محصور کیا
اُس رعایت میں بھی ہے انسان کا دل مجبور کیا
تم بتا دو جو اس گنبدِ گرداں میں ہے
موت اک چبھتا ہوا کانٹا دل انسان میں ہے

پروین کے یہاں موت سے آگاہی کا اندازہ کچھ مختلف طریقے سے ہے 'صد برگ'، انکار اور''کفِ آئینہ'' سے مثالیں ۔

موت وہ ساقی کہ جس کے کبھی تھمتے نہیں ہاتھ
بھرتی جائے سدا جام وہ اک جام کے بعد

تیرے پیمانے میں گردش نہیں باقی ساقی
اور تیری بزم سے کوئی اٹھا چاہتا ہے

اپنے انجام تک آگئی زندگی
یہ کہانی مگر اختلافی رہی

سرائے خانہ دنیا میں شام ہوتی ہے
مسافروں کو نوید سفر نہیں آتی

زندگی اور موت سے متعلق ایک چھوٹے سے شعر کی وسعت کا یہ عالم ہے کہ یہ ایک چھوٹا سا شعر علم ہست و بود کے فلسفے کا احاطہ کئے ہوئے نظر آتا ہے۔

بڑھتی جاتی ہے کشش وعدہ گہ ہستی کی
اور کوئی کھینچ رہا ہے عدم آباد سے بھی

پروین شاکر کے لہجے میں آبشاروں کا زور وشور نہیں بلکہ موجوں کی نغمگی اور جھرنوں کا سا ترنم ہے سمندر کا گہرا سکون ہے جو اپنے اندر کئی طوفان سموئے ہوئے ہے " کفِ آئینہ "اور "انکار" میں تھکے ماندے عزائم ہیں اور یاس گرفتہ خوابوں کا عکس ہے۔اس کے علاوہ عمر رواں کا احساس بھی شدت سے پایا ہے۔

مٹھی میں تو رنگ تھے ہزاروں

بس ہاتھ سے ریت بہہ رہی تھی

وہ محسوس کرتی ہیں کہ جس کے دم سے زندگی کے اُجالے تھے وہ کسی دوسرے دیس کا راہی بن چکا ہے۔ اس لیے اب زندگی اندھیاروں کی نذر ہوگی لیکن شب کی تنہائی میں صرف گفتگو تو اُسی سے وہ جانتی ہیں کہ شکاری کا دل بھر چکا ہے ورنہ تو وہ خوبصورت قید میں زندگی بھر کے لیے اڑنا ہی بھول جائیں لیکن محبوب یا دوست ساتھی کے راستہ بدلنے پر ایسی بے یقینی کی کیفیت جنم لیتی ہے کہ روح تک حیران رہ جاتی ہے اُن کی ذات جسے لوگ ہنستی ہوئی آنکھوں کا نگر و سمجھتے ہیں لیکن اصلیت سے کوئی واقف نہیں کہ پس دیوارِ جاں کیسی کیسی آرزوئیں، تمنائیں نوحہ وگریہ بن کر دم توڑ چکی ہیں ''انکار'' کفِ آئینہ میں بے مہک موسموں اور ویران خوابوں کے نمو کی نوید سنائی دیتی ہے۔

میں ستاروں کی سفارش بھی اگر لے آتی
یہی لکھی تھی مرے خوابوں کی تعبیر سو ہے

تجھ کو بھی نہ مل سکی مکمل
میں اتنے دکھوں میں بٹ گئی تھی

اُس سے خوشبو سے کرایا تھا تعارف میرا
اور پھر مجھ کو بکھیرا بھی ہوا ہی کی طرح

بڑھتی جاتی ہے کشش وعدہ کی ہستی کی
اور کوئی کھینچ رہا ہے عدم آباد سے بھی

'کفِ آئینہ' اور ''انکار'' میں اہل اقتدار پر تنقید کی گئی ہے جو طاقت دولت کے نشے میں عوام کو ظلم و ستم کا نشانہ بناتے ہی اُن کو ایسے الفاظ میں مخاطب کیا گیا ہے۔ جو غرور اور تکبر کی علامت سمجھتے جاتے ہیں وہ جانتی

ہیں کہ ظلم سہنا ایک طرح سے ظالم کی حمایت کرنا ہے اور خاموشی ایک طرح کی ظلم کی پشت پناہی ہے"۔
سو وہ ظلم و جبر کے آگے چپ رہنے کے جرم سے انکار کر جاتی ہیں اور انھیں ہدف تنقید و ملامت بناتی ہیں۔

وہی شداد وہی جنتِ خاشاک نہاد
ویسے یہ عظمت یک لحظ پر مغرور ہوئے
وہ رعنویت ہے کہ لگتا ہے ازل سے ہے یونہی
نشئہ مسندِ شاہانہ سے مخمور ہوئے
چھاؤں بیچ آئے ہیں یوں نفس سے مجبور ہوئے
وہ جو تقسیم ثمر پہ یہاں مامور ہوئے
شعبۂ رزق خدا نے جو رکھا اپنے پاس
نائب اللہ بہت بددل و رنجور ہوئے

پروین کی انفرادیت یہ ہے کہ غزل کا مزاج اور شعریت طنزیہ انداز و القاب استعمال کرتے وقت بھی بر قرار رہتی ہے پروین کا لہجہ خونین واقعات کی تصویر کشی کرتے ہوئے بھی نرم کومل رہتا ہے اور زبان کی دلکشی متاثر نہیں ہوتی۔

سلگ رہا ہے مرا شہر جل رہی ہے ہوا
یہ کیسی آگ ہے جس میں پگھل رہی ہے ہوا
رکھی ہوئی ہے ہر اک گھر کے صحن میں میت
سو وقفے وقفے سے جیسے سسک رہی ہے ہوا
جب گھر میں رکھی ہوئی ہو میت

پھر جشن پیا کیا ہے کس نے

جب یہ مناظر دیکھنے کی تاب ختم ہو جاتی ہے تو اُن کے دل کا درد کبھی کبھی سسکیوں کی شکل اختیار کر لیتا ہے جو ان کی ذہنی کیفیت کی عکاسی کرتا ہے۔

پیراہن غم سیا ہے کس نے
خوابوں کو کفن دیا ہے کس نے

بستیاں آخری دموں پر ہے
اور حرف شفا نہیں ملتا

ظلم کے ہاتھوں اذیت میں ہے جس طرح حیات
ایسا لگتا ہے ک اب حشر ہے کچھ دیر کی بات

خوش گمانی کی کیفیات یا تصور بھی ہے۔ ایک سروکار کا احساس بھی ہے پیکر تراشی کے ایسے نمونے پروین کے ہاں ملتے ہیں جو تمام حواسِ خمسہ کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے پیکر تراشی کے ذریعے جو تجربات بیان کیے ہیں وہ بصری، سمعی اور شامی و لمسی کیفیات کو متحرک کرتے ہیں۔ حسیات تجربے کو وسیع دنیا انب کی ملکیت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں منظر نگاری، مصوری اور حسیاتی محاکات کے بے شمار نمونے ملتے ہیں۔

آنکھوں نے کیسے خواب تراشے ہیں ان دنوں
دل پر عجیب رنگ اترتے ہیں ان دنوں

رکھا اپنے پاس اپنے مہ و مہرائے فلک
ہم خود کسی کی آنکھ کے تارے ہیں ان دنوں

رکی ہوئی ہے ابھی تک بہار آنکھوں میں
شب وصال کا جیسے خمار آنکھوں
مٹا سکے گی اسے گردِ ماہ و سال کہاں
کھنچی ہوئی ہے جو تصویرِ یار آنکھوں میں
خود پھول نے بھی ہونٹ کیئے اپنے نیم وا
چوری تمام، رنگ کی تتلی کے سر نہ جائے

ہم پروینؔ شاکر کے پچھلے تین شعری مجموعوں میں یہ دیکھ چکے ہیں کہ وہ محبت ،رنگ ونور اور خوشبو کی شاعرہ ہے۔ انکار کے حوالے سے اس کے غزلیہ اشعار میں تعلقات کا ایک ایسا برزخ ہے جہاں انسان ایک ایسی درمیانی حالت میں ہے جہاں محبت اور ترکِ محبت کی ایک مسلسل کشمکش ہے لیکن باہمی قرب و اجتناب کے ساتھ کی غزل گوئی اور دوستی کے جگنو بھی کہیں کہیں چمکتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ پروینؔ کی شاعری میں عشق ایک عورت کی جانب سے مرد کے لئے ہے۔ عام شاعرات کے مقابلے میں پروینؔ کی یہ انفرادیت ہے کہ یہاں اس کا محبوب اس کا شریکِ حیات بھی ہے کہ جس کے باعث محبت ہی نہیں رہتی بلکہ زندگی کی ضرورت بن جاتی ہے۔ پروینؔ نے اپنے محبوب کے حسن و جمال کو نمایاں کرنے کے لئے اپنے غزلیہ اشعار میں جن لفظیات کا استعمال کیا ہے۔ ان میں روشنی کی جمالیات نمایاں ہیں۔ زینتِ ماہ، مہر و ماہِ حسن، روشنی، حسن جہاں گیر، شعلہ رو جیسی لفظیات میں حسنِ لفظیات اور حرارت کی کیفیت لبریز ہے۔

پروینؔ کا کلام پڑھنے کے بعد ایسا لگتا ہے جیسے کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی وقت کوئی نہ کوئی شئے بہر حال کھوگئی ہے۔ جس کی کھٹک اُس کے دل میں برابر ہوتی رہتی ہے اور جب وہ شئے ایسی ہو جس کی عدم موجودگی سے انسانوں کے درمیان دیانت داری ختم ہو جائے تو پھر سانس بھی جیسے سینے میں رکنے لگتی ہے۔

پروینؔ خواتین شاعرات میں اپنے منفرد لب و لہجے اور عورتوں کے نفسیاتی مسائل کو پیش کرنے کے باعث اُردو شاعری کو ایک نئی جہت دیتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اُس کے اسلوب کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ بے باک لہجہ استعمال کرتی ہے۔ اور انتہائی جرات کے ساتھ جبر و تشدد کے خلاف احتجاج کرتی ہے۔ وہ اُن عورتوں میں سے نہیں جو اپنے حقوق پر شرم و حیا کے دبیز اور تہہ دار ڈال دیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پروینؔ کے موضوعاتِ شعری کچھ مخصوص ہیں لیکن قاری کے لئے اس کی شاعری میں اس کی ہیئت نغمگی، موزونیت، الفاظ کی ترکیب ان کا خوشگوار استعمال، پیکر تراشی، اندازِ بیان، جزبات کو ابھارنے کی طاقت اور مجموعی بناوٹ بھی توجہ کی چیز ہے

اس میں کوئی شک نہیں کہ پروینؔ شاکر اپنے عہد کے پورے شعری منظر نامے میں اپنے قد و قامت کے اعتبار سے اپنی ہمعصر شاعرات میں نمایاں اہمیت کے حامل ہیں ان کی شاعری ایک نئے ذائقے اور نئے طرزِ احساس کی شاعری ہے۔ اُن کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے ابتداء سے ہی اپنا ایک منفرد اسلوب اختیار کرلیا تھا جو اُن کی پہچان بن گیا۔ انھیں یہی جدید اور منفرد لہجہ سب سے الگ کرتا ہے۔

انھیں اعلیٰ شاعری کا ملکہ حاصل تھا۔ جزبے کی سچائی اور حرارت خیالات کی تازگی زبان و بیان پر دسترس اور موضوعات کے تنوع سے اردو غزل کو نئی سمت اور نئی جہت عطا کی۔ اُن کی شعری کائنات حسن و جمال سوز و گداز اور تہذیب و شائستگی سے مزیں ہے۔ اردو کے شعری سرمائے میں ان کی غزل ایک گراں قدر اضافہ ہے جیسے اردو شاعری کی تاریخ میں مدتوں یاد کیا جائے گا۔

☆☆☆☆☆☆☆

باب چہارم

پروینؔ شاکر کی شاعری کی انفرادی خصوصیات

یہ باب پروین شاکر کی انفرادی خصوصیات کے جائزے سے متعلق ہے یہ جائزہ نظم نگاری اور غزل گوئی کی تاریخ کے حوالے سے ہے۔ پچھلے دو ابواب میں نظم نگاری اور غزل گوئی کی تاریخ کا تفصیلاً ذکر کیا گیا ہے۔ پھر موضوع کے تسلسل کے اعتبار سے مختصراً خواتین کے شعر و ادب میں حصہ داری کا ذکر ماضی کی تاریخی کے حوالے سے ضروری ہے ۔

اردو شعر و ادب کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اس میں خصوصاً خواتین کی موجودگی نہ ہونے کے برابر ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ ابتدائی دور سے لے کر کلاسیکی دور تک کوئی ایسا نام نہیں آتا جس کی شناخت قابلِ ذکر قرار دی جا سکے۔ اس کی یہی وجہ سمجھ میں آتی ہے کہ پہلے کی عورت بہت زیادہ پابندیوں میں جکڑی ہوئی تھی ۔آج کی نسبت پہلے کی خواتین کو اس قدر آزادی اور سہولیات بھی میسر نہیں تھیں کہ اس دور کی خواتین شعر و ادب اور علم و آگہی سے بے بہرہ تھیں بلکہ بہت سے پڑھے لکھے گھرانوں کی معزز خواتین شعر گوئی کا ذوق بھی رکھتی تھیں مگر اپنے نام کی تشہیر پسند نہیں کرتی تھیں کیونکہ تب عورت کا شعر و شاعری پر مائل ہونا بے حیائی اور عیب سمجھا جاتا تھا خاندان اور معاشرتی دباؤ کی وجہ سے اہل ذوق خواتین پردوں کے پیچھے گھٹن کی زندگی گزارنے پر مجبور تھیں۔ عورتوں کی طرف سے کتابوں اور رسالوں میں کچھ چھپنا تو دور کی بات تھی ،ان میں اتنی جرائت نہیں تھی کہ وہ اپنے احساسات کو لفظوں کی زبان میں بیان کرتیں کیونکہ شعر و شاعری کا تعلق عام طور پر طوائف اور بازاری عورتوں سے ہوتا تھا لہٰذا معزز گھرانوں کی خواتین میں شعری ذوق کا پایا جانا معیوب سمجھا جاتا تھا۔لیکن انیسویں صدی سے کچھ خواتین کے ہاتھ سے لکھے ہوئے عمدہ شعر منظر عام پر آئے ہیں لیکن افسوس کہ انھیں معاشرے کے مخصوص ذہنی رویئے کی بناء پر یا تو نظر انداز کیا گیا یا اُن کی کاوشیں دیگر ناموں سے منسوب کر دی گئیں جس طرح کہ بہارستان ناز میں حمدی بیگم نامی شاعرہ کا تذکرہ ملتا ہے۔اُن کے شوہر نے اُن کا دیوان جلا کر ختم کر ڈالا اور اُن کے لیے یہی صدمہ جان لیوا ثابت ہوا۔اس طرح انھیں شہرت

سے قبل ہی گمنامی کے اندھیروں میں دھکیل دیا گیا۔

خواتین کے شعری کارناموں کا ذکر کئی تذکروں میں موجود ہے سب سے پہلا تذکرہ مولوی عبدالکریم نے تذکرہ النساء کے نام سے لکھا ہے جسمیں خواتین کے شعری کارناموں کا ذکر ہے۔اس کے علاوہ بہارستان ناز مولف فصیح الدین رنج میرٹھی ۱۸۶۴، چمن انداز درگاہ پرشاد نادر ۱۸۷۸ء وغیرہ تذکروں میں خواتین شاعرات کا ذکر ہے۔ان خواتین میں سب سے پہلی شاعرہ اورنگ زیب عالمگیر کی سب سے بڑی صاحبزادی زیب النساء مخفی تھیں جو بہت اہلِ علم و فضل خاتون مانی جاتی تھیں اگر چہ ان کا دیوان اب دستیاب نہیں ہے۔ خواتین کی شاعری کے حوالے سے دوسرا نام تقی میرؔ کی صاحب زادی بیگم کا ہے۔جنھیں شعری ملکہ فطری طور پر وراثت میں ملا ہوا تھا۔ ان کی شاعری میں اس قدر بے حجابی دیکھ کر یقین نہیں آتا کہ یہ اس زمانے کے شریف گھرانے سے تعلق رکھنے والی خاتون کے شعر ہیں۔نمونے کے طور پر ان کے دو اشعار:

کچھ بے ادبی اور شبِ وصل نہیں کی
ہاں یار کے رخسار پہ رخسار تو رکھا
اتنا بھی غنیمت ہے تیری طرف سے ظالم
کھڑکی نہ رکھی روزنِ دیوار تو رکھا

ولی شاہ عالمؔ کی اہلیہ اور مرزا باہر کی صاحب زادی جینا بیگم بھی شعر و شاعری سے گہرا شغف رکھتی تھیں ان کے اشعار ایک منجھے ہوئے عاشقانہ شعور کی نمائندگی کرتے ہیں ۔

آیا نہ کبھی خواب میں بھی وصل میسر
کیا جانئے کس ساعت پر آنکھ لگ گئی

ان کے علاوہ کاملہ بیگم بھی شاعری کرتی تھیں۔ان کا صوفیانہ انداز قابل تعریف ہے۔

کہا منصور نے سولی پر چڑھ کر عشق بازوں سے

یہ اُس کے بام کا زینہ ہے آئے جس کا جی چاہے

ایک عیسائی شاعرہ جن کا نام جمیعت وہ بھی مشہور گزری ہیں۔اختر نامی ایک شاعرہ جو تیمور خاندان سے تعلق رکھتی تھیں اُن کی شاعری مذہبی رجحان کی نمائندگی کرتی ہے ۔

دردعصیاں کے سبب سے تو مری جان چلی

اور بچے کی نہیں سوجھتی تدبیر کوئی

ماضی کے ایوانِ ادب کی محرابوں میں کئی اور شمعیں جھلملا رہی ہیں جن میں منی بائی حجاب ،نواب شاہ جہاں ،بیگم شیرین ریاست بھوپال وغیرہ ہیں ان میں سے زیادہ تر کا تعلق بیگمات ،شہزادیوں یا حرم کی کنیزوں سے ہوتا تھا۔قدیم زمانے میں کچھ ہی خوش قسمت خواتین ایسی تھیں ۔کہ جن کو اپنے خاندان سے اپنے ذوق کی بناء پر پزیرائی حاصل ہوتی رہی ورنہ تو زیادہ چھپ چھپا کر فرضی ناموں سے یا مردوں کے ناموں سے لکھتی رہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان خواتین کے ہاں کھل کر اپنے جزبات واحساسات کی عکاسی کا رجحان بہت کم ہے۔ان کی شاعری میں ایک تشنگی اور حجاب آمیز کیفیت پائی جاتی ہے لیکن اس کے باوجود ان شاعرات کے تذکروں سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ماضی میں شعروادب سے دلچسپی اور تعلق صرف مردوں کا ہی میدان نہیں رہا بلکہ خواتین کے باوجود بہت سی بندشوں کے اس میں نمایاں کردار ادا کیا ہے اور اپنی تخلیقی صلاحیتوں سے گیسوے ادب کو سنوارا،سدھارا اور اردو شاعری کی تاریخ میں اپنی حیثیت منوانے کی دوڑ میں حصہ لیا۔

۱۸۵۷ء سے ہندوستان میں جدید دور کے آغاز کے ساتھ ہی عورت کو سماج کے ایک فرد کی حیثیت سے تسلیم کرنے کا احساس پیدا ہونے لگا اور اس حوالے سے ادب میں عورت کی زندگی سے وابستہ مسائل

کوموضوع بحث بنا کر منظرِ عام پر لایا گیا۔اس طرح عورت میں اپنی ذات کے حوالے سے فکر وشعور کو بیدار کرنے کی کوششیں کی گئیں ۔سر سید احمد خان نے سماج میں عورتوں کی تعلیم و تربیت کی ضرورت کے احساس کو اُجاگر کیا۔مولانا الطاف حسین حالیؔ نے سماج میں عورت سے متعلق صنفی امتیازات روا رکھنے کے خلاف آواز اٹھائی اور سماج کی کئی ایسی بُری رسومات کی نشاندہی کی جن کی وجہ سے عورت بہت زیادہ متاثر ہو رہی تھی ۔حالیؔ نے عورت کی تعلیم و تربیت، ذات پات اور کم عمر لڑکیوں کی شادی اور بیوہ عورت کے مسائل پر اظہارِ خیال کیا۔ترقی پسند تحریک کی بدولت سماج میں عورت کے روائتی تصور کے برخلاف چند مثبت تبدیلیاں رونما ہوئیں جن میں عورت کے مسائل کے ساتھ معاشرے کے ایک فرد کی حیثیت سے زندگی کے ہر شعبے میں اُس کے برابر کی حصہ داری بھی تھی۔

آزادی سے پہلے کی اردو شاعرات کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے۔کہ اگر چہ اُس دور میں کئی خواتین کے ہاں اپنے عہد ہونے والی تبدیلیوں اور سماجی حالات کا گہرا اثر پایا جاتا ہے لیکن اکثر نے اپنے عہد کی مروجہ رجحانات کی پیروی کر کے تقلیدی انداز اختیار کیا۔ بہت کم خواتین ایسی ہیں کہ جن کے ہاں اپنا کوئی الگ رنگ ہو یا انھوں نے اپنی کوئی الگ شناخت قائم کی ہو۔اکثر کے ہاں اس دور کے مشہور شعراء کے رنگِ کلام سے استفادہ کرنے کا رجحان عام ہے۔

ماضی کی شعری روایت کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے۔کہ پہلے غزل صرف مردانہ طرزِ احساس کی نمائندگی کے طور پر جانی جاتی تھی جس میں عورت صرف معشوقہ تھی اور اس میں صرف اس کے حسن و جمال کا اظہار کیا جاتا تھا اور عورت کی تعریف میں زمین آسمان کے ملائے جاتے تھے لیکن جدید شعری رجحان عورت کے اس روایتی روپ کی یکسر نفی کرتا ہے۔یہ حیرت کی بات ہے کہ آزادی سے پہلے کی جدوجہد میں خواتین نے بھی کافی اہم رول ادا کیا تھا بلکہ اس دور کی تحریکوں میں بھی سرگرم رہتی تھیں مگر ملک کی تقسیم اور

فسادات کے موضوع پر ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۵ء تک خواتین کی کوئی شعری تخلیق سامنے نہیں آئی بلکہ اس موضوع پر خواتین کے یہاں جمود چھایا رہا۔ آزادی کے بعد زندگی کئی طرح کی انقلاب آمیز تبدیلیوں سے دو چار ہوئی تو زندگی کی ترجیحات بھی بہت حد تک بدل گئیں جس نے انسان کی فکر و خیال کے دھاروں کو بھی بدل ڈالا اور اس کا اظہار ادب میں ہونے لگا۔ اردو شعر و ادب کی ترقی میں مرد و شعراء کے ساتھ ساتھ خواتین شاعرات کے یہاں جو تقلیدی رنگ نمایاں تھا وہ آہستہ ہستہ مدہم ہو کر نسائی وجود کی شناخت کا وسیلہ بننا شروع ہو گیا۔ وقت و حالات کے تقاضوں نے ان کی سوچ اور فکر کے دھارے کو عورت کی زندگی اور اس سے وابستہ مسائل کے اظہار کی طرف موڑ دیا۔ عورت میں نہ صرف اپنے وجود کی اہمیت کا احساس شدید ہونے لگا بلکہ اس نے اپنے حقوق کے لیے جدوجہد کرنا بھی شروع کی۔ مرد اساس معاشرے میں عورت کی یہ کوششیں اور اس شاعری کی تاریخ میں ایک نئے اضافے کا باعث بن گئیں۔ اس طرح باغیانہ رویے کا اظہار رواج پانے لگا۔ جدید شاعرات کا لب و لہجہ بغاوت کی بنیادوں پر استوار ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ عورت فکر و شعور کی دولت سے بہرہ ور ہے۔ وہ زندگی کے بارے میں اپنا ایک مخصوص نظریہ رکھتی ہے اپنے گرد و پیش کو اپنے نظریے اور اپنے مشاہدے سے دیکھنا اور پرکھنا چاہتی ہے اپنی زندگی کے فیصلے خود کرنا چاہتی ہے۔ وہ مرد کی طرح خوداری کے جوہر سے آراستہ اور اپنی شناخت چاہتی ہے۔ یہ رویہ باغیانہ طرزِ احساس کی نمائندگی کرتا ہوا نظر آتا ہے چند مثالیں:

میں نظر آؤں ہر ایک سمت جدھر سے چاہوں
یہ گواہی میں ہر اک آئینہ گر سے چاہوں
در اگر بند ہوں تو یہ دیوار گرا ڈالے گا
دل کا سیلاب کناروں سے نکلنا چاہیے [1]

[1] ڈاکٹر نجمہ رحمانی جدید غزل کی علامتیں (نئی دہلی، ایم آر پبلی کیشنز ۲۰۰۵ء) ۱۷۷

غزل سے جب خواتین نے اپنا رشتہ استوار کیا تو غزل میں ایک نیا انداز اور نیا رنگ پیدا ہو گیا۔ یہ دنیا رنگ نسائی سوچ وفکر اور محسوسات کی صورت میں تھا یہ نسائی رنگ بہت سی شاعرات کے یہاں نمایاں ہے۔ان میں کئی نام گنوائے جا سکتے ہیں لیکن میں ان چند شاعرات کا ذکر کروں گا جو نئے رجحان و باغیانہ طرزِ احساس کی نمائندگی کرتی ہیں۔ان میں ساجدہؔ زیدی،، زاہدؔ زیدی، زہرہؔ نگاہ، اداجعفریؔ ، فہمیدہ ریاض، شفیق فاطمہ شعریٰ، سکینہ ساجد، پنہاں، رابعہ سلطانہ، رفیعہ شبنم عابدی سارہ شگفتہ، کشورؔ ناہید پروینؔ فنا سید، سیدہ حناؔ اور پروینؔ شاکر شامل ہیں ان شاعرات نے عورت کی نفسیات گھر آنگن کی زندگی لطیف جذبوں، خواہشوں دکھوں اور سکھوں کو موضوع بنایا اور ایک ایسی عورت کی نمائندگی کی جو خاندانی بندھنوں میں بندھ کر بھی جذباتی طور پر تنہا ہے۔ وہ رشتوں کے حوالے سے پہچانے جانے کی خواہش بھی رکھتی ہے وہ عاشق بھی ہے اور محبوبہ بھی ہے ایسا بھی نہیں کہ یہ شاعرات بس گھر آنگن اور خوابوں خیالوں کی دنیا بھی بھٹکتی رہیں بلکہ یہ خواتین اعلیٰ تعلیم اور فکر وشعور کی دولت سے بہرہ ورتھیں۔تانیثی شاعری کے حوالے سے انھوں نے مرداجارہ داری والے معاشرے میں اپنی ایک منفرد پہچان قائم کی اور یہ ثابت ⑩ یا کہ عورت کسی بھی لحاظ سے کم نہیں ہے۔اس کے علاوہ ان کی نظر شعر⑩ ب کے جدید رجحانات، عالمی تغیرات اور فلسفیانہ افکار ونظریات پر بھی☆ ۔اس لیے انھوں نے اپنے شعری تجربات میں پورے عہد کی ترجمانی کی۔ حیات و کائنات کے مسائل و موضوعات کو ایک نئی نظر سے⑩ یکھنے کی ضرورت محسوس کی۔

ان شاعرات میں پاکستانی خواتین اپنی☎ سی سوجھ بوجھ اور بے با کی اظہار کے لحاظ سے بہت آگے ہیں اور وہاں نسائی لب و لہجے کو ز⑩ ہ فروغ ملا ہے جن میں پروینؔ شاکر کا نام نسوانی لب و لہجے اور بے باکانہ جرات اظہار کی بدولت سب سے نمایاں ہے انھوں نے⑩ اجعفریؔ ، زہراؔ نگاہ، فہمیدہ ریاضؔ اور کشور ناہیدؔ کے شعری وفکری شعور سے متاثر حرکت اپنی شاعری کی ابتداء کی لیکن جلد ہی اپنے منف⑩ واسلوب وفکر کی بناء پر اپنے پیش روؤں کے جلائے

ہوئے چراغوں کو مزید قوت و تابنا کی عطا کرتی ہوئی ان سے بھی آگے نکل گئیں ۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کے راستے کے کانٹے تو ان کی پیش وشاعرات نے چن لئے تھے اس لیے انھیں خود اس میدان میں کسی مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑا جس کا اعتراف وہ اکثر و بیشتر کرتی رہی ہیں۔

یہاں پروینؔ شاکر کی انفرادی خصوصیات کے تذکرے سے غرض ہے۔ان کی شاعری میں بعض خصوصیات ایسی ہیں۔ جو ان کی پیش روشاعرات میں بھی پائی جاتی ہیں۔جس طرح کہ ان کی شاعری کے موضوعات ہیں وہ نئے نہیں ہیں جیسا کہ خود ان کا کہنا ہے کہ میری شاعری میں جو موضوعات پیش ہوئے ہیں وہ نئے نہیں ہیں بلکہ پہلے بھی کئی شاعرات ایسے موضوعات پر طبع آزمائی کرتی رہی ہیں۔لیکن یہ ہمارے اندر کا کہانی کار ہے جو ہر موضوع کو نئے ڈھنگ اور رنگ و روپ سے پیش کرتا ہے۔ بلا شبہ پروینؔ شاکر نے اپنے طرزِ اظہار کے لیے وہ رجحانات اور میلانات قبول کئے ہیں جو جدید حیثیت اور عہد جدید کی ذہنی بیداریوں کا ساتھ دے سکیں ۔ موضوعات کا اتنا تنوع پیش کش کا ایسا سلیقہ لفظوں کا ایسا عمدہ استعمال صرف پروینؔ شاکر کے لیے ہی مخصوص ہو کر رہ گیا ہے ان کے سوچنے اور محسوس کرنے کا منفرد انداز جدت کاری کے لیے ہوئے ان کا لہجہ ان کی قوت اظہار ایسی خصوصیات ہیں جس نے روایت کے حسن میں اضافہ کیا ہے اور اسے نئے سمتیں عطا کی ہیں وہ اپنی ہمعصر شاعرات کی طرح بھی نظر آتی ہیں، جنھوں نے تانیثی شاعری میں کچھ امتیاز حاصل کیا اور ان سے منفرد بھی روایت سے بھی تعلق بر قرار ہے اور جدت کے افق بھی ان کی دسترس میں ہیں ۔ بقول محسن احسان: :

> ’’وہ روائتی جادو سے بہک کر ابہام کے گرداب میں نہیں الجھتی بلکہ وہ
> قدامت کے گنبد سے نکل کر جدیدیت کے کشادہ صحن میں در آتی ہیں
> تا کہ وہ جدید زندگی کے سجے سجائے ڈرائنگ روم کی بھر پور تصویر کشی کر

سکے وہ اپنی ہم عمر کے موسموں اور زندگی کے نشیب وفراز کی طرح شاعری میں
چڑھائیوں اور ڈھلوانوں سے گزرتی نظر آتی ہے اس کے کلام میں اس کی آواز
اپنی ہمعصر شاعرات سے مشابہ ہونے کے باوجود اس کی اپنی آواز ہے۔''[1]

غزل کی ایک خوبی یہ ہے کہ اس کے اشعار واقعاتی نہیں ہوتے یعنی تخلیقی طور پر غزل میں وضاحتی بیانیہ کا انداز اختیار عیب سمجھا جاتا ہے۔ غزل میں اشاروں، کنایوں میں بات کی جاتی ہے اس لیے وضاحت کی گنجائش نہیں ہوتی۔ کوئی بھی موضوع دو مصرعوں میں ہی تکمیل کے مراحل میں پہنچ جاتا ہے لیکن پروین کے یہاں استعاراتی اسلوب تو ہے لیکن سادہ بیانی اختیار کر کے بھی انھوں نے موضوعاتی اور شعری اعتبار سے ایک کارنامہ سرانجام دیا ہے غزلوں میں عام بول چال کی زبان استعمال کر کے بھی ان کے ہاں فکری اعتبار سے معنویت اور شعریت پائی جاتی ہے۔ سادہ الفاظ کا انتخاب کیا گیا ہے غزل کی غنائیت برقرار ہے یہ مشکل کام ہے ناصر کاظمی اور افتخار عارف کے یہاں یہ انداز پایا جاتا ہے یعنی غزل کا آہنگ سادہ اسلوب کے ساتھ نغمگی کے لیے ہوئے ہے اس طرح پروین کی غزل کی بحریں سادہ رواں اور موسیقیت سے مربوط ہیں غزل کی ایک خوبی یہ ہے کہ اس میں ریزہ خیالی ہو اور وحدت تاثر کا احساس پایا جائے۔ نفسیاتی تنقید کے زیر اثر اکثر نقاد غزلوں میں وحدت تاثر کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ اردو شعراء کے یہاں سوائے چند ایک کو چھوڑ کے ایسی مثالیں بہت کم پائی جاتی ہیں کہ غزل مسلسل ہو تاثیر کے اعتبار سے وحدت پر مبنی ہو لیکن پروین شاکر کے یہاں زیادہ تر ایسی غزلیں پائی جاتی ہیں۔ جن میں فکر وخیال کے اعتبار سے تسلسل پایا جاتا ہے اور ان میں وحدت تاثر جیسی خوبی کو بھی ملحوظ رکھا گیا ہے۔

''خوشبو'' اور کفِ آئینہ'' سے نمونے کی طور پر چند مثالیں جن میں تازگی موزونیت، موسیقیت، غنائیت،

---

[1] ڈاکٹر سلطانہ بخش، خوشبو کی ہمسفر (اسلام آباد، لفظ لوگ پبلی کیشنز ۲۰۰۲)

تسلسل اور وحدتِ تاثر کی صفات پائی جاتی ہیں۔

ہوا کی دھن پر بن کی ڈالی گائے
کوئل کو کے جنگل کی ہریالی گائے
رُت وہ ہے جب کونپل کی خوشبو سُر مانگے
پروا کے ہمراہ عمر یا بالی گائے
رات گئے ہیں بندیا کھوجنے جب بھی نکلوں
کنگن کھنکے اور کانوں کی بالی گائے [۱]

یہ چاند اور یہ ابرِ رواں گزرتا ہے
جمالِ شام تہہِ آسمان گزرتا ہے
بھرا رہے تری خوشبو سے تیرا صحن چمن
بس ایک موسم عنبر فشاں گزرتا رہے
سماعتیں تیرے لہجے سے پھول چنتی رہیں
دلوں کے ساز پہ تو نغمہ خواں گزرتا رہے
خدا کرے تری آنکھیں ہمیشہ ہنستی رہیں [۲]

---

[۱] پروین شاکر، خوشبو، مشمولہ ماہ تمام (اسلام آباد، مراد پبلی کیشنز، ۱۹۹۴ء) ۲۴۶

دِیار وقت سے تو شادماں گزرتا رہے۔[۱]

پروینؔ شاکر کی غزل کا اسلوب اور مخصوص آہنگ انھیں دیگر غزل گو شعراء ممتاز کرتا ہے کہ ان غزلوں میں روانی ترنم شگفتگی اور رعنائی جیسی ایسی خصوصیت پائی جاتی ہیں اور اخلاقی شعور کا نتیجہ ہے لیکن پروینؔ شاکر نعرہ بازی سے پرہیز کرتی ہیں ان کی شاعری جلسے جلوسوں کی شاعری نہیں ہے وہ جانتی ہیں کہ غزل میں تغزل کو بنیادی حیثیت حاصل ہے اور تغزل کا معنی اب یہ نکالا جا رہا ہے کہ زبان و بیان میں لطافت اور شیرنی ہونی چاہئے۔ اس لیے پروینؔ شاکر اپنی غزلوں میں تغزل کے اس تقاضے کو پورا کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں وہ مزاحمتی رویے کا اظہار کرتی ہیں باتیں تو تلخ ہوتی ہیں مگر ان کو بیان کرنے کا اسلوب ولہجہ دھیما اور نرم و کومل ہی رہتا ہے ان کا یہ رویہ فیض احمد فیضؔ سے بہت حد تک مطابقت رکھتا ہے کہ شعر نعرہ بازی نہ بننے پائے اور فیض مزاحمتی وسیاسی رویوں کے بیان میں بھی اظہار کے جمالیاتی پہلوؤں کو مدنظر رکھتے ہیں۔ جبکہ مزاحمتی شاعری میں جمیل جالبی بہت بلند و بانگ لہجہ اور درشت اسلوب اختیار کرتے ہیں جبکہ پروینؔ شاکر کے ہاں اسلوب کی شیرینی اور جمالیاتی شعور ان کے اندازِ سخن میں ہمیشہ نمایاں رہتا ہے فیض احمد فیضؔ کی طرح ان کا احتجاجی انداز سماعتوں پر گراں نہیں گزرتا۔

جدید طرزِ فکر رکھنے کے باوجود پروینؔ شاکر کی غزلوں میں مشرقی تہذیب وثقافت کی ترجمانی کا رجحان ملتا ہے۔ ان کی یہاں شادی بیاہ کے حوالے سے برتی جانے والی رسومات کی عکاسی بھی کی گئی ہے اُن کی غزلوں میں مہندی، چوڑیاں، سرخ زرتار جوڑے، بندیا، موتیے کے گجرے، پائل، دھانی، آنچل، سیج، دھانی بانکیں، کاجل، لالی، گھونٹ شکن کا پرندہ، کنگن، بالی، افشاں جیسے الفاظ اور استعاروں کے برتاؤ سے مشرقیت

---

[۱] پروینؔ شاکر، کفِ آئینہ مشمولہ ماہِ تمام (اسلام آباد، مراد پبلی کیشنز، ۱۹۹۴ء) ۱۱۴

مشرقی تہذیبی کو زندہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ وہ مخصوص رسم و رواج روایات واقدار جو برصغیر ہندوپاک میں صدیوں سی چلی آرہی ہیں پروین شاکر کی شعری فضاؤں میں جھلکتی نظر آتی ہیں۔ مشرقی عورت کا ہار سنگھار نسوانیت اور اور حیا کا بانکپن اس نظم سے ظاہر ہورہے ہے جو بعنواں ''گوری کرت سنگھار'' کے نام سے ہے اس میں جزبات اور لہجہ گیت کی طرز پر ہے۔

بال بال موتی چمکائے
روم روم مہکار
مانگ سیندور کی سندرتا سے
چمکے چندن وار
جوڑے میں جوہی کی بینی
بانہہ میں ہار سنگھار
کان میں جگ مگ بالی پتہ
گلے میں جگنو ہار
صندل ایسی پیشانی پر
بندیا لائی بہار
سبز کٹارا سی آنکھوں میں
کجرے کی دو دھار
گالوں کی سرخی میں جھلکے
ہردے کا اقرار

زبان و بیان پر دسترس کے لحاظ سے بھی وہ اپنے ہم عصروں میں ممتاز ہیں ان کے ہاں سادگی بھی ہے اور بے ساختگی بھی۔ لفظیات کا بہت عمدہ استعمال ان کے ہاں دکھائی دیتا ہے اور یہ بات دعوے سے کہی جا سکتی ہے کہ جوشؔ کے بعد پروین شاکر ایسی شاعرہ ہیں جن کے یہاں لفظوں کا انتہائی خوبصورت ،موزوں اور برجستہ استعمال ملتا ہے۔لفظوں کا چابکدستانہ استعمال ان کے خیالات کو چار چاند لگا دیتا ہے اور ان کے خیالات کی دلکشی میں اضافے کا باعث بنتا ہے۔

لفظیات کے اعتبار سے بھی وہ جدید اور منفرد تھیں اگر چہ اردو شاعری میں استعمال ہونے والے روائتی الفاظ وتراکیب بھی پروینؔ شاکر کی شاعری کا حصہ بنے ہیں۔جنھیں پروینؔ شاکر نے بہت منفرد انداز میں اپنے اچھوتے اور جاندار تخیل سے معنی کی نئی نئی جہتیں عطا کی ہیں۔مثلاً صدائے گریہ شبنم ،زخموں کے گلاب یا تنہائی کو چاند کے نرم ہالے سے تشبیہہ دی ہے جس کی مثال پوری اردو شاعری میں ملنا مشکل ہے حالانکہ تنہائی کے لیے اماوس اور تاریکی جیسی تشبیہیں اور اصطلاحیں مروج ہیں۔جس طرح فصیلِ شوق ،شاخِ گریہ حرفِ تحریص ، موجِ خواب ،کے ساتھ نئی تراکیب مثلاً لہو سے فصل تارے چھاننے کی چشم پوشی کے التفات دستکیں دینے کا فن ،ہجر کی تمہید ،ہوا کا راہوار بننا ، بانجھ ،خوابوں کی چاندنی ، پھولوں کے چاند اور تاروں کے گلاب چمپی شامیں ، مہندی کی باڑھ ،ساعت دید کے عارض ،تتلیوں کی سیماب پائی ،کرن کے شجر ،جگنوؤں کی سبک تابی شاخِ گل پر چاند کی صلیب ،لہو میں چاند رچاتی خوشی ،زخموں کی مہک ، پتھر کی زباں ،شفق عذرا سبز پتیوں کی چھا نجھن ،قوس قزح کی پازیب وغیرہ الفاظ وتراکیب کے ذریعے پیکر اور تمثیلی انداز اختیار کرتی ہیں اور ان سے کلام لینے کا ہنر بخوبی جانتی ہیں۔ان کی شعری فضائیں جدید حیثیت کی پروردہ ہیں اور غزل کے منظر نامے میں اضافے کا باعث بنی ہیں پروینؔ شاکر کی شاعری میں استعمال ہونے والے الفاظ تراکیب میں معنی کے لحاظ سے وسعت توانائی زندگی کی حرارت رنگا رنگی اور حرکت و ارتعاش پایا جاتا ہے ۔انھوں نے فطرت کے رنگوں ، موسموں

ہواؤں اور آبشاروں سے اپنی شاعری کا رشتہ استوار کیا ہے ہے جس کی ⌘ سے ان کی شاعری میں تتلیوں پھولوں اور پرندوں کی چہچہاٹیں شامل ہوگئی ہیں۔

پروینؔ کو زبان و بیان پر جو دسترس حاصل ہے۔اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے۔کہ ایک طرف تو وہ وضاحتی اور بیانیہ انداز اختیار کرتی ہیں۔تو دوسری طرف ایک ہی شعر میں کسی بھی واقعے یا تجربے اور احساس کو بیان کر دینے پر قادر ہیں جس طرح کہ غزل میں شعر کا ایک مصرعہ پوری کہانی کو اس کے تمام نشیب و فراز کے ساتھ واضح کر دیتا ہے اور شعر کا دوسرا مصرعہ پہلے مصرعے کی توضیع اس طرح کرتا ہے کہ ڈرامائیت منظر کی اور جزبات نگاری کے اکثر تقاضے پورے ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں ۔یہ ان کی شاعری کی ایسی خصوصیت ہے جو بڑے بڑے قادرالکلام شعراء میں پائی جاتی ہے۔مثال کے طور پر پروینؔ شاکر کا یہ شعر اس بیان کی عکاسی کرتا ہے۔

کمال ضبط کو خود بھی تو آزماؤں گی
میں اپنے ہاتھ سے اس کی دلہن سجاؤں گی
ریل کی سیٹی میں کیسی ہجر کی تمہید تھی
اس کو رخصت کر کے گھر لوٹے تو اندازہ ہوا [۱]

ریل کی سیٹی میں ہجر کی تمہید سنائی دینا اس شعر میں ایک ایسے معنیاتی نظام کی تشکیل ہوتی ہوئی نظر آتی ہے۔کہ ریل گاڑی کی سیٹی سے اسٹیشن کی بھیڑ بھاڑ لوگ اور جدائی کے مناظر اور پھر گھر لوٹنے کے بعد شعری کردار کو اُداسی و تنہائی سے واسطہ پڑتا ہے اور ویرانی درپیش ہوتا ہے۔

۱۔ پروینؔ شاکر، خوشبو مشمولہ ماہِ تمام (اسلام آباد، مراد پبلی کیشنز، ۱۹۹۴ء) ۲۲۳

نظموں میں بھی ایک ڈرامائی صورت حال کا احساس ہوتا ہے نظم کا آخری مصرعہ حیران کر دینے والی کیفیت پر مشتمل ہوتا ہے۔ بے شمار نظمیں اسی صورت حال کی عکاسی کرتی ہیں جس کی مثالیں ایک چھوٹی سی نظم ''ایک کوہستانی المیہ'' اور I,II Miss You میں دیکھی جا سکتی ہیں۔

I,II Miss You

جانے سے پہلے
اس نے میرے آنچل سے ایک فقرہ باندھ دیا
I ,ll Miss you
سارا سفر
خوشبو میں بسا رہا

ایک کوہستانی المیہ

بادل اتنے پاس
ہاتھ بڑھا کر چھولیں
پانی اتنی دور
ہاتھ کٹا کر بھی
کچھ ہاتھ نہ آئے [۱]

انسانی زندگی اور انسانی نفسیات کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جو پروین شاکر کے قلم سے ان چھوا رہا ہو۔

۱۔ پروین شاکر، صد برگ مشمولہ ماہِ تمام (اسلام آباد، مراد پبلی کیشنز، ۱۹۹۴ء) ۷۳

پروین شاکر انسانی فطرت کا گہرا شعور رکھتی ہیں۔فطرت انسانی کے گمنام گوشوں میں جھانک کر گوہر مقصود ڈھونڈ نکالتی ہیں۔انسانی فطرت کے ان پہلوؤں اور نفسیاتی کیفیات کی عکاسی اتنی باریک بینی نفاست اور خوبصورتی سے کرتی ہیں جو صرف انسانی محسوسات کا حصہ ہوتی ہیں اور اشعار کا موضوع کم ہی بنتی ہیں مثلاً

تیری چاہت کے بھیگے جنگلوں میں
میرا تن مور بن کر ناچتا ہے
جگنوؤں کی شمعیں بھی راستے میں روشن ہیں
سانپ ہی نہیں ہوتے ذات کی گھپاؤں میں
ہاتھ میرے پھول بیٹھے دستکیں دینے کا فن
بند مجھ پر جب سے اس گھر کا دروازہ ہوا

اپنی پندار کے ٹوٹنے کا اعتراف بہت خوبصورت انداز میں پیش کیا گیا ہے۔جس میں بے بسی حرماں نصیبی اور جذبات کی مرقع نگاری کی گئی ہے۔

ایک لڑکی کی اندرونی کشمکش اور نفسیاتی کیفیت کی پیچیدگی کا اظہار اس طرح سے ایک شعر میں بیان کر دیتی ہیں کہ ساری کہانی اپنے آغاز اور انجام سمیت منظر عام پر آ جاتی ہے۔

اس نے خوشبو سے کرایا تھا تعارف میرا
اور پھر مجھ کو بکھیرا بھی ہوا ہی کی طرح

پروین شاکر کبھی تو نفسیاتی گھتیاں سلجھاتے سلجھاتے خود اپنی ذات کی ہی کولمس بن جاتی ہیں اور ذات کے نہاں خانوں سے پردہ اٹھاتے ہوئے دُکھوں کو ہنسی کے پردے میں چھپانے کا ہنر بھی حاصل کر لیتی ہیں۔

تکلیف تو ہوئی مگر اسے ناخن ملال
کھلنے لگی گرہ بھی کوئی اپنی ذات کی

نہ قرض ناخن گل ، نام کو لوں
ہوا ہوں، اپنی گرہیں آپ کھولوں

ہنسی کو اپنی سن کے ایک بار میں بھی چونک اٹھی
یہ مجھ میں دکھ چھپانے کا کمال کیسے آگیا

پروینؔ شاکر کی شاعری کی انفرادیت یہ ہے کہ انھوں نے اردو کی روائتی شاعری میں استعمال ہونے والے موضوعات تشبیہہ و استعارات کو جدت کے پیراہن سے آراستہ کیا ہے۔ جس طرح اردو شاعری میں گُل اور دستِ صبا کے استعارے عام طور پر استعمال ہوتے رہے ہیں ۔لیکن پروینؔ کے یہ استعارے ایک نئی معنوی گہرائی کے ساتھ سامنے آتے ہیں جس میں انسانی نفسیات کی کچھ گرہیں کھلتی ہوئی نظر آتی ہیں:

اک حجاب تہہ اقرار ہے مانع ورنہ
گل کو معلوم ہے کیا دستِ صبا چاہتا ہے

یعنی گل، دستِ صبا کی خواہش سے واقف ہے اور خواہش کی تکمیل بھی کرنا چاہتا ہے مگر اقرار اگر حجاب کے فطری تقاضوں سے مجبور ہے ایک اور شعر میں گل کا استعارہ ملاحظ ہو:

پزیرائی کو میری شہر گل میں
صبا کے ہاتھ میں پتھر رہا ہے

پروینؔ شاکر کے یہاں بہت عمدگی سے ایک لفظ خانہ جنگی شاعری کا حصہ بنا ہے یہ لفظ میں استعمال ہوتا آیا ہے۔ البتہ شاعری میں شیکسپیئر نے سب سے پہلے اسے استعمال کیا ہے اور اب پروینؔ نے بڑی عمدگی کے

ساتھ اپنی اندرونی کشمکش کے اظہار کے لیے غزل میں اسے جگہ دی ہے۔ یہ ممکن ہے کہ شیکسپیئر کو پڑھنے کے بعد ہی پروین نے اس لفظ سے استفادہ کیا۔شیکسپیئر کے ہاں" Civil War " کا لفظ اندرونی کشمکش کے اظہار کے لیے استعمال ہوا ہے۔

اک عمر ہوئی ہے خود سے لڑتے لڑتے
اندر سے تمام تھک رہی ہوں

دل اُسے چاہے جسے عقل نہیں چاہتی
خانہ جنگی ہے عجب ذہن و بدن میں اب کے

مدتوں بعد اُس نے آج مجھ سے کوئی گلہ کیا
منصب دلبری پہ کیا مجھ کو بحال کر دیا

پروین شاکر کا یہ شعر نسائی معصومیت کا اظہار ہے ۔محبوب کا ایک عرصے کے بعد گلہ کرنے کو منصب دلبری پہ بحال ہونے کا اعزاز ٹھہرایا ہے یہ ان کے سوچنے کا منفرد انداز ہے جو ان کے ہمعصروں میں کہیں کہیں موجود تو ہیں مگر اس انداز سے نہیں ہے۔

تجھے مناؤں کہ اپنی ان کی بات سنوں
الجھ رہا ہے مرے فیصلوں کا ریشم پھر

اس شعر میں فیصلوں کے ریشم کا الجھنا ایک نئی خوبصورت امیجری ہے جبکہ پہلے مصرع میں اپنی انا کی کشمکش کا اظہار کیا ہے ۔

خوشبو کی طرح چاند کا استعارہ بھی ان کی شاعری میں بہت زیادہ استعمال ہوا ہے خاص طور پر ان کی پہلی کتاب ''خوشبو'' میں جس طرح ابن انشاء کے ہاں ''چاند نگر'' میں چاند کی علامت شیلے کے تصورِ مہتاب سے

کافی حد تک مطابقت رکھتی ہیں اور پروین شاکر شیلے سے کافی متاثر رہی ہیں اوران کی شاعری ابن انشاء کا بھی کچھ نظر آتا ہے۔خاص طور پر چاند،بطور علامت واستعارہ استعمال ہوا ہے۔ان کی ہمعصر شاعرات کے یہاں یہ استعارہ اتنی زیادہ تکرار کے ساتھ دکھائی نہیں دیتا۔چاند کی علامت کے ذریعے حق پرستوں اور سورج کی علامت کے ذریعے طاغوتی قوتوں کو نمایاں کیا گیا ہے۔

روشنی آنکھ نے لی اورسرِ مژگان خیال
چاند وہ چمکے کہ سورج سے بجھائے نہ گئے

چاند اس کے نگر میں کیا رکا ہے
تارے بھی تمام ادھر ہی ٹھہرے

دمک رہا ہے ایک چاند سا جبیں پہ اب تلک
گریز پا محبتوں کا کوئی پل ٹھر گیا

زمین کے حلقے سے نکلا تو چاند پچھتایا
کشش بچھانے لگا ہے ہراگلا سیارہ

چاند میری کروٹوں کا گواہ
میرے بستر کی ہر شکن کی طرح

آنکھوں کے طویل رتجگوں پر
چاند آیا بھی تو گہن سمیٹے

رات جب پھول کے رخسار پہ دھیرے سے جھکی
چاند نے جھک کر کہا اور ذرا آہستہ

چراغ ماہ لیے تجھ کو ڈھونڈتی گھر گھر
تمام رات میں یا قوت چن رہتی تھی مگر
چاند چہروں کے فروزاں تھے کہ ناموں کے گلاب
شاخِ مژگان پہ مہکتے رہے یادوں کے گلاب

نظموں میں بھی خوبصورتی محبت بلندی اور روشنی کی علامت کے طور پر چاند کا لفظ استعمال نظر آتا ہے۔ نظم 'اسم' میں 'چاند خوبصورتی کے معنوں میں استعمال ہوا ہے پروین شاکر کا منفرد اور البیلا انداز بیان ملاحظ ہو۔

بہت پیار سے
بعد موت کے
جب سے کسی شخص نے چاند کہہ بلایا ہے
تب سے
اندھیروں کی خوگر نگاہوں کی
ہر روشنی اچھی لگنے لگی ہے۔[1]

دوسری نظم میں محبت کی شدت کے اظہار کے لیے چاند کا لفظ استعمال کر کے معنی و مفہوم کو واضح کیا گیا ہے۔

شروع راتوں کا چاند تھا
پھر بھی
سارا باغ روشنی سے بھرا ہوا تھا

---

[1] پروین شاکر، صد برگ مشمولہ ماہِ تمام، (اسلام آباد، مراد پبلیکیشنز، ۱۹۹۴) ۵۳

جیسے ہمارے دل

محبت سے ۱؎

شجرہ کا استعارہ جدید شعراء کے یہاں کافی استعمال ہوا ہے پروین شاکر نے سماجی اور ذاتی دونوں حوالوں سے شجر کے استعارے کا ذکر کیا ہے۔ شجر ان کے ہاں زرخیزی ، سایہ ، آشیانہ ، ٹھکانہ ، آرام اوسکون ااور تحفظ کے حوالے سے ہے جبکہ پتھر کا استعارہ بے ضمیری بے حسی ، تکلیف مزمت کے طور پر برتا گیا ہے۔

واں ڈھیر تھا پتھروں کا تیار
یاں بھول کی ایک پنکھڑی تھی

ہوا کو استعارہ، تشبیہہ اور محاورہ میں استعمال کرنے کی کوشش قدیم غزل گوشعراء کے ہاں ملتی ہے جبکہ جدید اردو شاعری میں 'ہوا' کو بطور علامت استعمال کرنے کا رجحان عام پایا جاتا ہے۔ ہوا کی داخلی خواص کو علامتی اظہار کا وسیلہ بنانے کی کوشش بہت سے شعراء کے یہاں عام طور پر پائی جاتی ہے۔ ہوا کی مختلف تجسیمی صورتیں بھی وضع کی گئی ہیں جو زندگی کی مختلف حقیقتوں کو منظر عام لیتی ہیں۔ جدید نظم کے اولین شاعر تصدیق حسین خالد کے ہاں 'ہوا' ایک ایسی غم زدہ عورت کے روپ نظر آتی ہے جس کے بال بکھرے ہوئے ہیں اور جو ادھر سے اُدھر بھٹکتی پھر رہی ہے۔ ن م راشد کی نظم ''تسلسل کے صحرا میں'' ہوا وقت کی علامت بن کر ابھری ہے۔ راشد نے اس نظم میں 'ہوا'' کا نامیابی رشتہ انسانی نفسیات سے جوڑ دیا ہے اور اُسے ایسا لمحہ قرار دیا ہے جو مسلسل بھاگ رہا ہے۔

۱؎ پروین شاکر، انکار مشمولہ ماہِ تمام (اسلام آباد، مراد پبلیکیشنز ۱۹۹۴)۱۸۱

میراجیؔ کی شاعری میں ہوا نہ صرف حرکت کی علامت ہے بلکہ اساطیری حیثیت رکھتی ہے۔ ہوا سکون کو توڑ کر حرکت پیدا کرتی ہے اور ایک صحت مند خوشگوار تبدیلی پیدا کرنے کا باعث ہو سکتی ہے۔

پروینؔ شاکر کی شاعری میں 'ہوا' کہیں کہیں اپنے اصلی معنی و مفہوم کے ساتھ سامنے آئی ہے۔ ایک نظم ہمارے درمیان کوئی ایسا رشتہ نہیں تھا میں کہتی ہیں گویا ہوائے دشت کی مانند تو آزاد تھا یا انکار میں شامل غزل کا ایک شعر:

ہوائے تازہ میں پھر جسم و جان بسانے کا
دریچہ کھولیں کہ ہے وقت اُس کے آنے کا

یا اس طرح سے ہوا مہک اٹھی، رنگ چمن بدلے لگا اور کہیں ہوا کی تجسیمی صورتیں پروینؔ کے یہاں نظر آتی ہیں:

پرندے سہمے ہوئے ہیں درخت خوف زدہ
یہ کس ارادے سے گھر سے نکل رہی ہے ہوا
یہ باغباں ہیں کہ گلچیں، ندیم یا صیاد
کہ ان سے ہاتھ ملاتے جھجھک رہی ہے ہوا
یہ کون باغ میں خنجر بدست پھرتا ہے
یہ کس کے خوف سے چہرہ بدل رہی ہے ہوا
بریدہ جانی پہ بھی شہر سانس لیتا ہے
بہت سے لوگوں کے دل میں کھٹک رہی ہے ہوا [۱]

۱۔ پروینؔ شاکر، کفِ آئینہ مشمولہ ماہِ تمام (اسلام آباد، مراد پبلی کیشنز، ۱۹۹۴ء) ۵۷

سب سے پہلے اس شعر میں جو منظر ابھرتا ہے وہ ایک ایسے شہر کا منظر ہے جو کٹا پھٹا ہے گلا اور سڑا ہوا ہے۔ جس کا مقصد تباہی و بربادی ٹھہری ہے لیکن اس کے باوجود وہ سانس لے رہا ہے۔ اس طرح شہر کو محسوساتی پیکر میں ڈھالا گیا ہے جو زندہ رہنے کی کوشش میں ہے۔ لیکن اس کے بعد طنزیہ اور شکایتی لہجہ در آتا ہے جو شر پسندوں اور استحصالی قوتوں کے لیے ہے کہ جو عناصر 'ہوا' کو ناپسند کر رہے ہیں۔ کیونکہ ہوا ہی بر یدیہ جاں، شہر کے زندہ رہنے اور سانس لینے کا سبب بنی ہوئی ہے اور یہ نام نہاد طاقتیں شہر کے درپہ آزاد ہیں اس لیے 'ہوا' ان کے دل میں کھٹک رہی ہے جبکہ ان دو اشعار میں 'ہوا' خوشخبری پیغام رسانی کا ذریعہ تازگی وزرخیزی کا استعارہ ہے۔

خوشبو بتا رہی ہے کہ وہ رستے میں ہے
موجِ ہوا کے ہاتھ میں اس کا سراغ ہے

ہو چلی تو نئی بارشیں بھی ساتھ آئیں
زمین کے چہرے پہ آیا نکھار کا موسم

ایک اور شعر میں 'ہوا' دستِ قاتل کی صورت میں سامنے آتی ہے جو اپنے خونی ہاتھوں سے لوگوں کے سر کاٹنے کا شوق رکھتی ہے۔

دستِ ہوا نے جیسی درانتی سنبھال لی
اب کے سروں کی فصل سے کھلیان پٹ گئے

پہلے اردو شاعری مردوں کے جزبات و احساسات اور انہی کے دل کی حکائتوں کے بیان تک محدود تھی۔ ہندی شاعری کی روایت کے مطالعے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ وہاں عشقیہ جذبات کا اظہار عورت کی زبان سے ہوتا آیا ہے مگر اس کے خالق زیادہ تر مرد ہی رہے ہیں لہٰذا عشقیہ شاعری صرف مردوں کی چیز بن کر رہ گئی تھی۔ لیکن

انھوں نے اردو شاعری میں نسائی بصیرت کے ساتھ نسوانی جذبات ومحسوسات کو سمو کر اسے ایک انوکھا رنگ وروپ عطا کیا جہاں عورت عاشق ہے اور مرد محبوب اسطرح اردو شاعری نسوانی دھڑکنوں اور بسنتی جذبوں، حنائی لہجوں کی ترجمان بن گئی۔

ہندی گیتوں کی فضا، بانکپن اور ہندی لب و لہجے کی چاشنی کی گھلاوٹ بھی پروین شاکر کی شاعری میں پائی جاتی ہے۔ یہ چیز پہلی مرتبہ اردو شاعری میں ان کے توسط سے آئی ہے جو اُن کی ہمعصر مشاعرات کے یہاں دکھائی نہیں دیتی اس کی واضح مثال 'نظم' جبکہ دوسری شام میں توری گیاں چراؤں اور اے جگ کے رنگریز میں دکھائی دیتی ہے۔ یہ نظم جزبات واحساسات لب و لہجے اور فضا کے اعتبار سے گیت کے قریب ہے جس میں شام اور رادھا کی آپسی چھیڑ چھاڑ سے عشق ومحبت کا اظہار اس تناظر سے کیا گیا ہے۔ پریم جل، شام، رادھا گوپیوں، رچنا، کنھیا، مرلی جیسے الفاظ جہاں ایک طرف ہندی زبان وبیان سے ان کی واقفیت کو ظاہر کرتے ہیں تو دوسری طرف گیتوں کی ایسی فضا مزیں ہوتی ہوئی نظر آتی ہے جس سے شام اور رادھا کا قصہ اپنے تمام مبادیات ومتعلقات کے ساتھ ایک خوشگوار کیفیت کے احساس سے قاری پر واضح ہو جاتا ہے۔

رنگ ڈالی مری آتما تک
کیا منوہر کے من میں سمائی
میں نے سکھیوں کو کب کچھ بتایا
بیری پائل نے ہی جا لگائی
گوپیوں سے بھی کھیلیں کنھیا
اور ہم سے بھی میٹھی لڑائی
کرشن گو پال رستہ ہی بھولے

رادھا پیاری تو سدھ بھول آئی

جبکہ دوسری مثال 'کفِ آئینہ' کی نظم میں ملتی ہے۔جس میں منوہر کے سامنے اپنی جیون تھالی میں جلے ہوئے سپنوں کے تٹ، مانگ کی راکھ اور اپنی سیمپورن پیاس کا ذکر کرتی ہیں اور آخر میں اپنی آتما کو منوہر کے چرنوں پہ دان کرنے کا عزم لئے ہوئے نظر آتی ہیں۔گیت کے لیے روائتی طور پر زبان کے جس لوچ اور نرمی گھلاوٹ کی ضرورت ہوتی ہے۔وہ پروین شاکر کے یہاں پائی جاتی ہے۔عشقیہ آہنگ کی حامل بعض غزلیں اور نظمیں گیت کے لہجے اور لفظیات کے قریب ہوگئی ہیں۔جو ایک خاص کیفیت پیدا کرتی ہیں۔پروین شاکر کی شاعری جدید دور کی آواز ہے جو جدید دور کے تقاضوں سے پوری طرح ہم آہنگ ہے اس میں شوخی بھی ہے اور سنجیدگی بھی،محرومی بھی ہے اور محبت بھی۔ خود سپردگی کا احساس بھی سرکشی کے ساتھ پایا جاتا ہے۔نئی نسل کے ذہنی رویوں کی عکاسی بھی ہوتی ہے اور نسائی جذبوں کا اظہار بھی ہوتا ہے۔انھوں نے غزل کی ہیئت کو توڑا ہے اور عورتوں کے تکلیف جذبوں کے ساتھ ان کے نفسیاتی مسائل کی ترجمانی بھی کی ہے ۔جدید شاعری کی شعوری اور میکانکی مشکل پسندی اور علامت پرستی کے درمیان پروین شاکر کا اچھوتا محسوساتی استعارہ ابھر کر سامنے آتا ہے۔ اگر چہ پروین شاکر کے یہاں بھی کہیں کہیں علامتیں استعمال ہوئی ہیں لیکن ان علامتوں میں ابہام نہیں ہے بلکہ ان علامتوں میں چھپے ہوئے مفاہیم کو سمجھنا بہت آسان ہے۔کیونکہ ابلاغ کی قائل ہیں۔حالانکہ ان کی دیگر ہمعصر شاعرات کے یہاں علامتیں اور استعارے اتنے سادہ اور اتنے واضح نہیں ہیں۔لیکن پروین نے علامتوں اور استعاروں کو ان کا صحیح مقام عطا کیا ہے۔ان کی علامتیں سادہ ہوتے ہوئے بھی پر معنی اور کئی جہتیں لیے ہوئے ہیں۔پروین شاکر نے تھکی ماندی غزل کو جاذبیت کا ایسا حسن عطا کیا ہے کہ اس کے ناز وانداز شیرینی وحلاوت میں کئی گنا اضافہ ہوا ہے اور یہی وجہ ہے کہ پروین شاکر دیگر شاعرات سے کافی آگے بڑھ گئی ہیں۔

پروین شاکر کی ایک خوبی یہ ہے کہ انھوں نے خواتین کے جذبات ومحسوسات کا اظہار کھلے انداز میں کیا ہے اور اپنے آپ کو مردوں کو مدِ مقابل رکھنے کے ساتھ ساتھ عورت اور مرد کے درمیان نبھاہ کے رشتے کو بھی ترجیح دی ہے۔ ان کے ہاں شوہر پرستی کے جذبات کا اظہار ملتا ہے۔ مشرقی خواتین کے لیے شوہر مجازی خدا کی حیثیت رکھتا ہے۔ شوہر کی محبت بھری نظر ہی مشرقی عورت کی زندگی کی بہت بڑی متاع ہوتی ہے جو اُسے جینے کا سلیقہ عطا کرتی ہے دوسری طرف وہ مرد اور عورت کے رشتے میں برابری اور مساوات کی بھی قائل ہیں۔ عشق ومحبت کے معاملات ہوں یا زندگی کے دیگر مراحل میں حقوق وفرائض کی بات ہو اس حوالے سے ان کا رویہ یکساں ہے۔ پروین شاکر کے یہاں خود سپردگی اطاعت وفرمانبرداری کا انداز ملاحظ کریں۔ نظم ''واٹرلو'' سی ایک مثال:

وہ مغرور سی تیکھی لڑکی
عام سے آنکھوں عام سے بالوں والے
اک اکھڑ پھر بردیسی کے آگے
دوزانو بیٹھی
اس کے بوٹ کے تسمے باندھ رہی تھی (خوشبو) ۱

پروین شاکر کی شخصیت اور ان کی شاعری دونوں ہی مختلف اور متضاد خصوصیات کا مجموعہ ہیں ایک طرف تو ان کے یہاں احتجاج، بے باکی اور بغاوت کے عناصر ملتے ہیں۔ تو دوسری جانب خالص، مشرقی اقداری نظام (value system) کے حوالے سے شرم وحیا، وفاداری، سپردگی اور مصالحت کے جزبات بھی ملتے

۱۔ پروین شاکر، خوشبو مشمولہ ماہِ تمام (اسلام آباد، مراد پبلی کیشنز، ۱۹۹۴ء) ۲۵۹

ہیں۔ پروینؔ شاکر کے بارے میں بعض غلط نتائج بھی اخذ کیے جاتے ہیں۔ تانیثیت کا ذکر کرتے ہوئے عموماً یہ کہا جاتا ہے کہ تانیثی شاعری کا مقصد ہی مرد اساس معاشرہ اور مردوں کی مخالفت کرتا ہے۔ کشور ناہید اور فہمیدہ ریاضؔ کے یہاں ایسی مثالیں ملتی ہیں لیکن پروینؔ شاکر کی شاعری اور شخصی زندگی میں مرد اساس سماج اور مردوں کے احترام کا جذبہ بھی پایا جاتا ہے۔

پروینؔ کے مطابق یہاں مرد کے چار روپ موضوع بحث رہے ہیں جو باپ، بیٹا، بھائی اور محبوب کی صورت میں ہیں۔ یہ چاروں روپ بہت کھل کر ان کی شاعری میں سامنے آئے ہیں۔ عورت کی پہچان کے حوالے سے مردوں کے چار روپ ان کے نزدیک بہت قابل احترام اور معتبر ہیں۔ محبت، تحفظ اور قوت کی علامت ہیں۔ جن کے بغیر عورت کی زندگی کچھ ہے۔ وہ محبت کے معاملے میں مکمل اطاعت کا روپ اختیار کر لیتی ہیں۔ پروینؔ کی شاعری میں مرد کا تصور کبھی تو دوست اور رفیق سفر کی صورت میں ہیں۔ کہیں اُسے سایہ دار شجر کہی اُسے مہربان بادل کہتی ہیں اور کہی زینت و مہر ماہ کہہ کر پکارتی ہیں جبکہ سنگدلی اور بے وفائی تو اس کی وہ اصلی خصوصیات ہیں۔ پروینؔ شاکر کے یہاں بھی محبوب کا تصور ستم گر کی حیثیت سے موجود ہے۔

اردو کے روائتی شعراء کے یہاں محبوب کا جو تصور رہے وہ تمام خوبیوں کا مجسمہ ہے وہ حسن میں بے مثال ہے۔ جبکہ پروینؔ کے یہاں محبوب کی خوبصورتی کا جو تصور ہے وہ مردانہ جاہت کا شاہکار ہے وہ گھنے بالوں، چمکتی بھوری آنکھوں اور دلنشین باتوں والا کوئی شہریار ہے۔ کہیں تو وارث شاہ کے دیس کا رہنے والا گھنے یا لمبے بالوں والا شہزادہ ہے جس کا قد اونچا ہے ماتھا رشن ہے کڑیل جواں ہے جس کے ترشے ہوئے لبوں سے مہکتے دلنشین میٹھے بول نکلتے ہیں۔ جو اپنی بہادری و شجاعت کی لحاظ سے لاثانی ہے۔ نظم 'اک صدا پکارے جاتی ہے۔ کا آخری ملاحظہ ہے :

یوں چلتا ہے

جیسے زمین فقط اس کے قدموں کے لیے بنی ہے
کم کم بولنے
اور زیادہ دیکھنے والا

میرے چاروں جانب
اپنے وجود کی ونجلی بجائے جاتا ہے
اس سے ہزاروں کوس کی دوری پر بیٹھی ہوں
اور پھر بھی
اک صدا پکارتے جاتی ہے
میرے نام کو سانجھ سویرے
اِک تان بلائے جاتی ہے
مجھے پل پل تخت ہزارے [۱]

ماضی میں اردو شاعرات کی طویل فہرست میں بہت سی اچھا لکھنے والیاں بھی ہیں جو اپنی شاعری کے حوالے سے ایک معتبر نام رکھتی ہیں لیکن ان میں سے اکثر نے وہی کہا جو ان کا محبوب سننا چاہتا ہے لیکن وہ بات نہیں کہہ سکیں جو خاتون ہونے کی حیثیت سے وہ کہنا چاہتی تھی۔ پروینؔ کے یہاں نسوانی جذبات کی شائستگی کے ساتھ بے محابہ اظہار دکھائی دیتا ہے ان کی آواز پرانی آوازوں سے منفرد بھی اور خالص نسوانی بھی۔ اردو شاعری میں اگر چہ نسوانی لب و لہجے کو ادا جعفریؔ نے متعارف کرایا لیکن اپنے وقت کے تقاضوں اور بندشوں

---

[۱] پروینؔ شاکر، خود کلامی مشمولہ ماہِ تمام (اسلام آباد مراد پبلی کیشنز ۱۹۹۴ء) ۱۵۰

کے سبب ان کا اندازہ کچھ ڈھکا چھپا تھا، کشور ناہیدؔ نے اس مزید جہتیں عطا کیں اور عورت کے جذبات کے بیان میں اس حد تک آگے بڑھ گئیں جو شجرِ ممنوعہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہی نسواں لہجہ فہمیدؔہ ریاض کے یہاں جارحانہ رنگ اختیار کر گیا۔ لیکن نسوانی جذبوں کے بے باکانہ اظہار میں پروینؔ شاکر ایرانی شاعرہ فروغ فرخ زاد کی ہم مکتب دکھائی دیتی ہیں۔ فارسی کی جدید شاعری میں نسوانی جذبات کو زبان دینے کی جسارت فروغ فرخؔ زاد نے کی۔ جس پر انھیں ملامت کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ ان کی شاعری کا روپ وعشق حسن اور زندگی کے رنگوں سے سجا ہوا ہے جس میں سچائی اور خلوص کے ساتھ سوز و گداز آرزوئیں اور خواب ہیں یہ آرزوئیں اور خواب نہ صرف ان کے اپنے خواب ہیں بلکہ یہ تمام نسوانی دنیا کی ترجمانی کرتے ہیں ۔

پروینؔ شاکر کی طرح فروغؔ کی شاعری بھی احساساتی شاعری ہے پہلا مجموعہ اسیر ۱۹۵۵ء میں شائع ہوا جب وہ صرف سترہ سال کی تھیں یہ مجموعہ بھی خوشبو کی طرح کچی عمر کے جذبات واحساسات کی عکاسی کرتا ہے دوسرا دیوار ۱۹۵۶ء میں جبکہ تیسرا عصیان؛ ۱۹۵۸ء میں اور چوتھا 'تولد دیگر' ہے' تولد دیگر' کے وقت ان کی شاعری کا لہجہ بدل جاتا ہے ان کی شاعری میں بھی ارتقائی صورتحال کا احساس ہوتا ہے ان کا فن بھی پختگی کی طرف اپنا سفر جاری رکھے ہوئے تھا۔ یعنی آغاز تو رومانیت سے ہوا بعدازاں دیگر مسائل حیات ان کی شاعری میں دخل ہوئے۔ لیکن موت کے ظالم ہاتھوں نے اُسے روک دیا۔ تولدِ دیگر کی فروغ فارسی ادب کے شائقین کے دلوں پر ہمیشہ نقش رہے گی۔

فروغؔ کی نظمیں ' شب و ہوس'' میں ''ہر جائی '، گناہ، اسیر ، بوسہ اور پروینؔ شاکر کی نظمیں ایکٹیسی (extacy) وصال 'بدن کے موسم بے اختیاری میں' سپردگی ،شہد اور شبنم اور آج کی رات ایک سے لمحوں کی تخلیق اور ایک ہی کیفیات کی حامل ہیں جن کی مثالیں اردو اور فارسی شاعری میں پہلے کہیں نظر نہیں آتی ہیں۔ پروینؔ کے یہاں جزبے اور روح کے ساتھ ساتھ جسم کی بھی اہمیت ہے وہ تمام جذبوں کا سچا

اظہار چاہتی ہیں۔ فروغ نے بھی نسوانی جذبات کو چھپانے کے بدلے لفظوں کی زبان عطا کی وہ اس بات پر رنجیدہ ہیں کہ اگر مرد اپنے جزبات کا اظہار کرے تو اُسے تحسین وتعریف سے نوازا جائے مگر جب عورت اس رویے کا اظہار کرے تو معتوب ٹھہرائی جائے۔ پروین شاکر کے یہاں بھی کچھ اسی قسم کے احساسات کا اظہار ملتا ہے۔ انھوں نے فروغ کے لیے خود کلامی میں ایک نظم بھی لکھی ہے جس میں مرد اجارہ داری والے معاشرے پر طنز کے تیر برسائے ہیں اور عورت کی بے چارگی و مظلومیت واستحصال کو نمایاں کیا گیا ہے۔

مصاحب شاہ سے کہو کہ
فقیہہ اعظم بھی آج تصدیق کر گئے ہیں
کہ فصل پھر بھی گناہ گاروں کی پک گئی ہے
حضور کی جنبش نظر کے
تما جلاد منتظر ہیں
کہ کون سی حد جناب جاری کریں
تو تعمیل بند ہو گی
کہاں پر سر اور کہاں دستار اتارنا احسن العمل ہے
کہاں پہ ہاتھوں کہاں زبانوں کو قطع کیجئے
کہاں پر آسائشوں کی بھوکوں کو مار دیجئے
کہاں پر نو سالہ بچیاں، چہل سالہ مردوں کے ساتھ
سنگین میں پرونے کا حکم ہو گا۔

پروین شاکر کی شاعری کی ایک اور خصوصیت اردو محاورات اور انگریزی الفاظ و محاورات کا استعمال ہے

پروین شاکر نے انگریزی الفاظ کواس طرح اپنی شاعری میں مکمل کیا ہے کہ وہ اُسی کا حصہ معلوم ہوتے ہیں اوران سے شاعری میں بھاری پن کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ اگر چہ اکبرالہ آبادی کے زمانے سے ہی طنزیہ و مزاحیہ شاعری میں انگریزی لفظوں کا استعمال ہوتا رہا ہے لیکن سنجیدہ مضامین کے لیے انگریزی لفظوں کا استعمال کوئی آسان کام نہیں۔ لیکن پروین شاکر نے بہت خوش اسلوبی سے نبھایا ہے اس طرح روز مرہ گفتگو کی طرح شاعری کو دورِ حاظر کے تقاضوں سے آہنگ کرنے لیے انگریزی الفاظ بے تکلفی کے ساتھ استعمال کئے ہیں ۔

ہیں فون پہ کس کے ہاتھ باتیں

اور ذہن کہاں بھٹک رہا ہے

انگریزی الفاظ غزل اور نظم دونوں میں ہی استعمال ہوئے ہیں۔

یاد تو ہوں گی وہ باتیں تجھے اب بھی

شیلف میں رکھی ہوئی بند کتابوں کی طرح

پروین شاکر شاعری کے فنی تقاضوں سے پوری طرح آگاہ ہیں اور انھیں ملحوظ رکھ کر شاعری کے حسن کو دوبالا کرتی ہیں آنکھ میں تل ہونا بے وفائی کی علامت ہے یہ محاورہ ان کے ہاں استعمال ہوا ہے اسی طرح سے رعایت لفظی کے استعمال سے بھی شعر کی دلکشی اور حسن میں اضافہ کرتی ہیں۔

کھلے گے اس نظر پر چشم تر آہستہ آہستہ

کیا جاتا ہے پانی میں سفر آہستہ آہستہ

اسی طرح سے ایک نظم فَبِاَیِ اٰلاءِ رَبِکُمَا تُکَذِبان میں بھی رعایت لفظی کی مثال معنی کے حسن میں اضافہ کرتی ہے۔

دلآزاری بھی اک فن ہے
اور کچھ لوگ تو
سارس زندگی اس کی روٹی کھاتے ہیں
چاہے ان کا بُرج کوئی ہو
عقرب ہی لگتے ہیں [۱]

اس کے علاوہ کچھ اشعار میں سہل ممتنع کا استعمال کے حسن میں اضافہ کرتا ہے۔ سہل ممتنع کے حامل اشعار:

ہم خود بھی جدائی کا سبب تھے
اُس کا ہی قصور سارا کب تھا

کئی ایسے مضامین بھی ہیں جو پہلے اردو شاعری میں نہیں آئے ہیں اور جو لحاظ سے منفرد اور مکمل ہیں سچائی اور حقیقت پر مبنی ہیں۔

مجھے اس کی دسترس میں ہو مگر وہ
مجھے میری رضا سے مانگتا ہے
لے جائیں مجھ کو مالِ غنیمت کے ساتھ عدد
تم نے تو ڈال دی ہے سپر تم کو اس سے کیا

بہت سے اشعار ایسے ہیں جن میں پروین شاکر نے اپنی ذاتی زندگی کے کچھ پہلوؤں کی نقاب کشائی کی ہے اور اس انداز میں کہ جس طرح کوئی اور نہیں کرتا ہے بے شک ان کی حقیقت پسندی ان کا اعتراف

۱۔ پروین شاکر، خود کلامی مشمولہ ماہِ تمام (اسلام آباد، مراد پبلی کیشنز:۱۹۹۴) ۱۰۸

لاجواب ہے اور قابلِ تعریف بھی۔

اپنی رسوائی تیرے نام کا خرچہ دیکھوں
اک ذرا شعر کہوں اور میں کیا کیا دیکھوں

کیسے کہوں کہ اس نے چھوڑ دیا ہے مجھ کو
بات تو سچ ہے مگر بات ہے رسوائی کی

جبکہ ایک نظم میں اس طرح اظہار خیال کیا گیا ہے کہ مجھے بہت مدت کسی نے چاند کہہ کر پکارا ہے۔ میں جانتی ہوں کہ میں عمر کے اس حصے میں ہوں کہ جب بالوں میں چاندی کے تار جھلملانے لگیں لیکن مجھے پیار سے چاند کہہ کر بلانے والے دل چاہتا ہے کہ تھوڑی دیر کے لیے تیری باتوں پر ایمان لے آوں۔ اپنی بڑھتی ہوئی عمر کا احساس یا شوہر سے علیحدگی کے بعد اس بات کا اعتراف کرنا کہ یہ بات اگر چہ سچ بھی ہے مگر پھر بھی رسوائی کا باعث ہے۔

بدلتے ہوئے وقت کے تقاضوں نے ہمارے تمدن بلکہ پورے سماجی ڈھانچے کو تبدیلیوں سے ہمکنار کیا ہے زندگی کے ہر میدان میں جہاں جدت نظر آتی ہے وہاں شاعری کے پرانے رویوں میں کچھ تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں جس طرح پہلے وفا شعری اور اطاعت گزاری کی صفت عورت کے لیے مخصوص تھی۔ اب یہی صفات عورت مرد میں دیکھنا چاہتی ہے اردو شاعریات میں یہ رجحان بہت عام ہے کہ حسن وعشق کے معاملات کے بیان میں اپنی ذات کو اہمیت دی جائے پہلے جو توقعات مرد عورت سے وابستہ کرتا تھا اب عورت وہی کچھ مرد سے چاہتی ہے۔ یہ رجحان نسائی شاعری کے بہت اہم رجحان کی صورت میں سامنے آیا ہے۔ پروین شاکر کی شاعری میں غیر مشروط وفاداری کی کئی شکلیں ملتی ہیں جبکہ اس معاملے میں شاہدہ حسن اور کشور ناہید نے اپنی خودداری اور شناخت کو برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے۔ مثالیں ملاحظ ہوں۔

ے جزبہ عشق کی فراغدلی
تو جھکا تھا جھک گئی میں بھی

شاہدہ حسن

وہ مرے پاؤں چھونے کو جھکا تھا جس لمحے
جو مانگتا اُسے دیتی امیر ایسی تھی پروین شاکر

مجھے ہر کیفیت میں کیوں نہ سمجھے
وہ میرے سب حوالے جانتا ہے پروین شاکر

میں بد ڈالوں وفاؤں کی جنوں سامانی
اس کو چاہوں تو خود اپنی خبر چاہوں

کشور ناہید

وقت کی تیز رفتاری اور جدت کی بناء پر بہت سی چیزیں ہم سے چھن رہی ہیں۔ ہم اپنے ماضی اور اپنی اقدار وروایات سے آہستہ آہستہ کٹتے چلے جا رہے ہیں۔ ہر نئی نسل نئے طور طریقوں اور نئی تہذیب کو کھلے دل سے قبول کرتے ہوئے پرانی اقدار سے دور ہوتی جا رہی ہے۔ پروین کے یہاں اقدار اور رشتوں کے کمزور ہونے کی بناء پر ایک یکساں پر ایک زیاں کا احساس بہت زیادہ ہے۔ وہ رشتوں کے احترام کے ساتھ ان کی مضبوطی اور پاکیزگی پر یقین رکھتی ہیں۔ وہ جدیدیت کے ساتھ روایات کے حسن کو بھی قدر و قیمت کی نظر سے دیکھتی ہیں اور روایات کی پاسداری وتحفظ کی خواہاں ہیں اور بہت منفرد سے انداز میں اس کا ذکر کرتی ہیں۔

؎ وہ بھیڑ ہے کہ چہر میں چلنا محال ہے
انگلی پکڑنا باپ کی بچہ نہ بھول جائے

(کشور ناہید)

؎ تین رتوں تک ماں جس کا رشتہ دیکھے
وہ بچہ چوتھے موسم میں کھو جائے　　(پروینؔ شاکر)

؎ اس نسل کا ذہن کٹ رہا ہے
اگلوں نے کٹائے تھے فقط سر

(پروینؔ شاکر)

پروینؔ شاکر نئی اور پُرانی نسل کا موزانہ کرتی ہیں کہ ہمارے اباء واجداد نے اپنی شناخت اپنے اقدار و روایات کی حفاظت کے لیے سروں کے نذرانے پیش کیے نئی نسل اپنی پہچان کی بقا کے احساس سے عاری ہوتی جارہی ہے دیگر مغربی اقوام کی اندھا دھند تقلید میں اپنا پہچان کھوتی جارہی ہے۔ پروینؔ شاکر کی شاعری میں اس کا احساس بہت زیادہ ہے۔

ہمارے جدید دور کے انسان کا المیہ تنہائی کا احساس ہے باوجود اس کے کہ زندگی پہلے کی نسبت زیادہ تیز رفتار اور ہنگامہ خیز ہے پھر بھی آج کا انسان اپنی سوچوں اور خیالات کو دوسروں سے متصادم پاتا ہے اور کئی دیگر ایسے عوامل ہیں جن کی بناء پر آج کا انسان اپنی ذات میں تنہائی کے گنبد کا اسیر ہو کر رہ گیا ادب اس جدید دور کی پارہ پارہ کر دینے والی حقیقت سے نظریں نہیں چرا سکتا۔ شاعری میں آزادی کے بعد یہ رجحان واضح طور پر سامنے آیا ہے۔ جہاں تک پروینؔ شاکر شاعری کا تعلق ہے۔ ان کے ہاں میں بھی یہ احساس زیادہ نمایاں ہے وہ

اپنے منفرد و افکار و خیالات کی بناء پر اپنے آپ کو آج کے معاشرے کے رویوں اور سوچوں سے ہم آہنگ نہیں پاتی ہیں جس کا اظہار ان کی شاعری میں ہوا ہے جس طرح کہ ایک نظم 'مس فٹ' بھی ہے اس کے علاوہ احساس تنہائی کے پس پردہ کچھ بنیادی عوامل بھی ہیں جن میں سے ایک کہ گوشہ علیحدگی کے بعد انھیں اپنے بیٹے کے ساتھ تنہا زندگی گزارنی پڑی۔ بیرون ممالک پڑھنے اور پڑھانے کی خاطر یا پھر ملازمت کے سلسلے میں اسلام آباد میں تن تنہا رہنا پڑا۔ ان کی شاعری میں غزلوں اور نظموں دونوں میں یہ احساس بہت عمدگی کے ساتھ اجاگر ہوا ہے۔ کبھی تو چاند کو اپنی تنہائی کا گواہ بناتی ہیں۔ انھیں 'چاند' اپنے جیسا مقدر رکھنے والا دکھائی دیتا ہے کہ زمین پر مجھ جیسا تنہا کوئی نہیں مگر آسمان پر چاند تو ہے جو میری طرح سے تنہائی کا عذاب سہہ رہا ہے۔ شاعر اپنی جد و جہد کو چاند کے سفر سے اور اپنی تنہائی کو چاند کی تنہائی کے مماثل قرار دیتی ہیں۔ کیونکہ چاند کی طرح اپنی روشنی سے دنیا کو منور کرنا اور خود سفر میں رہنا ہی شاعرہ کا مقدر ٹھہرا ہے۔

یہ سچ ہے کہ زندگی میں خوشی کے لمحات عارضی ہوتے ہیں ایک دم سے پر لگا کر اڑ اجاتے ہیں۔ جبکہ غم واند وہ کا دورانیہ طویل ہو جاتا ہے جب زندگی پر غم کے بادل چھا جاتے ہیں تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ وقت کی گردش ایک نقطے پر آ کر تھم سی گئی ہو۔ کیونکہ غم کی کیفیات ذہن پر نقش ہو جاتی ہیں جو بھلائے نہیں بھولتیں۔ غم انسانی وجود سے جڑی ہوئی ایک ایسی سچائی ہے جس سے انسان چاہتے ہوئے بھی دامن نہیں چھڑا سکتا۔ انسان کا غم کے ساتھ ازل سے چولی دامن کا ساتھ ہے حیات میں غم مختلف صورتوں میں انسان کا ساتھ بن کر رہا ہے کبھی ''غم عشق'' کی صورت میں اور کبھی ''غم روزگار'' کی شکل میں۔ خاص طور پر اردو ادب شاعری کا یہ ایک دیرینہ موضوع رہا ہے۔ شبلی نے کہا تھا کہ ہمارے سب سے زیادہ مسرت بخش اور طرب ناک نغمے وہی ہوتے ہیں جو اپنے دامن میں حسرت اور کرب کی سوغات لیے ہوتے ہیں۔ ہمیں یہی بات پروین شاکر کی شاعری میں نظر آتی ہیں۔ زندگی کے حسن اور خوش رنگی کو چاہنے کے باوجود ان کے ہاں غم کی محفل بھی آراستہ و پیراستہ دیکھی جا سکتی ہے

ان کے ہاں غم کی فراوانی ہے یہ غم ان کی ذات کا بھی ہے۔ ملک وقوم وانسانیت کا بھی حساس اور درد مند دل ہونے کے ناطے غموں سے رشتہ جوڑنا انھیں بھی نبھاتا ہے۔ ان کی شاعری میں کئی ایسی ''رنج بھری شامیں'' ہیں۔ جب وہ اپنے دکھتے ہوئے دل پر پھول کی مانند کسی کے حرفِ تسلی کی منتظر رہتی ہیں۔ لیکن ایک بے پایاں انتظار بنتا ہے ملاحظ کریں چند اشعار جن میں حجلہ غم کچھ ایسے سجا ہوا ہے یقین ہی نہیں آتا کہ یہ خوشبو والی شاعرہ کے دل کا درد ہے وہ خود اعتراف کرتی ہیں کہ انھیں قوتِ غم ہی سہارا دیے ہوئے ہے ورنہ ان کا بکھر کر سمٹنا مشکل تھا۔

ے ملے گی آنسوؤں سے تن کو ٹھنڈک
بڑی لو ہے ذرا آنچل بھگولوں

ے سب داغ بارشوں کی ہوا میں بجھتے رہے
بس دل کا ایک زخم پرانا عجیب تھا

ے بدلے جاتے ہیں یہاں روز طبیب
اور زخموں کی کہانی ہے وہی

ان کی ذاتی زندگی کا غم ازدواجی زندگی میں ناکامی کا پیش خیمہ ہے جس کی وجہ سے ان کی شاعری میں غم کی فضا اور غم کا احساس جھلکتا دکھائی دیتا ہے جسے انھوں نے ہزاروں رنگ عطا کیے ہیں۔

ے آلودہ سخن بھی نہ ہونے دیا اُسے
ایسا بھی دکھ ملا جو کسی سے نہیں کہا

ے تیری خوش نامی کا آتا ہے بہت دل کو خیال
گریہ کرتے ہوئے آواز اگر کھینچتے ہیں

حجلہ غم یونہی آراستہ ہے
دل کی پوشاک سہانی ہے وہی

کس طرح مری روح ہری کر گیا آخر
وہ زہر جسے جسم میں کھلتے نہیں دیکھا

مرا نوحہ کناں کوئی نہیں ہے
سو اپنے سوگ میں خود بال کھولوں

شہر غم دیکھ تری تاب دم خشک نہ ہو
راس آتا ہے اُسے دیدہ تر میں رہنا

زیست کے کڑے سفر میں جب باوجود کوشش کی وہ حسب توقع منزلِ مراد نہیں پاسکتیں تو تقدیر کے ستاروں اور بروج کی گردش کو الزام دیتی ہیں۔ ناموافق فضاؤں کے باوجود ساحل مراد پر پہنچنے کی آرزو میں ٹوٹی ہوئی کشتی پر بھروسہ کرنے کے بدل اپنے نازک ہاتھوں کو پتوار بنالیتی ہیں۔

میں نے ہاتھوں کو ہی پتوار بنایا ورنہ
ایک ٹوٹی ہوئی کشتی میرے کس کام کی تھی

تقدیر کی ستم ظریفیاں ستاروں اور ہاتھ کی لکیروں کو موردِ الزام ٹھہرانے کا باعث بنتی ہیں۔

یوں حوصلہ دل نے ہارا کب تھا
سرطان مرا ستارہ کب تھا

زنجیر ہے جذیز یا شاخ بے ثمر
اب کون سی لکیر سلامت ہے ہاتھ کی

''کفِ آئینہ کی ایک نظم میں یہی احساسات کارفرما ہیں:

میں کیسے کروں یہ در کشادہ
اس پر تو وہ قفل پڑ چکا ہے
جس کے لیے سارے اسم بیکار
یہ میرے ستارے کی طرح ہے
تاریک اُداس ، غیر آباد [۱]

پروین شاکر کی شاعری کی ایک اور انفرادیت یہ ہے کہ ان کے ہاں ماضی کی روایت سے رشتہ بدستور ہے ان کے ہاں روائتی قصے کہانیوں الف لیلیٰ قدیم کی فضا پائی جاتی ہے۔طلسماتی کہانیوں کے کردار اور طلسماتی فضا ''خوشبو سے کفِ آئینہ'' تک چھائی ملتی ہے۔انھوں نے مغربی ادب کی وسیع مطالعے اور مشاہدے کی بناء پر مغربی لوک کہانیوں کو بھی اپنے تخلیقی تجربوں کا حصہ بنایا ہے۔جس طرح کہ ان کی نظم ''سنڈریلا'' ہے دوسرے باب میں اس کا ذکر کیا گیا ہے''بلوریں جام''، دمکتی سرخ مے'' دلوں کی وائلن پر والز کرتے دو بدن، رتھ، شیشے کی جوتی، شاہی محل وغیرہ مغربی لوک کہانیوں کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ان کی شاعری میں پرسرار بستیاں ہیں جہاں اپنی ہی آواز کی گونج سنائی دیتی ہے۔جنگلوں میں جادو کے زیر اثر سوئے ہوئے محل ہیں۔ان کے کردار بہار کی نرماہٹوں کے پالے ہوئے شہزادے شہزادیوں ہیں، غلام گردشیں ہیں۔ان محلوں تک پہنچنے کے پراسرار راستے ہیں۔ ویران باغ اور حوض ہیں۔ہوا سے باتیں کرتے اسپ تازی ہیں جنکے نسائی راکب ہیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ خود دیو مالائی کہانیوں کے کرداروں کی ایک ایسی شہزادی ہیں جو جنگل میں واقع ایک پراسرار محل میں جادو

۱۔ پروین شاکر، کفِ آئینہ مشمولہ ماہِ تمام (اسلام آباد، مراد پبلی کیشنز ۱۹۹۴ء)۵۱

کے اثر سے سوئی ہوئی ہیں اور منتظر ہے کہ کوئی شہزاد آئے اور اس کے جسم سے ساری سوئیاں نکال کر اس جادوئی فضا سے باہر نکال دے۔مگر اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اس وقت شہزادے کے ہاتھ تھک جاتے ہیں جب صرف ایک سوئی باقی رہ جاتی ہے یا تعویذ والے ہاتھ مگر مچھ کے قبضے میں ہوتے ہیں وہ خود ایسی باہمت ہیں کہ جنگل کو از خود کاٹ لینے کا عزم کیے ہوئے ہیں مگر شہزادے کے منتظر ہیں کہ وہ ان کا نیند کا در آ کر کھولنے کی جرات تو کرے۔

ان کی شاعری میں جنگل کا استعارہ بہت زیادہ استعمال ہوا ہے جو ان کو منزلِ مراد تک رسائی حاصل کرنے میں ایک رکاوٹ کے طور پر حائل ہوتا ہے جنگل انسان کے اندر کا خوف بھی ہے جس نے آج کے دور کے انسان کے اندر بسر کر لیا ہے۔موجودہ دور کا انسان چاہے جنگل سے خوف زدہ ہو کر کتنا ہی کیوں نہ بھاگے جنگل بے خبری میں اس کے اندر اتر آیا ہے۔

خود بھی جنگل کو مجھے کاٹنا آجائے گا
پر وہ شہزادہ مری نیند کا در تو کھولے
نکالی بھی گئیں تھیں سوئیاں کیا
کوئی تصدیق کرتا قصہ خواں سے
بستیوں کی گونج پراسرار سی ہونے لگی
جیسے سناٹا پکارے شہر نا آباد کا
اک آسیب کے مکان میں ہوں
اور ردِ بلا نہیں ملتا۔۔۔
پتھرایا ہے یوں دل کا کوئی اسم پڑھا جائے

اِک شہر نکلتا نہیں جادو کے اثر سے

پروین شاکر کی شاعری میں قدیم داستانوں کی نیم خفتہ شہزادی ہو یا مغربی لوک کہانیوں کی ''سنڈریلا'' دونوں صورتوں میں کہانی کا اختتام اس طرح سے ہوتا ہے کہ اِس شعری کردار کے خواب تشنہ ہی رہتے ہیں۔ ان کی ذاتی زندگی اس کے پس منظر میں کے سبب کچھ نفسیاتی عوامل کارفرما ہیں جس کی وجہ سے انھیں ہر طرف سراب ہی سراب دکھائی دیتے ہیں۔

؎ عمر بھر کے لیے اب تو سوئی کی سوئی ہی معصوم شہزادیاں رہ گئیں
نیند چننے ہوئے ہوتھ تھک گے وہ بھی جب آنکھ کی سوئیاں رہ گئیں

؎ شہرِ گل میں ہواؤں نے چاروں طرف اس قدر ریشمی جال پھیلا دے
تھر تھراتے پروں میں شکستہ اڑانیں سمیٹے ہوئے تتلیاں رہ گئیں

ریخت کا تجربہ وخوابوں کی شکست ان کی بہت سی نظموں کا موضوع بنا ہے یہ کیسا خلا ہے''خواب اور مشورہ''اور ''مجھے جان لینا چاہیے تھا''اس کی عمدہ مثالیں ہیں۔خوابوں کے بکھرنے کا المیہ اور بھی کئی نظموں میں دکھائی دیتا ہے جن میں نظم ''بائیسویں صلیب'' کا استعارہ مشکل یا غم کے اظہار کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔نظم ''مجھے جان لینا چاہیے تھا'' سے ایک بند:

تو وہ جا چکا تھا
اب میں ٹوٹے ہوئے پتوں میں
اپنے آنسو جمع کر رہی ہوں
مجھے جان لینا چاہیے تھا
کہ اس کا اور میرا ساتھ

موسم بہار تک ہے۔

اس نظم کے شعری کردار کا خواب بہار سے شروع ہوتا ہے اور خزان پر پہنچ کر بکھر جاتا ہے۔

پروین شاکر کی شاعری کی ایک خصوصیت مذہب اور مذہنی قدروں سے ان کی گہری وابستگی ہے چونکہ وہ ایک مذہبی خاندان سے تعلق رکھتی تھیں ان کے دادا اور چچا بہت بڑے عالم مانے جاتے تھے۔ بچپن سے ہی انھیں مرثیے کی روایت سے آشنائی ہو چکی تھی ان کی نظموں میں یہی مذہبی رنگ نمایاں ہے ''خوشبو'' کے علاوہ دیگر مجموعوں میں مذہبی موضوعات پر مشتمل نظموں کی تعداد اچھی خاصی ہے

نظموں کے ساتھ ساتھ ان کی غزلوں میں کربلا کا استعارہ بھی بہت استعمال ہوا ہے جو اپنے اندر معنی کی کئی جہتیں لیے ہوئے ہے۔ نمونے کے طور پر چند اشعار:

ے پھر سے خیمے جلے ہیں اور سرِ شام
بین ہے اپنے اپنے وارث کا

ے اسیر کربلا جب یاد آئیں
کہاں لگتی ہی پھر زنجیر بھاری

کچھ نظمیں تو ایسی ہیں جن میں کسی مذہبی عقیدے کو مدِ نظر رکھ کر رومانی خیال اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ ساری نظم رومانی ہونے کے باوجود مذہنی رنگ میں رنگی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ ''لیلتہ الصک'' ایک استعاراتی نظم اس کی عمدہ مثال ہے جبکہ دوسری نظم میں ''مدینتہ العلم'' کی تلمیح استعمال کرکے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم پر پہلی وحی کے نزول کا واقعہ بیان کیا گیا ہے اور اسلام سے پہلے عربوں کی جہالت کا ذکر کیا گیا۔

''کفِ آئینہ'' میں امام حسینؓ کی شان میں خصوصی عقیدت کے اظہار کے لیے 'سلام' کا نذرانہ پیش کیا گیا ہے کئی نظموں کے عنوانات کسی قرآنی آیت سے لیے گیے ہیں جس طرح ''فَبِاَیِّ آلاءِ رَبِّکُما تُکَذِّبانِ باقی نظم نگاری

کے باب میں موضوع بحث بن چکے ہیں نمونے کے طور پر سلام سے چند اشعار:

سلام

گرچہ لکھی ہوئی تھی شہادت امام کی
لیکن مرے حسین نے حجت تمام کی
زینب کی بے ردائی سر میرا ڈھک دیا
آغازِ صبح نو ہوئی وہ شام شام کی
دریا پہ تشنہ لب ہیں پہ صحرا میں شاد کام
دنیا عجب ہے ان کے سفر اور قیام کی [۱]

پروین شاکر کی شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت ان کی جدت طرازی ہے اس میں زبان و بیان، تشبیہہ واستعارات ومحاورات کے علاوہ ان کے محسوس کرنے اور پیش کرنے کا انداز جدت سے ہم آہنگ ہے۔ خود کہتی ہیں۔

تصویر جب نئی ہے نیا کینوس بھی ہے
پھر طشتری میں رنگ پرانے نہ گھولیے

پروین شاکر کی شاعری کی ایک اور نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ تانیثی ادب میں ابھرنے والی احتجاج اور مزاحمت کی آوازوں میں ان کی آواز بالکل منفرد ہے یہاں مختصر طور پر خواتین کے احتجاجی رویوں کا ذکر کیا جاتا ہے تاکہ واضح کیا جاسکے کہ پروین شاکر کی شاعر دیگر شاعرات کی نسبت لب و لہجے کے اعتبار سے کس حد تک

۱۔ پروین شاکر، کفِ آئینہ مشمولہ ماہِ تمام (اسلام آباد، مراد پبلی کیشنز ۱۹۹۴ء)۱۱۶

انفرادیت کی حامل ہے ان میں سب سے پہلے فہمیدہ ریاضؔ ہیں۔ جنھیں فیضؔ کی طرح اپنے باغیانہ اور مزاحمتی لب و لہجے کی بناء پر جلاوطنی کے کرب سے گزرنا پڑا۔ فہمیدہ ریاضؔ بہت تیز و تند لہجے میں عورت کی حق تلفی اور صنفی امتیاز روا رکھنے جانے کے خلاف احتجاج کرتی ہیں۔ کبھی تو اُن کی ناراضگی اس حد تک بڑھ جاتی ہے کہ وہ خدا سے بھی اسی لہجے میں شکوہ کناں ہوتی ہیں۔

وہ اِک زنِ ناپاک ہے
بہتے لہو کی قید میں
گردش میں ماہ وسال کی
دہکی ہوس کی آگ میں
اپنی طلب کی جاہ میں
زائیدہ ابلیس تھی
چل دی اسی کی راہ میں
اس کے بدن کی شرم پر
تقدیس کا سایہ نہیں
لیکن خدائے بحر و بر
فرمان تیرے سب روا
ہاں اسی زنِ ناپاک ہے
لب پر نہیں کوئی دُعا

سر میں کوئی سجدہ نہیں [۱]

جبکہ سلطانہ مہر مرد اساس معاشرے میں عورت کی کم مائیگی کا شدید احساس رکھتی ہیں وہ معاشرے میں عورت کی قابل رحم حالت دیکھ کر بہت آزردہ ہیں معاشرے کی ذی عزت افراد کی نظروں میں عورت کا کیا مقام ہے وہ بخوبی جانتی ہیں۔

جبکہ بلقیس فاطمہ عورت ذات کے دکھ درد کو بہت شدت سے محسوس کرتی ہیں۔ان کا احتجاجی رویہ اور زبان و بیان کے لحاظ سے عورت کے اندرونی کرب کا عکاسی کرتا ہے ایک نظم ان کے بالیدہ فکری شعور کی نمائندگی کرتی ہے: ھُنَ لِباسُ لَکُم وَ اَنتُم لباسُ لَھُنَ سے ایک بند:

اور وہ مجھ کو اتنا ہی دے جتنا وہ ٹھیک سمجھے
میری حد، رات دن وہ بتائے مجھے
اور اپنے لیے کوئی حد ہی نہ رکھے
اسے سمیع بصیر علیم
تیرا فرماں اَنتُم لِبَاسُ لَھُنَ ہے اپنی جگہ
اور میں ہو گی بے ردا
بے لباسی میری کس کے ہاتھوں ہوئی
میرا چہرہ خراشوں سے کیوں بھر گیا [۲]

۱۔ڈاکٹر ارتضیٰ کریم ،اردو ادب میں احتجاج اور مزاحمت کے رویے(دہلی ،اردو اکادمی،۲۰۰۴)۳۴۷

۱۔ڈاکٹر ارتضیٰ کریم ،اردو ادب احتجاج اور مزاحمت کے روئے،(دہلی اردو اکادمی ۲۰۰۴) ۲۴۱

عزرا عباس کے یہاں احتجاج کی لے کافی تیز ہے وہ مرد اساس معاشرے کے خلاف کچھ کر دکھانے کے لیے اپنے بندھے ہوئے ہاتھ کھلنے کی منتظر ہیں تا کہ وہ اُس ظلم و جبر کا خاتمہ کر دیں جو عورت کے ساتھ صدیوں سے روا رکھا جاتا ہے۔''میری زنجیر کھول دی جائے'' میں سانہی خیالات کا اظہار ملتا ہے۔عزرا پروین کے یہاں احتجاجی لب ولہجہ شائستگی اورادب کی حدود سے تجاوز کر جاتا ہے۔

میں اس کتے میں مرد بھی چاہتی تھی
میں اُس مرد میں اِک باپ بھی چاہتی تھی
میں اُس باپ میں اِک بچہ بھی چاہتی تھی
میں اُس بچے میں اک خدا بھی چاہتی تھی
مگر تم تو صرف اور صرف کتے تھے

مندرجہ ذیل بالا خواتین کے احتجاج رویوں کے سامنے جب ہم پروین شاکر کی شاعری میں مزاحمتی رویوں کو دیکھتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ پروین شاکر کے یہاں ایک سوز ہے ایک کرب ہے دھیمی دھیمی آگ ہے جو وجود کو حرارت سے پگھلا رہی ہے۔ بظاہر ایک سمندر کی مانند پرسکون لیکن اندر کئی طوفان سمیٹے ہوئے شعر کی داخلی سطحیں بہت کچھ کہتی ہیں۔ایک دفنائی ہوئی آواز ایک معقول نکاح lady of the house اور کئی دیگر نظمیں اس کی واضح مثالیں ہیں ۔

مجھ پر کیا ترس کھانا
میرا کوئی آقا ہو
نام میں بھلا کیا ہے
اس کی دی ہوئی چھت کا

بوجھ مجھ کو ڈھونا تھا

اور عمر بھر میرا

یونہی صرف ہونا تھا

غزلوں میں دبا دبا سا احتجاجی رویہ ملاحظ کریں:

رفاقتوں کا مری اُس کا دھیان کتنا تھا

زمین لے لی مگر آسمان چھوڑ گیا

دکھ پہنچتا ہے بہت دل کو رویے سے ترے

اور مداوا ترے الفاظ کر نہیں سکتے

اندھیرے میں تھے جب تلک زمانہ ساز گار تھا

چراغ کیا جلا دیا ہوا ہی اور ہوگئی

ایسا محسوس ہوتا کہ پروینؔ شاکر کی شاعری خاص طور پر کچھ نظمیں پروینؔ شاکر نے پاکستان کے دوہرے معیار والے معاشرے کے گہرے مشاہدے و تجربے کے بعد تحریر کی ہیں۔

یوں تو عورت کے ساتھ جبر و استحصال اگر چہ ہر دور میں اور ہر معاشرے میں مختلف صورتوں میں روا ہوتا آیا ہے اور اب بھی ہو رہا ہے جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے وہاں پر بھی اگر چہ حالات ویسے نہیں رہے ہیں۔ پاکسانی خواتین زندگی کے ہر میدان میں مایہ ناز کارنامے سرانجام دے رہی ہیں مگر آج کے اس جدید دور میں بھی دور دراز کے علاقوں اور کئی قبیلوں میں مردوں کی تنگ ذہنیت کے سبب عورت کے ساتھ صنفی امتیاز روا رکھا جاتا ہے وہ معاشرہ ذہنی افلاس اور پسماندگی کی انتہاؤں پر ہے جہاں عورت کی خودداری اور عزتِ نفس کو پروان چڑھنے سے پہلے ہی کچل دیا جاتا ہے۔ تا کہ کل وہ مرد کی جھوٹی منافقت ، خباثت اور دوغلی پالیسی جیسے

حربوں کے سامنے سر نہ اٹھا سکے جس طرح کہ کچھ قبائلی علاقے ایسے ہیں ۔خاص طور پر پٹھان قوم میں عورت خواہ کتنی ہی چھوٹی عمر ہی میں بیوہ کیوں نہ ہو جائے اُسے نکاح کی اجازت نہیں دی جاتی۔ قبیلے کے نام نہاد ذی عزت شخصیات اسے اپنی تذلیل سمجھتے ہیں جبکہ مرد کئی بیویاں ایک ساتھ رکھنے پر قادر رہیں۔ اُن سے آس کی کوئی باز پُرس نہیں ہوتی ۔سندھ، پنجاب اور بلوچستان کے کئی علاقوں میں ''وڈیرے'' اور ''سردار'' اپنی بہن بیٹیوں کا رشتہ خاندان سے باہر اس لیے نہیں دیتے کیونکہ انھیں خدشہ رہتا ہے کہ اس طرح ان کی جائیداد خاندان سے باہر منتقل ہو جائے گی۔ خاندان میں ''بر'' نہ ملنے کی صورت میں کئی طرح کے اوچھے ہتھکنڈے اپنائے جاتے ہیں مثلاً خاندان میں ہی ہر کسی چھوٹے بچے کے ساتھ رشتہ طے کر دیا جاتا ہے یا کوئی خاندان میں ذہنی مریض ہے آپس سے بیٹی بیاہ دی جاتی ہے لیکن یہ بات زیادہ اہمیت رکھتی ہے کہ خاندانی جائیداد ہاتھ سے نہ جانے پائے، غریب پٹھان لڑکیوں کو بوڑھے امیر آدمی اپنی سے نصف عمر کی لڑکیوں کو روپیوں کے عوض خرید کو اپنی عیاشانہ طبیعت کو تسکین بہم پہنچاتے ہیں۔

خاندانی عزت اور مذہب کے نام پر لڑکیاں چلتی پھرتی لاشین بن کر رہ جاتی ہیں ۔ میرے خیال سے جس معاشرے کی یہ صورتحال ہو وہاں پروین شاکر کی شاعری جہاد کا درجہ رکھتی ہیں۔ وہ پاکستانی معاشرے کے ترقی پسند ذہن کی نمائندگی کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔

☆☆☆

ماحصل

باب اول پروین شاکر کی حالات زندگی کے جائزے سے متعلق ہے۔ یہ بات تو سب جانتے ہیں کہ انسان کی شخصیت بہت سے رنگوں سے مل کر مرتب ہوتی ہے جس میں خاندانی پس منظر، پیدائش، تعلیم وتربیت، ادبی ماحول اور وفات شامل ہیں۔ سب ملکر اس ظاہر شخصیت کو سامنے لاتے ہیں جبکہ کسی فنکار کی شخصیت کے حقیقی خدوخال کی عکاسی اُس کی سوچ فکر اور اُس کے فن کے ذریعے ہوتی ہے۔ اُس کی ذات کے داخلی عکس تک رسائی کیلئے فنکار کی سوچ فکر کے ساتھ اُس کے فن سے بھی واقفیت حاصل کرنا ضروری ہوتا ہے۔ میں نے اس باب میں پروین شاکر کی حالات زندگی پر مکمل طور پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ پروین شاکر سادات کے ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ جہاں شعری وادبی ذوق کئی نسلوں سے چلا آ رہا تھا ان کے بچپن کا دور اُن کے مختلف تعلیمی مراحل سے گزرا اور جن اساتذہ کرام سے انہوں نے اکتساب فیض حاصل کیا اُن میں مسز زاہدی تقی اور مسز عرفانہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ یہ سب معلومات باب اول کی زینت بنی ہیں۔ پروین شاکر ایک ابھرتی ہوئی شاعرہ کی حیثیت سے منظر عام پر آنا۔ اس کے بعد اُن کی شادی شدہ زندگی کا احوال اور پھر ازدواجی زندگی کا خاتمہ اور اس کے اثرات جو ان کی شخصیت پر مرتسم ہوئے ان کا بھی تفصیلی ذکر کیا گیا ہے۔ پروین شاکر کی زندگی کے اہم حالات و واقعات بیرون مما لک سفر اور وہاں ان کی علمی وادبی سرگرمیاں موضوع بحث بنی ہیں۔ شعری دنیا میں وہ احمد ندیم قاسمی کے جریدے فنون کے ذریعے متعارف ہوئیں اور پھر شہرت کی بلندیوں کو چھونے لگیں۔ اُن کے چاروں مجموعے جو اُن کی حیات میں چھپے یہ سب تفصیلی مطالعے کے بعد جو شخصیت ابھر کر سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ سخی، نرم دل، بے چین طبیعت کی مالک تھیں۔ ان کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ بے حد حساس خاتون تھیں۔ اِسی حساس طبیعت نے ہی اُسے شاعری کی طرف راغب کیا ہوگا۔

ہمارے معاشرے میں عورت کا گھٹن کا شکار کر کے مار دیا جاتا ہے اور جو معاشرے کی اس رسم کے خلاف

بغاوت کرے اس کو طعنے دے کر اس کی زندگی اجیرن کر دیتے ہیں ۔ پروین شاکر ایک ذہین اور خوبصورت صاحب علم ہستی تھیں ۔انھیں خود کو منوانے کے لئے جتنی جدو جہد کرنی پڑتی ہوگی اس کا تصور کیا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عورتوں کے جزبات ان کی شاعری میں کو بیان کیا گیا ہے۔ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ،دانشورانہ فکر شعور سے بہرہ ور تھیں ۔اُن کی خوبصورتی اُن کی ظاہری شکل وصورت تک محدود نہیں تھی بلکہ اُن کی شخصیت میں ایک شائستگی، وقار، دبدبہ اور رکھ رکھاؤ تھا جس کی وجہ سے لوگ خود بخود اُن کی طرف متوجہ ہوتے رہتے ہیں ۔ وہ کم گو، بے نیاز اور منفرد سی شخصیت کی مالک تھیں کسٹم میں بڑے عہدے پر فائز ہونے کے باوجود اپنے معاصر شعراء کا احترام کرتی تھیں اور دوستوں کے ساتھ بہت ہمدرد اور شفیق تھیں ۔ پروین شاکر کے خطوط پڑھ کر اُن کی شخصیت کا یہ پہلو سامنے آتا ہے کہ وہ دردمندانہ دل رکھتی تھیں ۔ دوسروں کو تکلیف میں دیکھ کر تڑپ اٹھتی تھیں ۔اُن کے کئی خطوط سے ظرافت وشگفتگی کا احساس بھی ہوتا ہے البتہ ان کی طبیعت کی شوخی وشرارات وقت وحالات کی ناسازگاری کے سبب سنجیدگی اور اُداسی میں بدل گئی تھی۔اُن کی شخصیت میں ایک ادھورے پن کا احساس ،اُداسی وکرب کی کیفیات شامل ہوگئی تھیں وہ اپنے ذاتی دکھ کو چھپانے میں ہمیشہ کامیاب رہیں۔ اپنے بیٹے مراد(گیتو) سے بہت محبت کرتی تھیں ۔۱۹۹۴ء میں پروین شاکر اسلام آباد میں آ کے ایک حادثے میں جاں بحق ہوئیں اُس وقت سید مراد علی کی عمر پندرہ سال تھی ۔ گیتو آجکل کنیڈا میں رہائش پذیر ہیں۔ پیشے کے اعتبار سے وہ سافٹ ویر انجینئر تھے۔

میرے اس مقالے کا دوسرا باب پروین شاکر کی نظم نگاری سے متعلق ہے۔اس کا پہلا حصہ ''اردو میں نظم نگاری کا منظر نامہ'' کے عنوان سے ہے اس میں اردو نظم نگاری کے آغاز وارتقاء کے مختلف مراحل کا جائزہ لیا گیا ہے۔ قدیم اور جدید نظم گو شعراء کا ذکر بھی پیش کیا گیا ہے۔ اردو نظم نگاری کی روایت کے سلسلے میں نظیر اکبر آبادی کا نام نامی جدید شاعری کی تحریک کے پیش روؤں میں شمار کیا جاسکتا ہے۔انہوں نے اردو شاعری کی روایت سے

ہٹ کر حسن و عشق اور گل و بلبل کے بجائے دنیا کی حقیقت اور بے ثباتی کو موضوع بنایا، ’’بنجارہ نامہ‘‘ اور ’’آدمی نامہ‘‘، جیسی نظمیں لکھیں۔

نظیر اکبر آبادی کے چوالیس سال بعد ایجوکیشن ڈائرکٹر کرنل ہالرائڈ کے ایماء پر محمد حسین آزاد نے انجمن پنجاب تشکیل دی جس کے ذریعے نظم کو فروغ حاصل ہوا۔ نظم کی ترقی و ترویج کے مراحل نظیر اکبر آبادی، حالی، آزاد اور ان کے رفقاء کے ذریعے طے ہوتا رہے۔ حالی نے قوم کی اخلاقی حالت سنوارنے کے لئے نظم کو اظہار کا وسیلہ بنایا۔ حالی نے برکھارت، نشاطِ اُمید، اور حب الوطنی جیسی نظمیں لکھیں جو انجمن کے جلسوں میں پڑھی گئیں۔ اس کے علاوہ حالی نے ’’چپ کی داد‘‘ اور شکوہ ہند وغیرہ جیسی نظمیں لکھیں۔

بیسویں صدی کے شروع میں شبلی نے اصلاحی شاعری کے بدلے سیاسی نظمیں لکھیں۔ اُن کی نظم ’’طرابلیس دہقان‘‘ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ نظم نگاری کے میدان کے چوتھے ستون اسماعیل میرٹھی مانے جاتے ہیں انہوں نے بچوں کے لئے لکھا۔ انہوں نے بلینک ورس میں اردو نظم کے ترجمے کئے۔

اسماعیل میرٹھی کے بعد اکبرالہ آبادی کا نام بھی بہت اہم ہے۔ انھوں نے اپنی نظموں میں اُس دور کی برائیوں کے خلاف طنز و مزاح کا انداز اپنایا۔ اکبرالہ آبادی کے عہد میں اردو کی نظمیہ شاعری کے دوسرے دور کا آغاز جن میں زیادہ تر شعراء رومانی تحریک سے وابستہ تھے۔ انہوں نے آزاد اور حالی کی حب الوطنی کی روایت کو آگے بڑھایا اور سیاسی موضوعات پر طبع آزمائی کی۔ ان میں ظفر علی خان اور پنڈت برج برائن چکبست خاص طور پر قابل ذکر ہیں

جدید اردو نظم کا آغاز اقبال سے ہوتا ہے۔ انہوں نے نظم کے موضوعات کو وسعت عطا کی اور نظم میں عمل اور خودی کا فلسفہ پیش کیا۔ جوش اور حفیظ اقبال کے اصلاحی رنگ میں رنگ گئے۔ حفیظ کا ’’شاہنامہ اسلام‘‘ بہترین کارنامہ ہے۔

۱۹۳۶ء میں ترقی پسند کی شروعات ہوئی۔ اس تحریک سے وابستہ شعراء نے سیاسی و معاشرتی نا انصافیوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔ انگریزوں اور سرمایہ داروں کے خلاف لکھا۔ ان میں علی سردار جعفری، فیض احمد فیضؔ، احمد ندیم قاسمیؔ، ساحرلدھیانویؔ۔ جزبیؔ، حبیبؔ جالبی اور اسرارالحق مجاز خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ترقی پسندوں کے مساوی ایک حلقہ ارباب ذوق کے نام سے معرض وجود میں آیا۔ جنہوں نے ترقی پسندوں کی کھل کر مخالفت کی۔ انہوں نے اپنے نجی تجربات کو نظم کو قلمبند کیا۔

انہوں نے خیال کی نسبت فن کی طرف توجہ دی۔ اسی دوران ہیئتی تجربے بھی ہوئے جس سے ''نظم معریٰ'' اور ''آزاد نظم'' کو فروغ حاصل ہوگیا۔

تقسیم ہند کے کچھ عرصہ تک ترقی پسندوں کے جذبات سرگرم رہے لیکن ۱۹۵۸ء تک آتے آتے نئے رجحانات جدیدیت کے نام سے معروض وجود میں آئے۔ یہ دور اُردو ادب میں پچیس سال کے عرصے پر محیط رہا۔ اس دور کے شعراء نے ذات سے کائنات تک کا سفر کیا۔ جدید دور کے انسان کے ذاتی تجربات اور علامات کے نظموں میں استعمال کیا گیا۔ جدیدیت کا رجحان ساتویں دہائی میں بہت مقبول ہوا۔ اس کے بعد اس میں مزید توسیع ہوئی جبکہ آٹھویں دہائی بعد جدیدیت کے نام سی پہچانی جاتی ہے جو داخلیت وخارجیت اور ابہام کے ساتھ صراحت کا امتزاج ہے احساسات اور خوابوں کی شکست وریخت کے ساتھ زندگی کے مثبت پہلوؤں کی ترجمان بھی ہے۔

مابعد جدیدیت کے نظریہ وافکار جدید دور کے انسان کے حالات ومسائل کی پیداوار ہیں۔ جن میں انتہا پسندی، بے روزگاری، اقتدار کی بے مائیگی ہجرت و بے وطنی کے احساس وکرب کی نمائندگی کرتی ہے۔

اس باب کا دوسرا حصہ پروینؔ شاکر کی نظمیہ شاعری سے متعلق ہے۔ موضوعات کے اعتبار پچھلی تین چار **باب**

دہائیوں سے اردو نظم کے باب میں سے کچھ خواتین شاعرات نے تانیثی شاعری کے حوالے سے اپنی الگ شناخت قائم کی۔ اُن میں بہت سے نام ہیں جن میں فہمیدہ ریاض اور کشور ناہید۔لیکن ان سب میں پروین شاکر امتیازی شان رکھتی ہیں۔اُن کی شعری سفر ''خوشبو'' سے شروع ہوکر ''کف آئینہ'' تک اختتام کو جا پہنچتا ہے۔''خوشبو'' سے کفِ آئینہ'' تک کا سفر رومانیت سے حقیقت پسندی کی جانب مائل نظر آتا ہے اگرچہ حسن وعشق جیسے موضوعات پانچوں مجموعوں میں شامل ہیں لیکن ''خوشبو'' میں محبت کے پہلے پہل کے جذبوں کی عکاسی کی گئی ہے جبکہ 'صد برگ' 'خود کلامی' اور 'انکار' تک کا سفر پختگی کی منازل طے ہوا نظر آتا ہے۔جس میں آپ بیتی بھی ہے اور جگ بیتی بھی۔

نسوانی دنیا کے احساسات وجذبات کے ساتھ ان کو درپیش مسائل کا احاطہ بھی کرتی ہیں وہ اپنی باریک بین نگاہوں سے انسانیت کو درپیش مسائل کو بھی موضوع بناتی ہیں۔زندگی کی چھوٹی سی چھوٹی اور بڑی سی بڑی حقیقتیں انکی شاعری میں ایک منفرد انداز سے اظہار پاتی ہیں۔پروین شاکر کے یہاں نہ صرف نسائی جزبات کی ترجمانی نظر آتی ہے بلکہ اُن کی نظموں میں ایک باشعور اور ہوشیار انسان کے جزبات واحساسات بھی دکھائی دیتے ہیں۔ اُن کا طرز اظہار عصری تقاضوں سے ہم آہنگ بھی ہے اور روایات کی توسیع بھی۔انہوں نے روایت کے حسن میں کئی لحاظ سے اضافے کئے ہیں اور اسے کئی طرح کی جہتیں عطا کی ہیں۔ان کی نظموں کے موضوعات زیادہ متنوع رنگا رنگ اور وسیع ہیں۔ان کی نظموں میں تازگی ندرت اور حقیقت ہے۔ان کی شاعری میں ایک ارتقائی صورت حال جلوہ گر نظر آتی ہے۔اُن کے خیالات میں وقت کے ساتھ ساتھ جیسے ہی تبدیلی آتی ہے۔لفظیات میں بھی اُسی اعتبار سے تبدیلی کے عمل سے گزرتے ہیں جس طرح کہ ''خوشبو'' کی شاعرہ کا نمایاں ترین وصف نسائی جزبات کا وفور اور بے ساختگی سے نسائی طرز اظہار ہے۔اُس میں دھنک، بارش، پھول، گیت، چڑیا، سمندر، مہندی، چوڑیاں، بندریا وغیرہ جیسے الفاظ زیادہ شامل ہوتے ہیں۔جبکہ ''صد برگ'' میں ایک ٹھہراؤ کا احساس ہوتا

اُمیدی کو ظاہر کرتی ہیں ۔اُن کی شاعری جمالاتی لطافتوں کا البم ہے ۔قدم قدم پر خوبصورتی کا احساس ہوتا ہے چاہے موضوع ہو یا اسلوب و خیال ہر اعتبار سے خوبصورتی دامن دل کو گرفت میں لیتی ہے ۔ پروینؔ شاکر اپنی نظموں میں پیکر اور تمثیل سے کام لینے کا ہنر بخوبی جانتی ہیں ۔الفاظ و تراکیب کے استعمال میں جمالیاتی حسن کا احساس کارفرما نظر آتا ہے۔

عکس وخوشبو، آتش جاں، عنکبونی، تارہستی، ردائے عفت، دشت اسیر، دامن شب، پیراہن آبی، موج طرب، سپیدی خط، ساحل بری اچھوتی اور معنویت کی حامل تراکیب ہیں جن کے ذریعے رنگ و بو کے پیکر ابھرتے ہیں ایک دوسرے سے جڑے ہوتے ہیں جو ایک پروینؔ شاکر کی سب سے بڑی خصوصیت ان کی تخلیقی قوت ہے۔ ان کی شاعری کا بنیادی وصف جزبوں کا سچا اظہار ہے۔

اُن کا لب و لہجہ ان کی شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت ہے جو خوبصورتی اور تازگی سے بھر پور ہے اور جو اپنا تاثر دیر تک قائم رکھتا ہے ۔ پروینؔ شاکر کی شاعری میں اپنے وطن اور اپنی مٹی کی بابوس رچی بسی ہوئی ملتی ہے ۔ان کی شاعری میں وطن کے شب و روز آتے جاتے موسموں کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ ان کی شاعری میں وطن سے بے پایاں محبت کے جزبات کا اظہار ہوتا ہے ۔ایک شاعرہ نے جب احتجاجی اور مزاحمتی نظمیں لکھیں تو اُس عہد کے فوجی حکمرانوں نے بغاوت کے الزام میں اُس جلاوطن کر دیا تو اس نے ہمسایہ ملک میں پناہ لی۔

نسائی جزبوں کے ساتھ انسانی معاشرے کی تفہیم پروینؔ کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے جس طرح کہ ہجرت جدید شاعری کا ایک بہت اہم موضوع رہا ہے پروینؔ شاکر نے اپنی نظمیہ اور غزلیہ شاعری میں اسے برتا ہے ۔پچھلی کئی دہائیوں سے اقتصادی بدحالی کے شکار خاص طور سے ایشائی ممالک کے لوگ یورپی اور خلیجی ممالک میں روزگار کی تلاش میں ہجرت کر رہے ہیں یہ رجحان ہر نئے دن کے ساتھ بڑھتا چلا جا رہا ہے۔

اپنی وطن کو خیر باد کہنے کے پیچھے کیا عوامل ہیں اور وہ لوگ وطن کی یادوں کو سینے سے لگائے کس کرب سے گزرتے ہوں گے یا وطن میں اُن کے پیارے اُن کی جاں گسل یادوں کے سہارے کس طرح بھٹکتے رہتے ہیں۔ پروینؔ اس درد کو بہت شدت سے محسوس کرتی ہیں۔

پروینؔ شاکر نے جدید اُردو شاعری کے لئے امکانات کے نئے در کھول دیے ہیں۔انہوں نے اردو شاعری کو عورت کا ایک نیا کردار دیا ہے جس کی ابتداء کشور ناہید نے کی تھی وہ کردار اور کنگ لیڈی کا ہے۔اس طرح پروینؔ شاکر نے گھر سے باہر نکل کر کام کرنے والی عورت کے مسائل کو موضوع بنایا ہے اُن کی شاعری نسوانیت کی ترجمان ہے جو طوفان کے مقابلے میں سینہ سپر ہونے کے ہنر سے واقف ہے پروینؔ شاکر کی شاعری ادب کے میدان میں نسائی جذبوں کے اظہار کی بندش کے ختم ہونے کے بعد بارش کی پہلی بوند کی حیثیت رکھتی ہے اگر چہ کئی اور شاعرات بھی ہیں جن کی سوچ وفکر کا دائرہ یہی تھا۔جیسے کہ فہمیدہ ریاض ہیں۔لیکن عوامی حلقوں میں ایسی مقبولیت صرف اور صرف پروینؔ شاکر کے حصے میں آئی ۔کیونکہ پروینؔ شاکر کی شاعری مٹھاس اور موسیقیت میں پائی جاتی ہے وہ دوسروں کے یہاں ناپید ہے۔

تیسرا باب پروینؔ شاکر کی غزلیہ شاعری سے متعلق ہے پروینؔ شاکر کی غزلیں لب و لہجے کی بے باکی کے اعتبار سے کافی مشہور ہیں۔اردو کی روایتی شاعری میں ولیؔ دکنی سے یہ ہوتا آیا ہے کہ عاشق ہمیشہ مرد ہی رہا ہے اور عورت معشوق لیکن پروینؔ کی یہ انفرادیت ہے کہ اس کے یہاں عورت عاشق بن گئی ہے اور مرد معشوق ہے ایک عورت عاشقوں جیسے شعر کہہ رہی ہے غزل کے روایتی انداز کے برخلاف ۔یہ ایک بہت بڑی تبدیلی ہے جو چیز اپنی دوسروں سے ممتاز کرتی ہے وہ اُن کی غیر معمولی جرائت اظہار ہے جس کی بدولت وہ نازک سے نازک نسائی جذبات ومحسوسات کو فنکارانہ ہوشیاری اور خوش سلیقی سے بیان کرتی ہیں ۔بے شک پروینؔ شاکر اُردو شاعری میں ایک نئی آواز اور منفرد انداز کی مالک ہیں ۔جس کی بناء پر اُردو غزل ایک نئی روایت اور ایک نئے

اندازِ سخن سے آشنا ہوئی ہے اُن کی غزلیہ شاعری ہر قدم پر قاری کو نئے طرزِ احساس سے متعارف کراتی ہے۔
پروین شاکر نے اُردو شاعری کے محل کا ایک ایسا دریچہ وا کر دیا ہے۔ جہاں عورت کے جذبات واحساسات کی ایک دنیا سجی ہوئی ملتی ہے جہاں عورت اپنے دکھوں، سکھوں، خوابوں، آرزوؤں، تمناؤں کے ساتھ جیتی جاگتی نظر آتی ہے۔ بچپن سے جوانی اوراس کے بعد ازدواجی زندگی کے نشیب وفراز ہیں۔ خوشیاں، غم، عشق ومحبت، ہجر و فراق کی کیفیات پروین شاکر کی غزلیہ شاعری کے حصار کے مفید ہیں۔ ان کی شاعری فطرت کے موسموں اور رنگوں سے ہم آہنگ ہے۔ ان کی شاعری میں پھول، خوشبو رنگ، ہوا، تتلی، بارش، رات اور جگنو، چاند جیسے استعارے استعمال ہوئے۔

پروین شاکر کی غزلیہ شاعری میں تنہائی مایوسی کے جزبات بھی ہیں -حسرت بھی ہیں اور عہد و پیاں اور ہجر و وصال کی دھوپ چھاوؤں بھی۔ اُن کی غزلیں قلبی واردات واحساسات کا فطری اظہار ہیں۔ حکمرانوں کی چیرہ دستیاں محبوب کی بے نیازیوں اور سامراجی طاقتوں کیخلاف احتجاج بھی پایا جاتا ہے۔ جبر، ناانصافی، ظلم اور جمہوری اقدار کی پامالی کے خلاف آواز اُٹھاتی ہیں۔ ان کی شاعری میں لفظ ''سردار'' ظلم و جبر کیخلاف ردعمل کی علامت ہے۔ اُن کی غزلیہ شاعری اُن کی مزاج ہی کی طرح سبک رونرم وکامل ہے ان کا لہجہ شیرین اور اظہار کا پیرایہ خوبصورت ہے۔ مزاحمتی شاعری میں اُن کا پیرائیہ اظہار نازک ہے۔ اُن کے یہاں جدید انسان کی نفسیات

پروین شاکر کی انفرادیت یہ ہے کہ وہ عورت ہوکر بھی معاشرے کے ایک فرد اور ایک انسان کی طرح سوچتی ہیں اور ان کی شاعری میں انسانیت کا درد جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔ پروین شاکر کی شاعری کے موضوعات زیادہ متنوع، توانا اور وسیع ہیں۔ جو زندگی کے ہر پہلو کا احاطہ کرتے ہیں۔۔ زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں جو کہ پروین شاکر کی شاعری کا موضوع نہ بنا ہو۔ وہ اپنی شاعری میں ذات کے حصار میں مقید بھی ہیں۔

۱۹۷۱ء میں جب مشرقی پاکستان ایک نئے ملک کی صورت میں پاکستان سے الگ ہوا تو پروین شاکر

نے اس کا بہت اثر لیا۔اُن کی شاعری میں اِس سانحے کا بہت ذکر ہوا ہے بلکہ پروینؔ شاکر نے اپنی پی ایچ ڈی کے مقابلے کے لئے بھی اس موضوع کو چنا اگر چہ وہ لٹریچر کی طالبہ تھیں مگر انہیں بین الاقوامی سیاست سے بھی دلچسپی تھی ۔جس کی بناء پر سیاسی موضوعات یہاں تک کہ عالمی طاقتوں کی ریشہ دوانیاں اُن کی شاعری کا موضوع بنی ہیں ۔اس طرح اُن کی شاعری جدید حیثیت اور جدید دور کے ذہنی رویوں کی عکاس کرتی ہے۔

پروینؔ شاکر کی غزلیہ شاعری ہر لحاظ سے ایک خاص معیار کی حامل ہے یہی وجہ ہے کہ اس کی فطری وفنی خوبیوں اور زبان و بیان کی انفادیت کو بناء پر کسی شاعرات نے پروینؔ شاکر کا رنگ سخن اپنانے کی کوشش کی ہے لیکن پروینؔ شاکر نے نازک نسوانی احساسات کو جس انوکھے انداز سے اپنی شاعری میں پیش کیا ہے وہ کسی اور کے بس کا کام نہیں ۔اس کے باوجود پروینؔ شاکر کو تانیثیت کے دائرے میں محدود نہیں رکھا جا سکتا ہے کیونکہ اُن کے یہاں نہ صرف معاشرے کی سچی اور حقیقی تصویریں دکھائی دیتی ہیں بلکہ جدید دور کے انسان کی زندگی کے تمام مسائل اور المیے اور پوری انسانیت کا درد جھلکتا نظر آتا ہے ہاں البتہ اتنا ضرور ہے کہ مرد اساس معاشرے کی خلاف عورت کے حق میں آواز بلند کرنا پروینؔ شاکر کا طرۂ امتیاز ٹھہرا ہے جس کی وجہ سے اُن کی شاعری پہ تانیثیت کا لیبل لگ چکا ہے۔ اگر اُن کی شاعری کا بغور مطالعہ کیا جائے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ جدید دور کے روشن خیال ذہن کی نمائندہ ہیں ۔انہوں نے زندگی کے ہر پہلو اپنی شاعری میں سمویا ہے ۔آخری دور کے کلام میں موت کی آہٹیں اور دستکیں اُن کے ہاں صاف محسوس کی جاتی ہیں ۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆